ابوالکلام آزاد

پبلیکیشنز ڈویژن
منسٹری آف انفارمیشن اینڈ براڈکاسٹنگ
گورنمنٹ آف انڈیا

ترتیب

دسمبر ۱۹۵۸ء (اگرہائن۔ پوس شک سمت ۱۸۸۰)

دو روپے (۲)

وزیراعظم کا پیغام

اس سال کے شروع میں مولانا ابوالکلام آزاد کی وفات سے ہندوستان میں ہی نہیں بلکہ بہت سے دوسرے ملکوں میں بھی لوگوں کے دل و دماغ پر شدید اثر ہوا ہے۔ اس کی تھوڑی سی جھلک اس دن دلی میں نظر آئی جب کہ دہلی کے لوگ لاکھوں کی تعداد میں مولانا کو اپنا آخری نذرانۂ عقیدت پیش کرنے کے لئے جمع ہوئے تھے۔

ہم جب بعض چیزوں کے عادی ہو جاتے ہیں تو یہ محسوس کرنے لگتے ہیں کہ وہ ہمیشہ رہیں گی۔ اسی طرح اپنے ساتھیوں کے بارے میں بھی ہمیں کچھ ایسا ہی گمان ہو جاتا ہے۔ لیکن جب کوئی ایسا شخص اچانک اس دنیا سے اُٹھ جاتا ہے تو ہم محسوس کرتے ہیں کہ اس کی زندگی اور اس کی موت ہمارے لئے کیا معنی رکھتی ہے

مولانا آزاد ان لوگوں میں سے تھے جن کی شخصیت کی نشو و نما قومی تحریک کے ساتھ ساتھ نصف صدی سے زیادہ مدت میں ہوئی انھوں نے قومی تحریک کے مختلف دور دیکھے اور ان میں حصہ لیا۔ وہ اس کی جدّ و جہد، اس کی کامیابیوں اور ناکامیوں اور اس کے

اظہارِ عقیدت

ڈاکٹر سیّد محمود ایم پی

یہ معلوم کر کے خوشی ہوئی کہ آپ ماہ نامہ "آج کل" کا "آزاد نمبر" نکال رہے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ مولانا مرحوم کی ذاتِ با صفات اور شخصیت با برکت کا تذکرہ اب ہماری قومی اور ملّی زندگی کا انمول اثاثہ ہے اور ہمیشہ رہے گا۔ اس سے ہزار پہلو اور بہ صد رنگ ہم حوصلہ پائیں گے روشنی حاصل کریں گے اور یقیناً آیندہ کی ہماری ہر نسل کو اس سے سبق ملے گا۔ یہ کہنا مبالغہ نہیں کہ مولانا مرحوم ہمارے احساس و تاثیر میں ہمیشہ زندہ رہیں گے اور تا قیامت جتنے "آج" ہوتے رہیں گے اور "کل" آتے رہیں گے اُن میں اُن کی زندگی کے نقوش ہمیشہ اُبھرتے رہیں گے۔ مولانا ہم سے جُدا ہو چکے ہیں اور ہم اس محرومیت کی تھوڑی بہت تلافی بس اب اسی طرح کر سکتے ہیں کہ ان نقوش کو سنوارتے رہیں اور بہر پہلو و بہر حال سنواریں۔

مولانا کی موت سے پورے ملک و قوم نے جو کچھ کھویا اُس کے احساس کی چُبھن کے ساتھ ذاتی رنج و صدمہ کی شدّت نے شعور کو نڈھال کر دیا ہے ورنہ اُن کی ذات سے جو مجھے شغف رہا اور باون سال تک جو اُن سے نیازِ خصوصی حاصل رہا اُس کی ایک الگ داستان مرتب کرنے کے لئے اگر لمحاتِ فرصت مل بھی جائیں، کئی کتابوں کے جُزو پورے کرنے کی ہمّت بھی ہو جائے تو بھی مستعدیٔ دل و دماغ کہاں سے لاؤں گا؟ اس تمام عرصے میں اُن سے خلوت و جلوت میں جو ملاقاتیں رہیں

منتہائے مقصد کی تکمیل میں شریک رہے۔ وہ اس تحریک کا ایک اہم جز و تھے اور انھوں نے بڑی حد تک اس کی تشکیل کی۔ پھر بھی وہ ایک جیّد عالم اور انفرادیت پسند رہے بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ وہ ہندوستانی عوام کے انبوہِ کثیر میں یکہ و تنہا حیثیت کے مالک رہے۔ اس طویل مدّت میں انھوں نے قومی تحریک کی جو رہنمائی کی صرف اسی کی وجہ سے انھیں ہماری قومی تاریخ میں ایک بلند اور پائندہ مقام حاصل رہے گا۔

اس کے علاوہ ان کی ذات غیر معمولی علمیت اور حیرت افزا ذہانت کی حامل تھی جس پر کبھی جذبات یا تعصّب کا غلبہ نہیں ہونے پاتا تھا۔ سب سے بڑھ کر بات یہ ہے کہ ان کی شخصیت ایک ایسا آئینہ تھی جس میں ہندوستان کی اس گوناگوں تہذیب کا عکس پایا جاتا تھا جسے بہت سے بڑے دھاروں نے متاثر اور مالامال کیا ہے۔

بعض اعتبار سے اُن کی طرزِ فکر بنیادی طور پر جدید تھی اور بعض دوسری باتوں میں ان کا ماضی سے بڑا گہرا رشتہ تھا۔ اور وہ اُس دَور کے شعور کا ایک عکس تھے جسے روشن خیالی کا دَور کہا جاتا ہے۔ مجموعی طور پر وہ ایک ایسے غیر معمولی فرد تھے جنھوں نے اس مقصد کو جس کے لئے وہ عمر بھر کوشاں رہے، ایک امتیازی شان بخشی اور وہ بھی کچھ اس ڈھنگ سے جس کی کوئی ہمسری نہیں کر سکتا۔ پرانا نظام بدلتا ہے اور ہم اُسے واپس نہیں لا سکتے۔ لیکن ہم اس سے بہت کچھ سیکھ سکتے ہیں۔ اسی طرح ہم مولانا آزاد کی یاد دلوں میں تازہ کرتے ہوئے ان کی زندگی اور ان کی تعلیمات سے ایک بڑا سبق سیکھ سکتے ہیں۔

نئی دہلی
۵۔ جولائی ۱۹۵۸ء

جواہر لال نہرو

عنفوانِ شباب میں
مولانا آزاد بہ حیثیت ایڈیٹر الہلال

اور اُن سے جو برکات و فوائد مجھے حاصل ہوئے اُن کو کچھ میرا ہی دل جانتا ہے۔ اپنی واقفیت اور اپنے تجربے کی بنا پر بلا خوفِ تردید یہ کہنے کی جرأت کر سکتا ہوں کہ مولانا مرحوم جیسا فاضل عالی ذہین، طباع اور اسلامی علوم پر گہری نظر رکھنے والا اس وقت اسلامی دنیا میں کوئی دوسرا نہ تھا انیسویں صدی اور بیسویں صدی نے اسلامی دنیا میں دو بڑے مجاہد اور فاضل پیدا کئے یعنی جمال الدین افغانی اور مفتی عبدہ۔ مولانا مرحوم ان دونوں کے نچوڑ تھے۔ اس سے زیادہ ان کے متعلق میں کیا کہوں۔

اب ان کے گذرنے کے بعد مجھے تنہائی کے لمحات میں شدت سے احساس ہوتا ہے کہ احمد نگر جیل میں مولانا جو یہ شعر

گوئی ثمرِ پیشترم از باغ وجودم　　　کم لذتم و قیمتم افزوں ز شمار است

گنگنایا کرتے تھے۔ وہ حقیقتاً شعر نہیں بلکہ اپنی زندگی، اپنی ہستی اور اپنی ہی بات کو زیرِ لب دہراتے تھے۔ آنے والی تاریخ کا ایک لمحہ بھی اس سے منکر نہ ہو سکے گا کہ مولانا ایک ایسے انسانی پیکر تھے جس میں ایک سمت علم و فکر کی ایک وسیع دنیا آباد تھی تو دوسری سمت اخلاق و انسانیت کی وہ بلندیاں موجود تھیں جہاں وہ تنہا تھے اور ان کا کوئی حریف نہ تھا۔

میری مولانا سے پہلی بار ۱۹۰۶ء کے آخری مہینوں میں علامہ عبداللہ عمادی جو عربی ادب کے فاضلِ اجل تھے، کے سامنے لکھنؤ میں ملاقات ہوئی تھی۔ میری عمر اس وقت سولہ سترہ سال کی تھی اور مولانا غالباً اس وقت ۱۸ سال کے تھے۔ قبول صورت نہیں بلکہ نہایت حسین شکل تھی اور پوشاک کی تراش خراش و ہر انداز سے ٹپکتی نفاست سے وہ بالکل الف لیلیٰ کی کسی داستان کے جیتے جاگتے شاہزادے معلوم ہو رہے تھے۔ مجھے یاد ہے سب سے زیادہ اُن کے طرزِ گفتگو نے مجھے متاثر کیا تھا جو خطیبانہ مگر نیچرل تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ معلومات کا دریا بہہ رہا ہے۔ علامہ عمادی اور اُن کے درمیان حماسہ، متنبی وغیرہ کے متعلق گفتگو ہوتی رہی۔ اُن کے حافظے کا کمال یہ تھا کہ چھتیس سال بعد جب ۱۹۴۲ء میں قید فرنگ میں احمد نگر جیل ہماری فرصتوں کی آماجگاہ بنا تو انھوں نے اس پہلی ملاقات کے درمیان کی ساری گفتگو کا

مولانا آزاد اور ڈاکٹر رادھا کرشنن
(اگست ۱۹۴۷ء)

مولانا آزاد بہ حیثیت صدر کانگریس، آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے تاریخی اجلاس
منعقدہ ۸۔ اگست ۱۹۴۲ء میں مہاتما گاندھی اور آچاریہ کرپلانی کے ساتھ
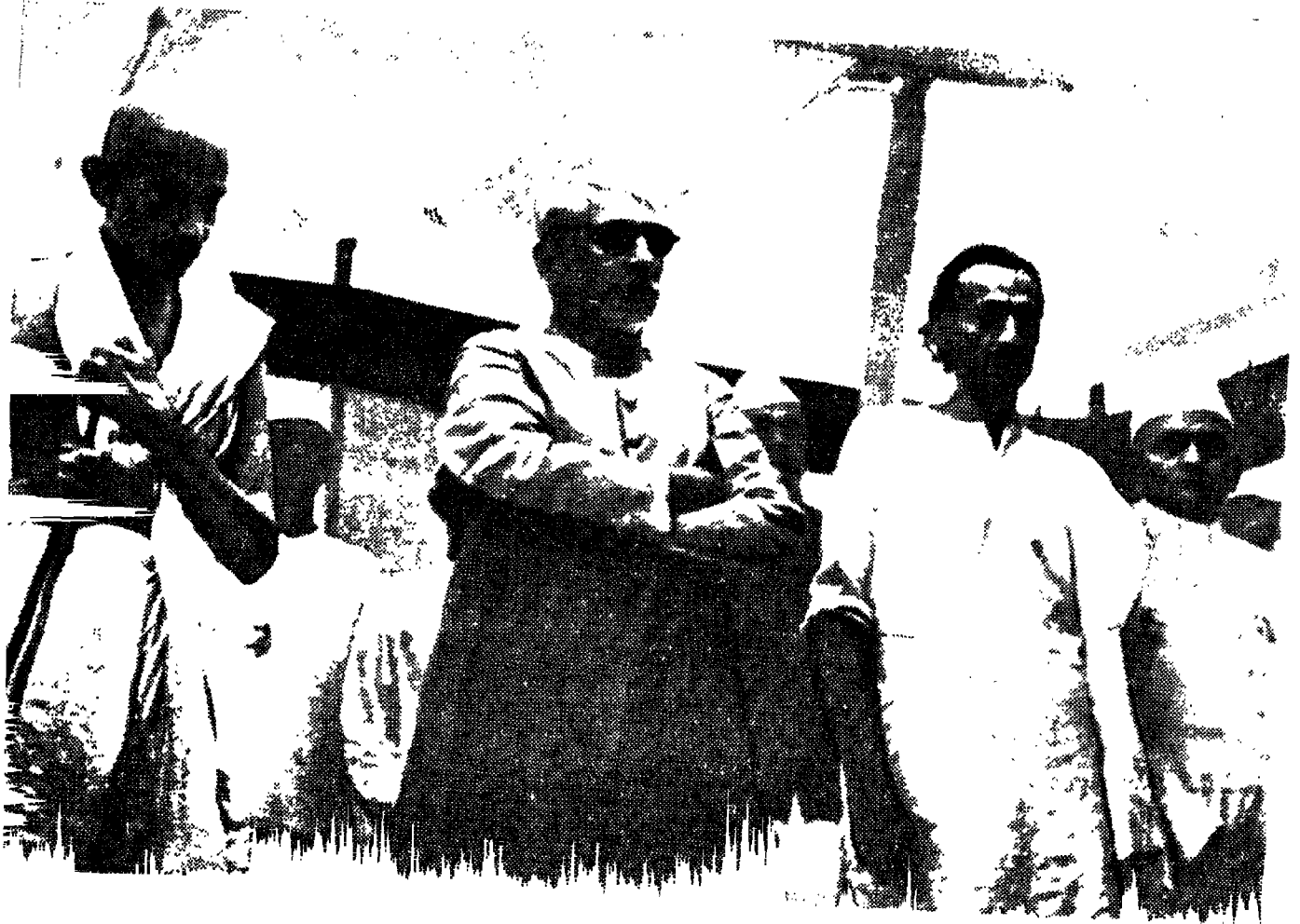
مولانا آزاد مہاتما گاندھی کے ساتھ

موضوع اور تمام تر تفصیلات مجھ سے دُہرائیں۔ کمال حیرت کہ صرف وہی ملاقات نہیں بلکہ بعد کے بھی دوسرے واقعات اور لمحات کی یادیں جو میرے ذہن سے یکسر محو ہو چکی تھیں ان کو ہمیشہ اس طرح یاد رہیں کہ جیسے سب کچھ کل کی بات ہو۔ اب جیسے ۱۹۰۸ء کی بات کہ وہ مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے سلسلے میں علی گڑھ آئے تو دیگر حضرات کے ہمراہ میرے کمرے میں تشریف لائے۔ اس صحبت کی باتیں میں بھول گیا تھا لیکن اُن کے حافظے نے وہ سب محفوظ کر رکھا تھا۔

فنِ خطابت کے اس تاجدار کے بارے میں بہت کچھ دہرایا جا چکا ہے۔ لیکن میرے ذہن میں ہمیشہ دو تین موقعے ایسے اُبھرتے ہیں جہاں میں نے انھیں اپنے الفاظ سے مجمع کے ذہنی دھارے کو اتنی آسانی سے موڑتے دیکھا کہ شاید کسی جادوگر سے بھی ممکن نہ ہو۔ وسمبر ۱۹۱۲ء میں جبکہ جنگِ بلقان کی گرما گرمی تھی لکھنؤ میں مسلم یونیورسٹی فاؤنڈیشن کمیٹی کا اجلاس ہوا۔ سوال پیش تھا کہ مسلم یونی ورسٹی گورنمنٹ کی شرائط پر منظور کی جائے کہ نہیں۔ اُس وقت الہلال کی دھوم تھی اور جب مولانا آزاد قیصر باغ کی بارہ دری میں آئے تو جلسے میں ہر دوڑ گئی اور ہر طرف سے مولانا کی تقریر کے لئے تقاضا ہوا مگر جو لوگ حکومت کے اشارے سے یونی ورسٹی منظور کر لینا چاہتے تھے اُن کی خواہش نہ تھی کہ مولانا آزاد تقریر کریں۔ یہ سو مولانا کو اسٹیج پر جگہ دینی ہی پڑی اور اُن کی تقریر نے آن کی آن میں ہوا کا رُخ بدل دیا۔ اور یہی رائے پاس ہوئی کہ اُن شرائط پر یونی ورسٹی منظور نہ کی جائے۔ مولانا حق بات کہنے میں اس قدر بے باک اور نڈر تھے کہ انھوں نے کبھی وقت اور جگہ کی بندش تسلیم نہ کی۔ جنگِ بلقان کے متعلق ایک پبلک جلسہ تھا جس کی صدارت نواب حامد علی خاں صاحب مرحوم والیٔ رام پور فرما رہے تھے۔ جلسے کا مقصد ترکوں کے لئے چندہ جمع کرنا تھا۔ مولانا آزاد جیسے ہی جلسہ میں تشریف لائے مجمع "الہلال" "الہلال" کہہ کر چلا اُٹھا۔ انھوں نے اس موقع پر انگریزوں کے خلاف سخت تقریر کی۔ بے چارے نواب صاحب دم بخود جلسہ کی صدارت کرتے رہے۔

میرے اور مولانا کے ذاتی تعلقات ۱۹۱۲ء ہی سے بتدریج پختہ تر ہوتے گئے اور میں
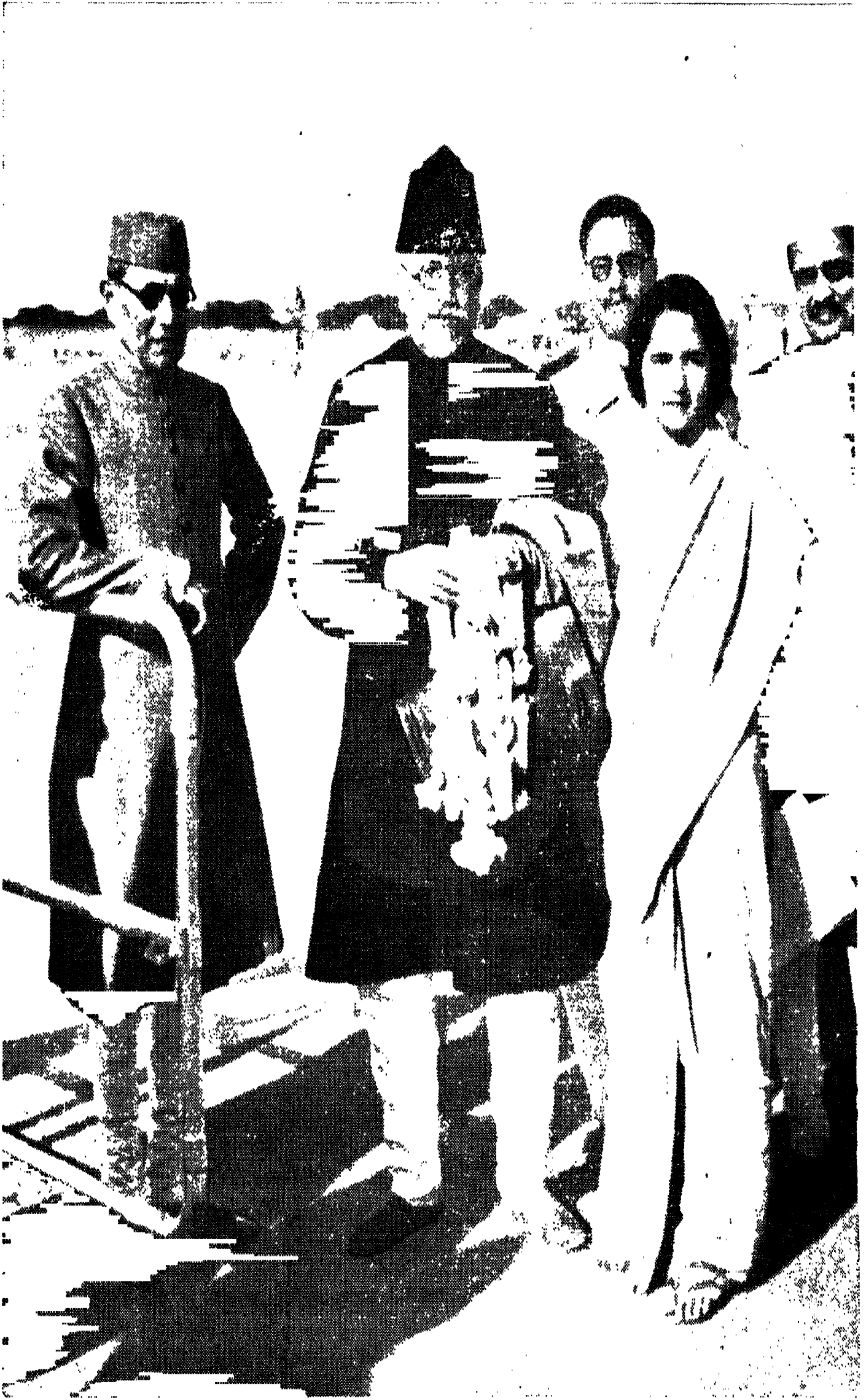
مولانا آزاد، مسٹر آصف علی اور ارونا آصف علی کے ساتھ

صرف یہ کہا کہ "اپنے سینے کا داغ کس کو دکھاؤں؟"

اگر میں مولانا کی شخصیت اور تمام زندگی کو ایک جملے میں بیان کرنے پر مجبور ہوں تو یہی کہوں گا کہ وہ انسان کے روپ میں فرشتہ تھے اور اُن کی زندگی ایک فرشتے کی زندگی تھی۔

اس عظیم شخصیت کے لئے اتنے الفاظ تو کیا کئی کتابیں بھی ناکافی ہوں گی لیکن فی الوقت بس اتنا کافی ہے کہ ان کی سیاسی، ادبی، مذہبی خدمات ہمیشہ صفحۂ ہستی پر ثبت رہیں گی۔

ہرگز نمیرد آں کہ دلش زندہ شد بہ عشق ثبت است بر جریدۂ عالم دوامِ ما

بخشی غلام محمد، پرائم منسٹر ریاست جموں و کشمیر

امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد کی زندگی اور اُن کی تعلیمات ہماری عظیم قومی، ثقافتی اور ادبی میراث ہے۔ اس لئے مولانا کی یاد تازہ کرنا ایک اہم قومی و ادبی فریضہ ہے۔ اس سلسلے میں "آج کل" کا "ابوالکلام نمبر" ایک مبارک قدم ہے۔ امید ہے کہ رسالہ مولانا کی زندگی اور فکر و عمل کے مختلف پہلوؤں اور چھپے ہوئے گوشوں کو اُجاگر کر کے تشنہ کاموں کی تشنگی کو دور کر سکے گا۔

مولانا کو کشمیر سے خاص شغف اور لگاؤ تھا۔ یہ رشتۂ اخلاص و محبت صرف اُن کے ذوقِ جمال کا ہی رہینِ منت نہ تھا، دوستی اور یگانگت کا یہ علاقہ سیاسی عقاید و اعمال سے زیادہ تر متعلق تھا۔ سیاسی میدان میں مولانا نے متحدہ قومیت، بھائی چارہ، تعمیر اور امن کی راہ اختیار کی تھی۔ کشمیری عوام کا بھی یہی محبوب منزلِ مقصود رہا ہے باشندگانِ ریاست اس دشوار گذار، کٹھن مگر قومی فلاح کے راستے پر کڑی سے کڑی آزمائش اور امتحان میں اسی طرح ایک سیسہ پلائی ہوئی دیوار کی مانند ڈٹے رہے۔ جس طرح مولانا اپنی ساری زندگی میں زمانے کی ہولناک چیرہ دستیوں، چرخِ کہن کی کج روی اور ستم رانیوں کے درمیان انسانیت کی سربلندی اور سرخروئی کے لئے فرقہ پرستی، تعصب، جہالت اور حرص و آز کی باطل قوتوں سے زبردست قوتِ ارادی، محکم ایمان اور بے پناہ جوشِ عمل کے ساتھ لڑتے رہے۔ یہ اُن ہی اصولوں اور آدرشوں کی یکسانیت اور یگانگی کی کرشمہ سازی ہے کہ آج کشمیر ہند کے رشتۂ استمرار اک

جب کبھی کلکتہ جاتا تو انھیں کے یہاں قیام کرتا تھا۔ ان کی غیور اور خوددار فطرت کو بار بار نزدیک سے دیکھنے اور محسوس کرنے کا موقع ملتا رہا۔ انھوں نے کبھی اپنی خودداری کو مجروح نہیں کیا۔ ایسے مواقع بھی ان کی زندگی میں آئے کہ انھیں سخت آزمائشوں سے گزرنا پڑا لیکن دستِ سوال کبھی کسی کے سامنے نہ پھیلایا اور اپنے عزیز ترین دوستوں کو بھی خبر نہ ہونے دی۔ جب وہ رانچی میں تھے تو ان کو گورنمنٹ سے نظربندی الاؤنس بہت کم ملتا تھا۔ اور وہ بھی سارے کا سارا کتابوں کی خریداری میں ختم ہو جاتا۔ تکلیف و عسرت کی زندگی تھی پر کبھی زبان پر اُف نہ آنے دی۔ اس زمانے میں ڈاکٹر انصاری نے بہت منّت و سماجت اور اصرار کے ساتھ کچھ مدد کرنی چاہی لیکن انھوں نے قبول نہ کیا۔ نفظ وضع داری کی جیتی جاگتی تصویر تھے ضبط کا یہ عالم تھا کہ شاذ و نادر ہی کبھی انھیں غصہ آیا ہو۔ ہر مسئلے پر بے حد ٹھنڈے دل سے سوچنے کے عادی تھے۔ ان کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ وہ کبھی اپنی بُرائی کرنے والوں کو بھی بُرا نہ کہتے تھے۔ اگر ایسے شخص کی کوئی اُن کے سامنے بُرائی کرتا تو وہ اس کی کوئی اچھائی بیان کرتے یا تعریف کر دیتے تھے۔ صابر اس درجہ تھے کہ کسی حال میں بھی اور کسی موقع پر بھی انھوں نے اپنے سخت سے سخت معترضین کا بھی کبھی جواب نہ دیا۔ تقسیم سے پہلے لیگی حضرات و لیڈران نے اُن کی کیا کچھ تضحیک نہ کی مگر اُس نیک دل نے نہ اُس وقت کسی پبلک اسٹیج سے اور نہ تنہائی میں اُن کی شکایت کی اور نہ اُن کے بارے میں کبھی کوئی عامی لفظ زبان پر لائے اور نہ بعد میں جب دو قومی نظریے کی ہلاکت کا پورا پورا احساس ہو چکا تھا، انھوں نے کبھی طعنے یا شکوے کرکے بدلہ چکانے کی سوچی بلکہ ۱۹۴۷ء میں لکھنؤ کے مسلم کنونشن کے اسٹیج پر جب وہ تشریف لائے تو لوگ سمجھ رہے تھے کہ مولانا آزاد اب مُسلم لیگ کو بُرا بھلا کہیں گے، اس کے لیڈروں کی پولیں کھولیں گے اور ان کی پالیسی کی دھجیاں اڑائیں گے۔ مگر اُن کی زبان سے جو پہلا فقرہ نکلا وہ یہ تھا کہ "میں یہاں کسی کو ملامت کرنے نہیں آیا ہوں، جو ہونا تھا سو ہو گیا۔ اب ہم کو آئندہ کی فکر کرنی ہے۔"
کون تھا جو اس بلند اخلاق اور حسن کردار سے متاثر ہوئے بغیر رہ جاتا۔ مسلمانوں کی گذشتہ مصرت رساں سیاست کا جب آپس میں کبھی ذکر آیا تو یا خاموش رہ گئے یا اگر کچھ کہا تو

بڑی چیز علمیت تھی۔ اس کی نسبت مجھ جیسا جاہل کہہ ہی کیا سکتا ہے۔ پھر بھی اتنا ضرور عرض کرنے کی جرأت کرتا ہوں کہ اُن جیسا اس زمانے میں کوئی اور نہیں تھا اور زمانہ مدّتوں اب ایسا کوئی اور پیدا نہیں کر سکے گا۔ نہ معلوم دنیا کو کب تک انتظار کرنا ہوگا۔

دنیا میں بے مثال عالم ہونے کے علاوہ مولانا محب وطن اور بہت بڑے درجہ کے محب وطن تھے۔ کانگریس اور ملک کی خدمات جو مولانا نے انجام دیں ہندوستان کی تاریخ کا ایک زرّیں باب ہوں گی جس کو پڑھ کر ہماری آئندہ نسلیں فخر و مباہات کے ساتھ مرحوم کو یاد کریں گی اور ان کی سیرتوں میں اس یاد سے ایک علو اور بلند حوصلگی پیدا ہوگی۔ باوجودِ وفات مولانا ہمارے درمیان زندہ ہیں۔

مولانا ابوالکلام آزاد زندہ باد!

مسز ارونا آصف علی میئر دلّی کارپوریشن

مولانا آزاد کی عظمت کا چند لفظوں میں احاطہ نہیں کیا جا سکتا ان کی گوناگوں اور درخشاں شخصیت علماء اور عوام دونوں ہی کے لئے سرچشمۂ فیض تھی۔ جس کسی کو اُنھیں قریب سے دیکھنے اور سمجھنے کا موقعہ ملا اس کے لئے یہ ایک بھرپور تجربہ ثابت ہُوا۔

مولانا آزاد ہندوستان کی آزادی کے شاید سب سے زیادہ فصیح بیاں وکیل تھے لیکن جن لوگوں نے ہندوستانی قومیت کی ترقی میں رکاوٹیں ڈالیں، ان کے لئے بھی مولانا کے دل میں انتہائی صبر و شکر کے سوا کچھ نہ تھا۔ مولانا آزاد ہماری تاریخ میں ہندوستان کی اس نشاۃ ثانیہ کے نقیبوں میں شمار کئے جائیں گے جو قومی خدمات کے لئے گویا ایک موسمِ بہار تھا اور جس نے ملک والوں کو بیدار اور ترو تازہ کیا۔

ان کی تحریروں میں نہ صرف ہمہ گیریت ہے جس نے انھیں ادبِ عالیہ بنا یا ہے بلکہ ان میں والہانہ ادبی کیفیت بھی پائی جاتی ہے۔ یہ تحریریں کئی نسلوں تک اُردو کی تاریخ کو متاثر کرتی رہیں گی ہمارے زمانے کا مورّخ اگر مولانا آزاد کی زندگی کا بغور مطالعہ کرے گا تو اس کا کام آسان ہو جائے گا۔

میں ایسے بندھا ہے کہ توڑنے سے ٹوٹ نہ پائے گا اور کشمیری عوام ہند کے دوسرے حصّوں میں بسنے والے اپنے بھائیوں کے شانہ بشانہ تعمیر، امن اور فلاحِ عامہ کے لئے سرزمینِ ہند پر ایک تاریخی اور یادگار جنگ لڑ رہے ہیں۔ آج اگرچہ مولانا ہمارے درمیان موجود نہیں ہیں لیکن اُن کی تعلیمات اور اصول ہمیں پنڈت نہرو کی قیادت میں ایک ایسا سوشلسٹ سماج تعمیر کرنے پر اُبھار رہے ہیں جس میں بلا امتیازِ مذہب و ملت، رنگ و نسل ہند میں رہنے والے سبھی لوگوں کو ترقی کرنے اور آگے بڑھنے کے یکساں مواقع اور سہولیات کی ضمانت دی گئی ہے۔

الغرض مولانا میدانِ سیاست کے شہسوار اور ہماری جدید تاریخ کے ایک ہیرو ہی نہ تھے آپ ایک ہی زندگی اور ایک ہی وقت میں ایک اولوالعزم قومی رہنما بھی تھے، زبردست فلسفی بھی تھے، جادو بیان خطیب بھی تھے، صاحب طرز ادیب بھی تھے، جیّد عالمِ دین بھی تھے اور منجھے سُلجھے ہوئے مدبر اور ماہرِ تعلیم بھی تھے۔ قصّہ کوتاہ مولانا کی ایک ہی زندگی میں بہ یک وقت کئی زندگیاں جمع ہو گئی تھیں۔ متضاد اور بٹی ہوئی حیثیتوں کی یہ جامع زندگی ان تمام خوبیوں اور اچھائیوں کا ایک حسین اور دلربا امتزاج تھی جو ہماری قومی، سماجی اور ثقافتی زندگی کا حاصل ہے۔ اس حیثیت سے مولانا کی زندگی ہمارا ایک قابلِ قدر ورثہ ہے، وہ ورثہ جسے ہم سینے سے لگا کر اپنی اور اپنی نئی پود کی زندگیوں کو خوشگوار بند اور تابناک مستقبل کی لازوال خوشیوں اور مسرّتوں سے مالا مال کر سکتے ہیں۔

میں اس پیغام کی وساطت سے ہند کے قومی رہنماؤں، ادیبوں، شاعروں اور عوام کو یقین دلانا چاہتا ہوں کہ ہم ہندوستان کی برفیلی پیشانی ـــ کشمیر میں مولانا کی زندگی اور تعلیمات کی نورانی مشعل کو اسی طرح فروزاں رکھیں گے جس طرح اب تک روشن رکھے ہوئے ہیں۔

کامیابی کے لئے دعائیں

حافظ محمد ابراہیم وزیر آبپاشی و بجلی حکومتِ ہند

مولانا مرحوم کی نسبت میرا کچھ عرض کرنا چھوٹا منہ بڑی بات ہے۔ مولانا کے پاس سب سے

ہادی القادری

تواریخ انتقال ابوالکلام آزاد از ہادی

۱۹ ء ۵۸

ہوئے جو حضرتِ آزاد زیست سے آزاد | بپا ہے قصرِ حکومت میں نالہ و فریاد

وہ جن کو فکر ہو تاریخِ سالِ رحلت کی | انھیں یہ چاہیئے رکھیں یہ شعرِ ہادی یاد

وزیرِ دانش و دانش ور و ادیب شہیر

۱۶۸۳

مجاہدِ وطن، آزاد، ابوالکلام آزاد

۲۷۵ + ۱۶۸۳ = ۱۹۵۸ء

وفورِ جذبۂ دل اور شدتِ احساس | بیاں کر نہیں سکتا ہے منطقِ انسانی

کوئی بتاؤ تو کیا بات ہے کہ کرنے لگی | زبانِ کلکِ گہر بار اشک افشانی

یہ کون اٹھ کے گیا ہے کہ بزمِ اردو میں | ہوئی ہے رنج و غم و درد کی فراوانی

ملی ہے خوب یہ تاریخِ سالِ فصلی بھی

ابوالکلام خطیب و ادیب لاثانی

۱۳ ف ۶۷

وہ جسے سب ابوالکلام کہیں | ایسے اچھے خطیب سے رخصت

عقل کرتی تھی جس سے استدلالؔ | ہند کے اس لبیب سے رخصت

دوستوں کے قلوب جانتے ہیں | ہے قیامت حبیب سے رخصت

کوئی پوچھے اگر سنہ ہجری

کہیئے "ہادی" ادیب سے رخصت"

۱۳۷۷ھ

؎ استدلال سے عقلوں نے روشنی حاصل کی ہے

گاندھی، نہرو اور آزاد یہ تین شخصیتیں ہندوستانیوں کی دو نسلوں کے خیال و عمل پر پوری طرح چھائی رہی ہیں۔ ان تینوں شخصیتوں کی قوتِ تاثیر اس بات میں مضمر ہے کہ یہ عقل و کردار کے تین عجیب و غریب رجحانات کا ہم آہنگ امتزاج تھا۔

مولانا آزاد کی وفات سے جو خلا پیدا ہو گیا ہے وہ پُر نہیں ہو سکتا۔ لیکن اگر ہم ان کی عظمت اور ذہانت کے ورثے کو برقرار رکھ سکے تو وہ برابر آیندہ نسلوں کو متاثر کرتے رہیں گے۔

فاتحۃ السنۃ الثالثہ

"جو رب الارباب انسان کی غذا جسمانی کا یہ سب کچھ سامان رکھتا ہے کیونکر ممکن ہے کہ اس کی روحانی غذا کا انتظام نہ کرے۔

یہ روحانی غذا کیا ہے۔ یہ ہدایت و سعادت انسانی کی دعوتِ الٰہیہ ہے جس کے لئے فی الحقیقت روحِ انسانی بھوکی پیاسی ہوتی ہے۔ اور جس طرح جسم حیوانی مدّتوں کی بھوک اور پیاس کے بعد بے قرار و مضطرب ہو کر غذا کو پکارتا ہے اسی طرح ضلالت کی شدّت اور ہدایت کا فقدان بھی روحِ انسانی کو ایک معنوی جوع و عطش میں مبتلا کر دیتا ہے اور وہ اپنی زندگی کے لئے اپنی غذا کو دیوانہ وار پکارنے لگتی ہے پس وقت آتا ہے کہ اس حکیم علی الاطلاق، اس فاطر الارض والسماوات، اس مدبر الامر والاشیاء اور اس مسبب الاسباب حقیقی کی ربوبیت ظاہر ہوتی ہے جس نے انسان کی حیاتِ جسمانی کے لئے تمام دنیا کو طرح طرح کے اغذیہ و ثمرات کی بخشش سے ایک خوانِ کرم بنا دیا ہے۔ اس کا دستِ مخفی غذائے روحانی کا بیج بوتا ہے اور اپنی نشو فرمائی سے اسے یکایک سربلند و بالاقامت بنا دیتا ہے۔ پھر اس کی سعادت و ہدایت کی نعمتوں سے زمین کے بڑے بڑے ٹکڑے بھر جاتے ہیں اور اس بخشش کی دعوت سے ارضِ الٰہی گونج اٹھتی ہے۔"

(الہلال ۱۳ جنوری ۱۹۱۳ء)

بکھر کے رہ گئی کاغذ پہ روحِ عصرِ رواں
اُٹھا لیا جو حیات آشنا قلم تو نے

حریمِ قوم و وطن کے اداس طاقوں پہ
سجا دئے "ادب و شعر" کے صنم تو نے

سنور گیا مری راتوں کا بانکپن کچھ اور
دئے "ہلال" کو وہ دلبری کے خم تو نے

جبینِ "تاج و ہمالہ" پہ کلکِ ہمت سے
کیا فسانۂ انسانیت رقم تو نے

رموزِ دیں کو کیا فاش اس سلیقے سے
عرب کو کر دیا آوارۂ عجم تو نے

ہوا بھی تیرے چراغوں کا رُخ نہ موڑ سکی
خدا گواہ بڑا مستقل مزاج تھا تو

تری حیات تھی "سیف و قلم" کا گہوارہ
کہ شعر و دین و سیاست کا امتزاج تھا تو

کسے نصیب ہوئی تیرے فکر کی معراج
سرِ تدبّر و خود آگہی کا تاج تھا تو

عجیب تھا وہ تری طبعِ سخت گیر کا لوچ
سمجھ سکا نہیں پتھر تھا یا زجاج تھا تو

تو آنسوؤں کا وہ نم تھا جو میری آنکھ میں ہے
ملا جو مملکتِ دل سے وہ خراج تھا تو

کرن تراش لی تو نے غبارِ خاطر سے
شبوں کے روپ میں نورِ سحر ملا تھا تجھے

تضادِ "شعر و شریعت" کو کر دیا ہم رنگ
بلند کتنا مذاقِ نظر ملا تھا تجھے

ملی تھی آنکھوں کو تیری نظر غزالی کی
ضمیرِ پاک و دلِ خود نگر ملا تھا تجھے

شرابِ حافظِ شیراز تھی سبو میں ترے
بہ قدرِ شوق، سرودِ ہنر ملا تھا تجھے

وہ بے پناہ لطافت تری ظرافت کی
مزاجِ خندۂ گلہائے تر ملا تھا تجھے

فضا ابنِ فیضی

فردوسِ گم شدہ

بہ یادِ آزاد

لُٹی لُٹی سی ہے ہر جنّتِ نگاہ کہ تُو
تمام دلکشئ کائنات لے کے گیا

خیال و فکر کی نزہت، دل و جگر کا سکوں
نظر کی تازگی، لطفِ حیات لے کے گیا

جو صبح سے بھی حسیں تھی بہ یادِ رفتۂ حبیب
تو اپنے ساتھ وہ پُرکیف رات لے کے گیا

کنارِ چشمۂ حیواں ہے خضر تشنہ بلب
تو اپنے جام میں آبِ حیات لے کے گیا

یہ کس مقام پہ ہے تو کہ جستجو میں تری
جنوں مجھے بہ حدِ ممکنات لے کے گیا

مجھے نہ بھولے گی تیرے جنوں کی وضعِ جمیل
کہ اپنی ذات سے خود ایک انجمن تھا تُو

بجھا کبھی نہ تری شوخئ ہُنر کا چراغ
سحر کی اوس پہ ہنستی ہوئی کرن تھا تُو

ملی تھی خلعتِ شادابئ بہار تجھے
چمن میں لالۂ رنگیں کا پیرہن تھا تُو

خمارِ کم نگہی تھا تری شراب سے دُور
نمودِ نشۂ مینائے علم و فن تھا تُو

ہزار صبحوں کا پیکر تھی ایک رات تری
جمالِ شامِ تمدّن کا بانکپن تھا تُو

ره سکا قفسِ رنگ و بو میں قید کہ تو
ازل سے فطرتِ آزاد لے کے آیا تھا

تر گئی جو رگِ گل میں بن کے خون کی بوند
وہ موجِ نکہتِ برباد لے کے آیا تھا

سے خبر تھی تو ہنستی ہوئی نگاہوں میں
فسانۂ دلِ ناشاد لے کے آیا تھا

زل سے رہا ہر دور میں جنوں تیرا
غلط کہ تو لبِ فریاد لے کے آیا تھا

رے لبوں پہ دمِ واپسیں تھا کس کا نام
تو دل میں کس کی حسیں یاد لے کے آیا تھا

ذائقؔ بنگلوری

قطعۂ تاریخ بر وفاتِ امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم

عالمِ جید، فقیدالمثل، دانائے علوم
زیں سرائے ششدری نقلِ مکاں فرمودہ ہے

سرفروشِ ملک و ملت شہسوارِ حریت
بست رختِ زیست راہِ آخرت پیمودہ ہے

روزِ شنبہ بود بست و دو میں از فروری
طائرِ جانش بپرِ پرواز را بکشودہ ہے

زاد بودش بود مکہ شصت و نہ سالہ حیات
در کنارِ خاکِ دہلی آخرش آسودہ ہے

سالِ ترحیلش، مکرر گفت ذائقؔ عیسوی
مشرقستاں از امام الہند خالی بودہ ہے

۵۸ ء ۱۹

سدا بہار تھی تیرے قلم کی رعنائی — تو چشمِ علم و ہنر میں خمار بن کے رہا
خوشا علومِ حدیث و کتاب کی تابش — تو اپنے سوزِ دروں کا نکھار بن کے رہا
بڑا غیور تھا عشقِ نیاز مند ترا — حضورِ حسن بھی تو وضعدار بن کے رہا
لہو تھا کتنی بہاروں کا تیری نبضوں میں — نفس نفس ترا اک لالہ زار بن کے رہا
فضائے قلعۂ احمد نگر ہو یا دہلی — جہاں جہاں بھی رہا تو بہار بن کے رہا

وہ تیری آہِ سحر تھی کہ موجِ بادِ نسیم — قفس میں ڈال دی جس نے بنائے گُل ریزی
تھی تیری چائے کی پیالی اداشناسِ سبو — بڑا حسیں تھا یہ اسلوبِ کیف انگیزی
فغاں! کہ رندِ سحر خیز اب وہ تیرے بعد — رہی نہ آبروئے شیوۂ سحر خیزی
کرن بھی ڈوب گئی اپنے آفتاب کے ساتھ — کہاں وہ صبحِ تمنّا کی اب دل آویزی
"کسے کہ زود گسل نیست دیر پیونداست" — نہ ہے نصیب تری خوئے دیر آمیزی

گرہ کشائے زمانہ تھا تیرا ناخنِ ہوش — جنوں ملا تھا بڑا عہد آفریں تجھ کو
تری نگاہ سے اسرارِ شوق کیا چھپتے — عطا ہوئی تھی نگاہِ کرشمہ بیں تجھ کو
ہوائے منزلِ جاناں کب آئی راس تجھے — قرار مل نہ سکا ایک پل کہیں تجھ کو
بلند تر تھی ترے ذوق و کیف کی دُنیا — کہ جامِ زہر بھی تھا جامِ انگبیں تجھ کو
نچوڑ تھا کئی صدیوں کا شخصیت تیری — بھُلا سکے گی نہ یہ خاکِ عنبریں تجھ کو

مجھ کو نہیں تھا کبھی کبھی ان سے ملتا تھا اور جب ملتا تھا تو اُن سے روشنی اور گرمی پاتا تھا۔
ابھی سال بھر سے کم عرصہ ہوا کہ ایک بات میں مجھے ان سے کچھ رنج ہُوا اور میں ان سے کچھ کھچا
اس وقت آپ کے سامنے اقرار کرتا ہوں کہ میں نے اپنی کم ظرفی کی وجہ سے اس کھچاوٹ کو ان پر
ظاہر بھی کیا مگر اس کو وہ وقار نے، بجائے اس کے کہ اسے میری گستاخی سمجھے مجھ پر محبت کی بھرمار
کی۔ اور جب میں ان کے بلانے پر ان سے ملنے گیا تو میں شرم سے گڑا جاتا تھا اور وہ محبت سے
اُبلتے جاتے تھے اور میرے اوپر شفقت کی ایسی بارش تھی کہ میں اس کو کبھی بھلا نہیں سکوں گا۔
مولانا بہت سی حیثیتیں رکھنے والے آدمی تھے۔ وہ بہت بڑے عالم تھے مذہب کے، بہت بڑے
عالم تھے ادب کے، ادب پر، لٹریچر پر بڑی نظر رکھتے تھے۔ بڑا اچھا مذاق رکھتے تھے۔ کتابوں
پر عاشق تھے اور کوئی سیاست دان یہ نہ سمجھے کہ انھوں نے سیاست کی خاطر اپنے علم کو کبھی بھی
چھوڑا ہو، وہ آخری لمحے تک اس کے ساتھ وفادار رہے۔ ہاں وہ یہ جانتے تھے کہ علم ایک
بار بھی بن سکتا ہے، علم ایک ایسا بوجھ بن سکتا ہے جو آدمی کو دبا دے اور اس کو ناکارہ کر دے
وہ علم کے ساتھ اپنی سماجی ذمہ داریوں کو بھی سمجھتے تھے۔ وہ اپنے وطن کے فرائض کو بھی جانتے
تھے۔ انھوں نے آخر وقت تک علم کو نہیں چھوڑا اور علم کی لگن اُن کے دل میں لگی رہی۔ کتابوں
کی تلاش، چیزوں پر غور و فکر، ان کو سوچنا، ان کو سمجھنا، ان کے جوڑ ملانا، چاہے وہ
تاریخی مسائل ہوں، چاہے وہ ادبی مسائل ہوں، چاہے وہ علمی مسائل ہوں، ان کا یہ شغل
آخر تک باقی رہا۔ ابھی آخری مرتبہ دسمبر میں جب میں ان سے ملا تو وہ دو کتابیں دیکھنا چاہتے
تھے۔ ان کتابوں کے دیکھنے کے لئے پٹنے آنے کا ارادہ ظاہر کیا کہ گوہاٹی کے سفر میں پٹنے آؤں گا
اور وہ دو کتابیں دیکھوں گا۔ افسوس کہ اس کا موقع ان کو نہیں ملا۔ علالت کی وجہ سے نہ وہ
کانگریس میں گئے اور نہ اس لئے پٹنے گئے لیکن ان کی یہ لگن آخری وقت تک رہی۔ مگر کوئی یہ
نہ سمجھے کہ وہ ایسے عالم تھے کہ علم کے بہانے سے اپنے تمام سماجی فرائض سے الگ ہو جاتے اور
سماجی فرائض کا خیال نہ کرتے۔ انھوں نے اپنی مثال سے یہ بتا دیا کہ وہ اپنی ساری زندگی
ایک مجاہد کی طرح اپنی قوم کی آزادی کے لئے، اس کی آزادی حاصل کرنے کے لئے اور آزادی

ڈاکٹر ذاکر حسین

ابوالکلام آزاد

ایک ہمہ گیر شخصیت

یہ تعزیتی ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب نے دلّی کے اُس تعزیتی جلسے میں فرمائی تھی جو
صدرِ جمہوریہ ڈاکٹر راجندر پرشاد کی زیرِ صدارت ۲۳ فروری ۱۹۵۸ء کو منعقد ہوا تھا

راشٹرپتی جی! بھائیو اور بہنو! آپ جانتے ہیں کہ ہم آج کیوں یہاں جمع ہیں۔ اب تک
آپ کے سامنے جو کچھ کہا گیا وہ مولانا کے ساتھیوں کی عقیدت کا اظہار تھا۔ میں مولانا کے ساتھی
ہونے کا فخر نہیں رکھتا ہوں۔ میں ان کے ایک حقیر چیلے ہونے کا فخر رکھتا ہوں۔ آدمی چھوٹا ہو یا
بڑا اپنی زندگی کو بنانے کے لئے کہیں نہ کہیں سے روشنی اور گرمی لیتا ہے۔ میں جب ایک لڑکا ہی
تھا اپنی زندگی کے مٹی کے دیئے کو سُلگانا چاہتا تھا۔ اور لوگوں کی طرح میں نے بھی روئی کی بتّیاں
بنائی تھیں اور اپنی زندگی کے تیل میں ان کو ڈالا تھا اور ڈھونڈتا پھرتا تھا کہ ان کو کہاں سے
جلاؤں۔ اس زندگی کی پہلی بتّی، اس دیئے کی پہلی بتی میں نے مولانا کے دیئے سے جلائی تھی۔
ایک طالب علم کی حیثیت سے میں ان کا 'الہلال' پڑھتا تھا۔ اور جب میں اپنے ساتھیوں میں
بیٹھ کر اس کو پڑھتا تھا اور انھیں سناتا تھا اس وقت اس بتّی میں آگ لگی تھی۔ یوں اور جگہ
سے بھی میں نے آگ لی۔ لیکن آج میں اقرار کرتا ہوں کہ پہلی آگ انھیں سے لی تھی۔ میں ان سے
دُور دُور رہتا تھا اس لئے کہ میں سیاست کا آدمی نہیں ہوں۔ ہر وقت اُن کے ساتھ کا موقع

روشن بھی کرتی تھی ۔ وہ زبان بند ہے وہ قلم ٹوٹ گیا ہے لیکن وہ مثال باقی ہے اور ہمیں چاہیئے
کہ ہم اس مثال سے گرمی بھی لیں اور روشنی بھی لیں اور اپنی زندگی کو ایسا بنائیں جیسا کہ
وہ چاہتے تھے کہ ہم بنائیں اور جس کی مثال وہ ہمارے لئے چھوڑ گئے ۔ ہمارے سامنے ایک
بہت بڑا کام ہے ۔ اس قوم کے بنانے کا کام کوئی کھیل نہیں ہے ۔

بستی بسنا کھیل نہیں بستے بستے بستی ہے

کوئی یہ نہ سمجھے کہ ہتھیلی کے اوپر سرسوں جم سکتی ہے اس میں نہ معلوم کتنے ابوالکلام
کھپ جائیں گے کتنی نسلیں کھپ جائیں گی اور یہ کام کبھی ختم نہ ہونے والا کام ہے ۔
اس لئے ہمیں اپنے سامنے اس راستے کو رکھنا چاہیئے ۔ ان مثالوں کو زندہ رکھنا
چاہیئے ۔ وہ اس طرح زندہ رہ سکتی ہیں کہ ہم وہ کریں جو وہ کرتے رہے اور کوئی یہ نہ سمجھے کہ ہم وہ
نہیں کر سکتے ہیں جو وہ کرتے تھے ۔ کسی کی جگہ پُر نہیں کی جا سکتی ۔ بہت بڑے بڑے لوگ گزر گئے
جیسا کہ کسی نے ابھی حال میں کہا تھا کہ بعض دفعہ ایسا ہوتا ہے کہ آسمان پر بہت سے ستارے
ایک ساتھ آجاتے ہیں ۔ ہمارے قومی آسمان پر بھی بہت سے ستارے ایک ساتھ آگئے تھے
وہ ایک ایک کرکے ٹوٹتے جاتے ہیں لیکن اس کی پروا نہیں کرنی چاہیئے، اس لئے کہ پروا کرکے
کچھ نہیں ہو سکتا ۔ ان کا جانا ضروری ہے، برحق ہے ۔ کوئی ان کو واپس نہیں لا سکتا ۔ ہمارا
فرض یہ ہے کہ ہم اپنی زندگی میں کسی ترکیب سے ان کاموں کو پورا کرنے کی کوشش کریں ۔ جو کام
ایک آدمی کرتا تھا وہ ایک ہزار آدمی مل کر کریں لیکن اپنی زندگی کا رُخ وہی رکھیں ۔ سچائی
کی طرف رکھیں، عمل کی طرف رکھیں، علم کی طرف رکھیں، ایک دوسرے کو سمجھنے کی کوشش
کریں اور یہ جانیں کہ ہمارے اوپر جو فرائض ہیں وہ پوری طرح ادا کئے جانے کے لئے روز
مطالبہ کرتے ہیں ۔ یہ فرائض کبھی ختم نہیں ہوتے ۔

میرے خیال میں مولانا نے جو ایک سب سے بڑی خدمت کی وہ یہ ہے کہ ہر مذہب
کے آدمی کو انھوں نے یہ جتایا کہ مذہب کی دو حیثیتیں ہوتی ہیں ۔ ایک مذہب کی حیثیت ہوتی ہے
جو تفریق پیدا کرتی ہے، ایک مذہب کی حیثیت ہوتی ہے جو لوگوں کو الگ الگ کرتی ہے،

حاصل ہونے کے بعد آزادی کو اچھی نیو اور بنیاد پر قائم کرنے کے لئے صرف کر سکتے ہیں۔ انھوں نے یہ ثابت کر دیا کہ علم ایک گورکھ دھندا نہیں ہے کہ جس سے لوگوں کو دھوکے دئے جائیں بلکہ وہ ایک روشنی ہے جس سے آدمی دوسروں کو روشنی دکھا سکتا ہے۔ جاننے والے جانتے ہیں کہ اس عالم، اس مفکر، اس مردِ مجاہد نے کلمۂ حق کہنے، سچی بات کہنے، ناگوار سچی بات کہنے کی مثالیں قائم کی ہیں۔ سچ بات کا کہنا سب سے بڑا جہاد ہے۔ سچ بات کہنے میں بڑی ناگواریاں ہیں۔ لوگ ناخوش ہوتے ہیں اور مولانا سے لوگ کیا ناخوش نہیں ہوتے۔ یہاں مسلمان بھائی ہوں گے۔ ہم سوچیں کہ ہم نے مولانا کا کس کس طرح دل نہیں دکھایا۔ ہم نے مولانا کو کیا کچھ نہیں کہا۔ کون سا بُرا لفظ ہے جو ہم نے ان کے لئے استعمال نہیں کیا لیکن اس وقار کے پتلے نے ایک لفظ کہا کسی کے متعلق ؟ کوئی ہے یہاں جو یہ شہادت دے سکتا ہے کہ اس نے کبھی کسی کی بابت کوئی ایسا کلمہ سنا کہ انھوں نے شکایت کی ہو یا بُرا مانا ہو۔ سب کچھ گزر جاتا تھا اور اس کی وہ بالکل پروا نہیں کرتے تھے، وہ کلمۂ حق ضرور کہتے تھے۔ مشورہ لیجئے، صحیح مشورہ دیتے تھے۔ جیسا کہ ابھی کہا گیا کہ وہ کم آمیز تھے کچھ عرصے سے زیادہ کم آمیز ہو گئے تھے۔ لوگوں سے کم ملتے تھے لیکن وہ سب کے ساتھی تھے۔ وہ اس کمرے میں بیٹھ کر ہمارے سب کے ساتھی تھے۔ اور اس طرح ساتھی کہ ہمیں محسوس ہوتا تھا کہ وہ ہمارے ساتھی ہیں۔ اس لئے کہ جب وہ بات کہنے کی ضرورت ہوتی تھی جو ہم چاہتے ہیں کہ کہی جائے اور جو ہم سمجھتے ہیں کہ ہم نہیں کہہ رہے ہیں اور ہماری طرف سے نہیں کہی جا رہی ہے وہ اس کو کہتے تھے اور ہمیں یقین تھا کہ وہ اس کو کہہ سکتے ہیں اور ایک مردِ مجاہد کے واسطے یہ بہت بڑا مرتبہ ہے۔ ان سب میں ہمارے واسطے بہت بڑی عبرتیں ہیں۔ ان سب میں ہمارے واسطے بہت بڑے سبق ہیں اور جیسا کہ میں نے کہا چونکہ میں ایک طالب علم کی طرح سبق لینے کے لئے ہی ان کے پاس گیا تھا، آج بھی یہ سمجھتا ہوں کہ وہ سبق جاری ہے۔ اگرچہ وہ ہم میں نہیں رہے جیسا کہ راشٹرپتی جی نے کہا کہ وہ قلم جس سے موتی برستے تھے، وہ قلم جس سے بجلیاں بھی گرتی تھیں، وہ زبان جس سے پھول برستے تھے اور جس سے چنگاریاں بھی برستی تھیں، جو باطل کو جلاتی بھی تھی اور سچ کو
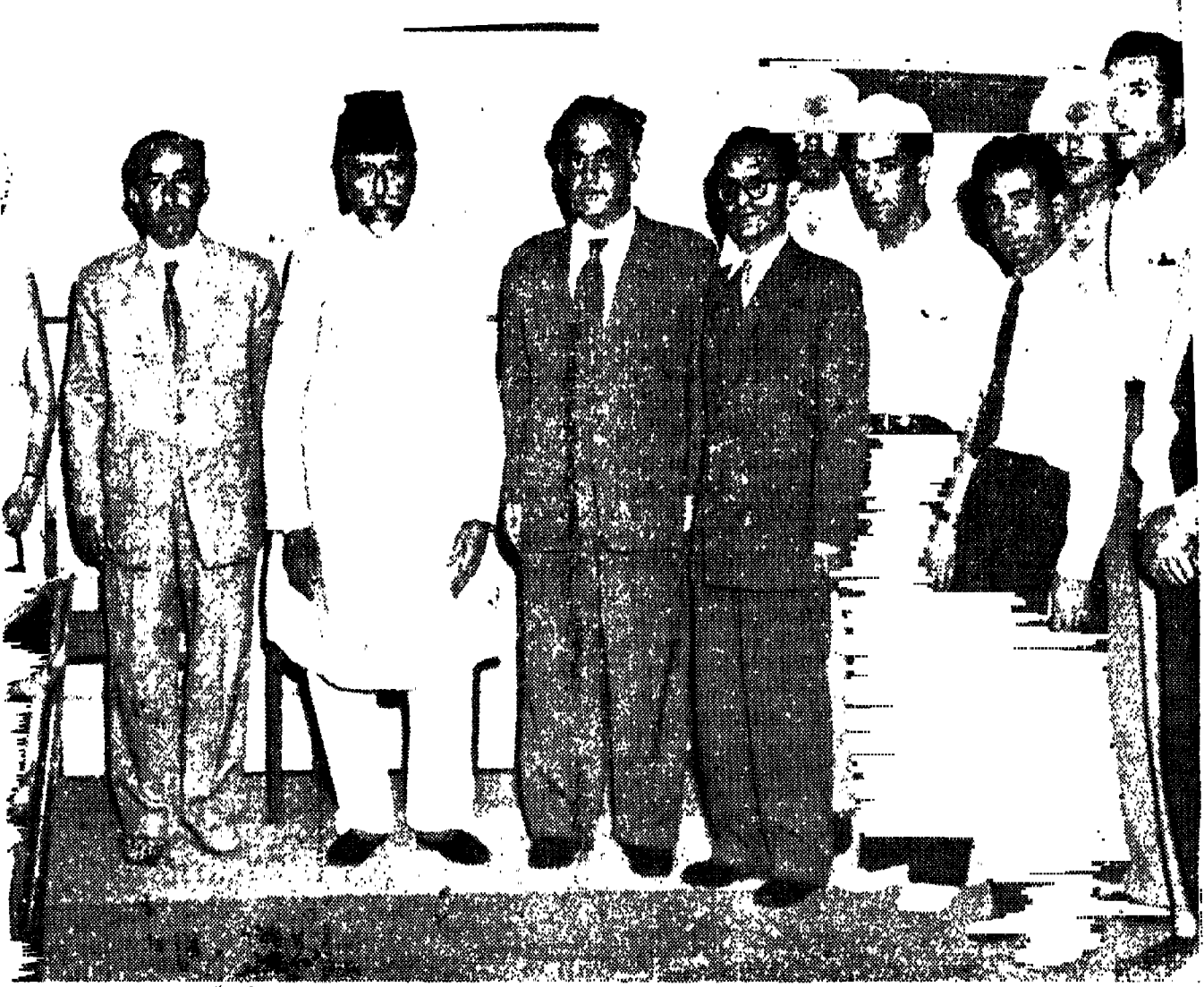
اپریل ۱۹۵۲ء میں ایرانی پروفیسروں اور طلباء کے ساتھ

مارچ ۱۹۵۷ء میں دمشق یونیورسٹی کے ڈاکٹر احمد سمان سے ہمکلام ہیں۔
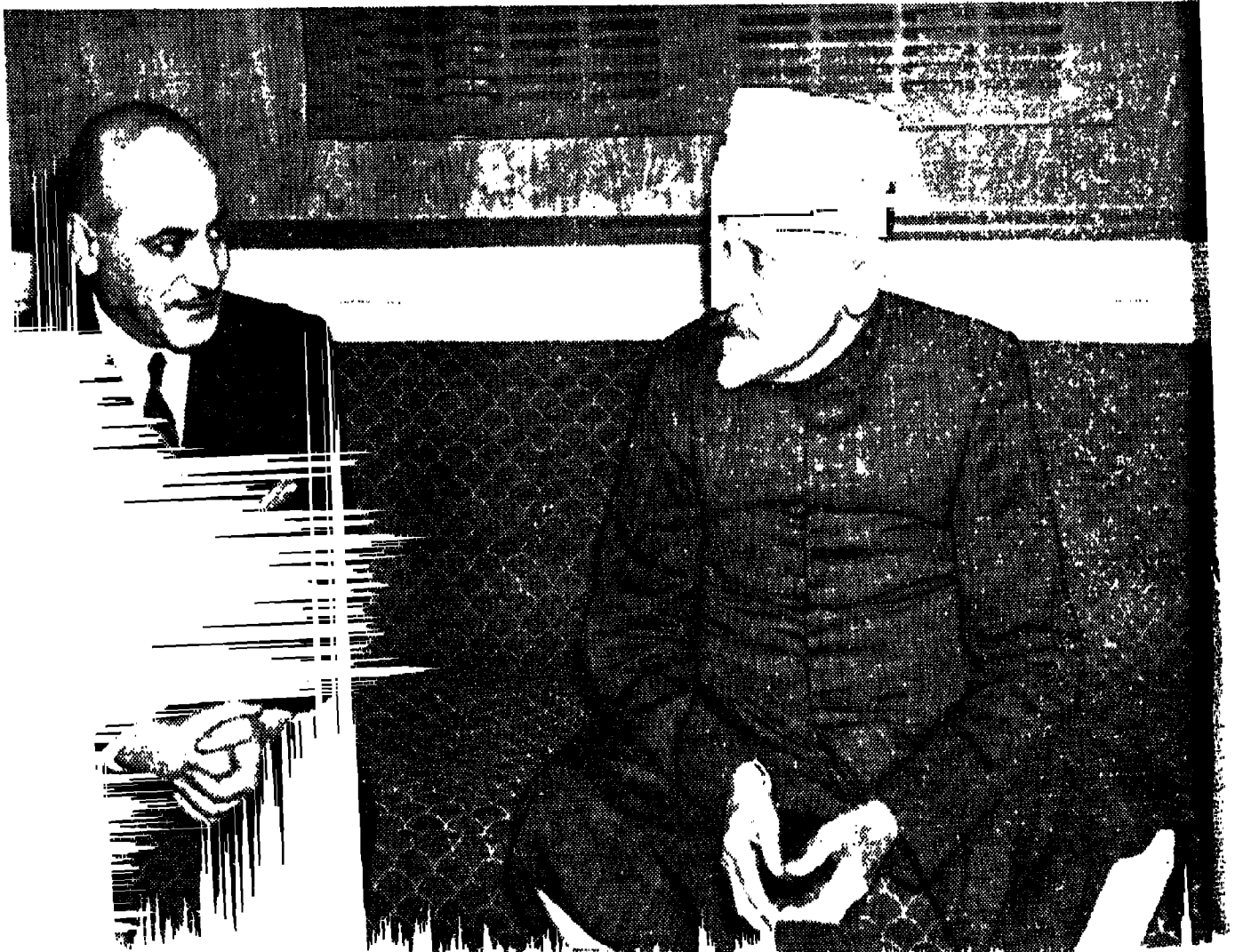
جو لوگوں میں نفرت پیدا کرتی ہے۔ وہ مذہب جھوٹا مذہب ہے۔ انھوں نے یہ بتلایا کہ مذہب کی روح ملانے والی روح ہے، مذہب کی روح ایک دوسرے کو پہچاننے والی روح ہے، مذہب کی روح خدمت کی روح ہے، مذہب کی روح دوسروں کے لئے اپنے کو مٹانے کی روح ہے، مذہب کی روح وحدت کو ماننے کی روح ہے، ساری زندگی کی وحدت کو ماننے کی روح ہے۔ اور یہ ایک ایسا سبق ہے جو تمام مذہبی جماعتوں اور تمام اُن لوگوں کو سیکھنا چاہیئے جو چھوٹی چھوٹی ٹکڑیاں بنانا چاہتے ہیں۔ زبان کے اوپر یا صوبے کے اوپر یا کسی ذات پات کے اوپر یا کسی مذہب کے اوپر ٹکڑیاں بناکر ہماری زندگی کی وحدت کو مٹانا چاہتے ہیں۔ ہمارے ملک میں اس وقت جو سب سے بڑا مرض ہے وہ یہ کہ ہمارے پاس جو چھوٹی وفاداریاں ہیں، تنگ وفاداریاں ہیں وہ زیادہ قوی ہیں۔ ہم چھوٹے چھوٹے گروہوں سے زیادہ وابستہ ہیں اور بڑے گروہ کو پوری طرح نہیں سمجھتے ہیں۔ ہم کو چاہیئے کہ اپنی چھوٹی وفاداریوں کو اس بڑی وفاداری کا تابع کریں۔ کوئی ضرورت نہیں ہے کہ چھوٹی وفاداریاں توڑ دی جائیں۔ کسی کو یہ ضروری نہیں ہے کہ وہ سکھ نہ رہے، مسلمان نہ رہے، ہندو نہ رہے، یا پارسی نہ رہے لیکن اس کو پہلے اپنے دیس کا پھر تمام انسانیت کا خادم بننا چاہیئے۔ تب وہ سچا مسلمان ہے، تب وہ سچا ہندو ہے، تب وہ سچا عیسائی ہے، تب وہ سچا پارسی ہے، تب وہ سچا سکھ ہے۔ یہ سبق مولانا کی زندگی سے جیسا روشن طور پر ہمیں ملتا ہے اور یہ سبق جس طرح ہمارے واسطے آج کی زندگی میں اور ہماری قومی زندگی میں ضروری ہے اس کے اعتبار سے ہم سمجھتے ہیں کہ آج کا دن ہمارے لئے اس عہد کرنے کا دن ہے کہ ہم اس روح کو، مذہب کی سچی روح کو اپنی قومی زندگی میں کارفرما کریں۔

مولانا آزاد نئی دلّی میں شاہِ افغانستان کا خیر مقدم کرتے ہوئے
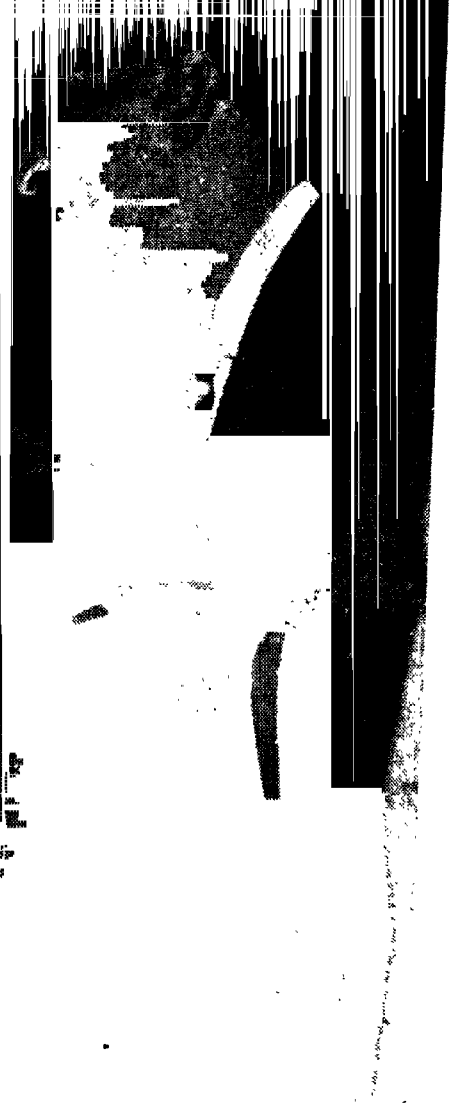
سوویٹ اکادمی آف سائنسز کے
نائب صدر پروفیسر استرو وتیانی نوف
مولانا آزاد کو کتابوں کا تحفہ پیش
کر رہے ہیں (۱۹۵۵ء)

انقرہ میں ترکی کے وزیر اعظم عدنان مندرس
مولانا آزاد کا خیر مقدم کر رہے ہیں (جون ۱۹۵۱ء)

جون ۱۹۵۱ء میں مولانا آزاد انقرہ یونیورسٹی کے طلباء کے سامنے 'بیداریٔ مشرق' کے عنوان پر تقریر فرما رہے ہیں۔

ہمایوں کبیر

عہد آفریں شخصیت

کوئی چالیس سال ہوئے جب مولانا ابوالکلام آزاد پہلی بار ہندوستان میں علم و ادب اور سیاست کے میدان میں داخل ہوئے تھے، لیکن آج تک ان کے ہم وطنوں میں ان کے مداح اور ناقد دونوں شامل ہیں، اس بات کا فیصلہ نہ کرسکے کہ مولانا آزاد ایک ادیب کی حیثیت سے زیادہ نمایاں تھے یا بہ حیثیت سیاست دان۔ مولانا آزاد ابھی عنفوانِ شباب کی منزل میں ہی تھے کہ انھوں نے "الہلال" اور "البلاغ" میں آتش نوا مضامین لکھ کر شمالی ہند کی ادبی دنیا میں ایک ہنگامہ برپا کردیا تھا۔ محض ادبی کاوشوں کے اعتبار سے بھی اردو زبان و ادب کی تاریخ میں یہ مضامین اپنی مثال آپ ہیں۔ خطابت، فصاحت و بلاغت، ذہانت و فطانت، تیکھے طنز اور اعلیٰ و ارفع عینیت کا ایسا امتزاج مشکل سے ہی ملتا ہے۔ "الہلال" کے اداریوں میں مضمون نگاری کے جو نمونے پیش کیے گئے انھوں نے اردو نثر میں ایک نئے اسلوب نگارش کی بنیاد ڈالی۔

مگر اس وقت کے نوجوانوں کے دماغ جس چیز سے متاثر ہوئے وہ مولانا آزاد کے مضامین کی صرف ادبی فوقیت یا شاعرانہ حسن نہیں تھا۔ برطانوی اقتدار کے خلاف ۱۸۵۷ء کی ہندوستان کی جدوجہد کے ناکام ہوجانے کے بعد سے ہندوستانی مسلمان مایوسی اور عدم اعتماد کی فضا میں زندگی بسر کر رہے تھے۔ سر سید احمدؔ نے مسلمانوں کی گرتی ہوئی حالت سدھارنے کے لیے اس طریقے پر کوشش کی کہ فاتحوں کی حمایت حاصل کی جائے اور مسلمانوں کو عملی سیاست سے دور
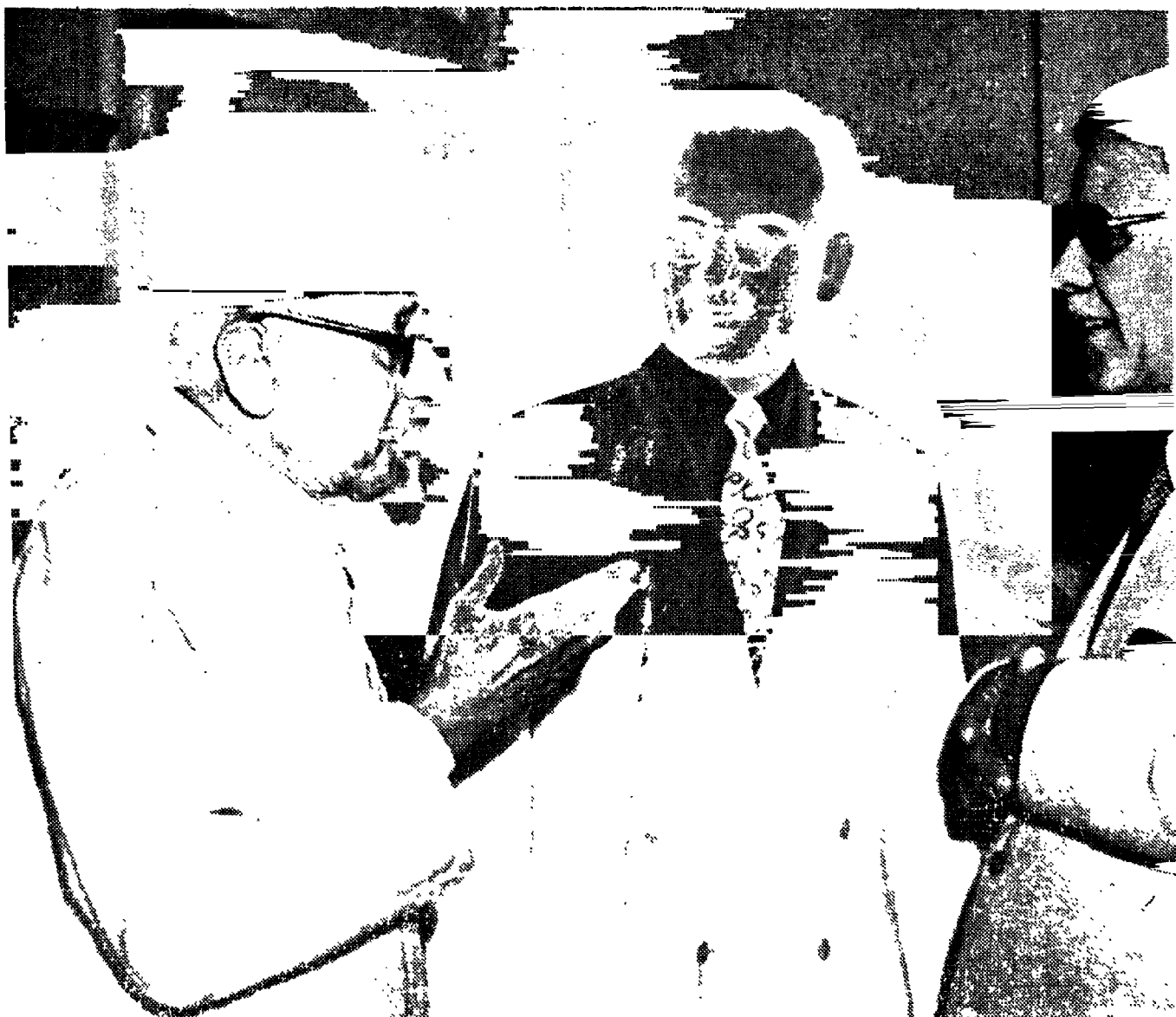
مولانا آزاد افغانستان کے وزیر اعظم مارشل شاہ محمود خاں سے گفتگو کرتے ہوئے (ستمبر ۱۹۵۱ء)

مولانا آزاد دلی کے پالم ہوائی اڈے پر شاہ سعود کے ساتھ۔

ہے جو اسلام کی روایات کو بھول گئے ہیں اور صرف انھیں عقائد پر نظر رکھتے ہیں جو اکثر انگریزوں نے ہندوستانی مسلمانوں سے وابستہ کر دئے ہیں۔ اسلام نے، جس میں جمہوریت، آزادی اور عقلیت پر زور دیا گیا ہے جواں سال مولانا آزاد کو اس وقت کی سیاسی غلامی، جاگیردارانہ طبقاتی درجہ بندی اور ذہنی ظلمت پسندی کے خلاف بغاوت پر اُبھارا۔ چنانچہ وہ ملک وقوم کو سیاسی غلامی، جاگیرداری، خوشامد پسندی اور توہم پرستی سے نجات دلانے کے لئے کھڑے ہوگئے۔ یہ ہمہ گیر آزادی کا جذبہ ہی تھا جو مولانا آزاد کو عزلت نشینی کی خانقاہ سے نکال کر سیاست کے میدانِ کارزار میں لے آیا۔

لیکن سیاسی سرگرمیاں مولانا آزاد کی علمی حیثیت پر کبھی حاوی نہیں ہو سکیں۔ ایک عالم کو زندگی کی مستقل قدروں سے تعلق ہوتا ہے جبکہ سیاستدان عام طور سے وقتی باتوں پر توجہ کرتا ہے۔ مولانا آزاد ڈپلومیٹ یا سیاسی چال باز سے زیادہ ایک بڑے مدبر تھے۔ ان میں دو خصوصیات تھیں جو ان کے تمام سیاسی اعمال کا طرۂ امتیاز ہیں۔ یعنی ان کی سنجیدگی اور مزاجی توازن اور ان کی سلجھی ہوئی قوتِ فیصلہ۔ اگرچہ وہ ایک شاعر کی طرح بے حد حساس واقع ہوئے تھے لیکن انھوں نے کبھی سیاسی فیصلوں میں اپنے جذبات کو حاوی نہیں ہونے دیا۔ کسی شخص کے بارے میں ان کی پسند یا ناپسند ان کے فیصلوں میں کبھی آڑے نہیں آئی۔ انھوں نے ہر معاملے کو واقعیت پسندی کے ساتھ سمجھنے کی کوشش کی اور یہ بات ان کے دوست دشمن دونوں کے لئے تعجب خیز رہی ہے۔ اس مزاجی توازن و سنجیدگی کی وجہ سے ان کا مشاہدہ بہت صاف تھا۔ جب تک کوئی شخص معقولیت پسند رہتا ہے اور ہر بات کو دلائل کی روشنی میں پرکھتا ہے اس وقت تک اس سے غلطی سرزد نہیں ہو سکتی۔ سیاست میں اور دوسری جگہ بھی غلطیاں اسی وقت ہوتی ہیں جبکہ توازن پر تعصب غالب آجاتا ہے اور اس کی وجہ سے ہم زیرِ نظر معاملے کے مختلف پہلوؤں کو پرکھ نہیں پاتے۔ مولانا آزاد کی سنجیدگی اور سلجھی ہوئی قوتِ فیصلہ کی وجہ سے ان کے سیاسی فیصلوں کو ایک طرح کی غیر ذاتی حیثیت حاصل ہو گئی تھی جس سے دوست مرعوب تھے اور مخالف بدحواس۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے

دکھا جائے۔ سیاست سے گریز بالآخر سیاست کی مخالفت بن کر رہ گیا۔ ایسی منفی پالیسی بذاتِ خود بُری پالیسی تھی۔ پھر اس وقت کے حالات کی وجہ سے یہ پالیسی ملک اور قوم کے لئے زبردست خطرے کا باعث ہو گئی۔ مسلمانوں کی سیاست سے الگ ہونے کی کوشش ہندوؤں کی بڑھتی ہوئی قومی بیداری کے مدِّ مقابل تھی، جو اب سیاست میں زیادہ سے زیادہ حصہ لینے لگے تھے۔ سرسید کی ہندوؤں سے دوستی اور قدر و منزلت کے باوجود ان کی سیاست نے بالآخر ایک پلٹا کھایا۔ ان کی پالیسی جو کہ سیاست کے خلاف تھی ان کے جانشینوں کے ہاتھ میں ہندوؤں کے خلاف آلۂ کار بن کر رہ گئی۔

جس وقت مولانا آزاد ہندوستانی سیاست کے میدان میں داخل ہوئے تو ہندوستانی مسلمانوں کی منظور شدہ پالیسی یہی تھی۔ اس وقت نیم سیاسی شعور رکھنے والے مسلمانوں کی بڑی اکثریت کے سامنے سرسید کی پالیسی کے علاوہ کوئی اور راستہ نہ تھا۔ یعنی برطانیہ سے تعاون اور ہندوؤں سے علیحدگی۔ جب مولانا آزاد نے واضح طور پر اس بات کی دعوت دی کہ قومی تحریک سے پورا پورا اتحاد اور تعاون کیا جائے اور برطانوی شہنشاہیت کی طاقتوں کی پُرزور مخالفت کی جائے تو پہلے پہل لوگوں کو بڑا دھکّا لگا اور پھر سرکردہ مسلم سیاست دانوں کے بعض حلقے ناراض بھی ہوئے۔ اس وقت اہل الرائے مسلمانوں کی اکثریت کو مولانا آزاد کا یہ مؤقف ایک سراسر سیاسی بدعت دکھائی پڑا۔ اس کا نتیجہ یہ ہُوا کہ 'الہلال' ہندوستانی مسلمانوں کے اُبھرتے ہوئے جذبے کے اظہار کا ذریعہ بن گیا۔

مولانا آزاد چالیس سال سے زیادہ عرصے تک قومیت، ترقی، آزادی اور جمہوریت کے تقاضوں کے حامی رہے۔ یہ بات بعض لوگوں کو کچھ عجیب سی معلوم ہوتی ہے۔ مولانا آزاد مذہبی علماء کے خاندان سے تعلق رکھتے تھے اور ان کی پرورش اور تربیت ان کی خاندانی روایات کے مطابق ہوئی تھی۔ چوں کہ مولانا آزاد مذہبیات کے زبردست عالم اور اسلامی حدیث و فقہ کے ماہر تھے اس لئے بعض لوگ مصلح اور قوم پرست کی حیثیت سے ان کے رول کو کچھ غیر متوقع سمجھتے تھے۔ لیکن یہ کوئی عجیب و غریب بات نہ تھی۔ یہ بات انھیں لوگوں کے لئے تعجب خیز

پورے طور پر وہ تمام چیزیں عطا کی تھیں جن کی ہر انسان آرزو کرتا ہے۔ لیکن ان کے یہاں ایک تضاد بھی پایا جاتا تھا جسے انسانی دماغ سمجھنے سے قاصر ہے۔ وہ یہ کہ ان تمام انعامات کے ساتھ انھیں حساس طبیعت بھی عطا ہوئی تھی اور ان کے دل میں انسان کے دکھ درد کے لئے ہمدردی بھی تھی۔ چناں چہ اپنی ذاتی کامیابیوں کے ہوتے ہوئے بھی وہ اپنے چاروں طرف اس قدر غلطیوں، فضولیات اور نفرت کو دیکھ کر بے چین رہتے تھے۔

مولانا آزاد جیسے شخص کے لئے روحانی طور پر ایک طرح کی تنہائی محسوس کرنا لازمی امر تھا جو کوئی ان کے قریب آیا اس نے محسوس کیا کہ مولانا روحانی طور پر تنہا ہیں۔ مولانا آزاد بڑے خلیق تھے اور ان کی شخصیت میں بے پناہ کشش تھی۔ پھر بھی ان کی دنیا الگ تھلگ تھی جس میں بہت کم لوگوں کا گذر ہو سکتا تھا۔ وہ اپنے خیالات کی دنیا میں رہتے تھے اور اپنی طبعِ خداداد کے بل بوتے پر دنیا کے دکھ درد کو برداشت کرتے تھے۔ وہ انسانی دکھ درد کو بہت زیادہ محسوس کرتے تھے، مگر اس کے ساتھ ساتھ ان میں قوتِ برداشت بھی تھی اور انسان کی بنیادی اچھائی پر انھیں پورا اعتماد تھا جس کی وجہ سے وہ ہر طرح کی تکالیف میں اپنے آپ کو سنبھالے رہے بنیادی طور پر وہ عقلیت پسند تھے اور ان کا عقیدہ تھا کہ ہر معاملے میں بالآخر منشائے الٰہی پورا ہوتا ہے۔ یہی ان کا ایمان تھا اور یہی اس نسل کے لوگوں کے لئے ان کی وصیت ہے۔

کہ کیوں تلخ ترین مباحثوں میں بھی ان کے منہ سے غصہ یا طیش میں کوئی لفظ نہیں نکلا اور نہ انھوں نے کبھی کسی پر الزام دھرا یہاں تک کہ انھوں نے ان لوگوں کے خلاف بھی کسی غم و غصہ کا اظہار نہیں کیا جنھوں نے ان کی بے عزتی کرنے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا۔ مولانا ہر قسم کے طوفانی حوادث اور اختلافات کے درمیان ذرا نہیں گھبرائے۔ اس ضبط و نظم کی وجہ سے وہ ایک بے پناہ شخصیت کے مالک ہو گئے تھے۔ مولانا کی ہمت اور ارادے کی مضبوطی نے ان کے بدترین دشمنوں سے بھی خراجِ تحسین حاصل کیا۔

چونکہ مولانا آزاد کی شخصیت بیک وقت ایسی درخشاں بھی تھی اور کم آمیز بھی، اس لئے ان کے بارے میں طرح طرح کی کہانیاں مشہور ہو جانا لازمی بات ہے۔ مثلاً یہ کہا جاتا ہے کہ مولانا نے جامعۂ ازہر میں تعلیم حاصل کی تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ ان کی تعلیم زیادہ تر گھر پر ہوئی، البتہ اپنی تعلیم ختم کرنے کے بعد وہ محض ایک سیاح کی حیثیت سے جامعۂ ازہر گئے تھے۔ ایک دوسری کہانی یہ ہے کہ مولانا نے بچپن میں ہی ایک عالم کی حیثیت سے بے پناہ شہرت حاصل کر لی تھی۔ ایک مرتبہ اس زمانے کے ایک مشہور عالم سے کسی موضوع پر ان کی طویل خط و کتابت ہوئی۔ پھر اس عالم نے یہ خواہش ظاہر کی کہ بالمشافہ گفتگو کر کے بعض مسائل طے کر لئے جائیں۔ چناں چہ جب نوجوان مولانا اس بزرگ عالم کے پاس پہنچے تو انھوں نے ان کا خیر مقدم کیا اور تپاک سے پوچھا کہ آپ کے باپ کیوں تشریف نہیں لائے آپ کو کیوں بھیج دیا؟ ایک اور کہانی یہ بھی مشہور ہے کہ کسی جگہ مولانا کو خصوصی مہمان کی حیثیت سے مدعو کیا گیا تھا۔ مگر جب مولانا وہاں پہنچے تو انھیں اندر جانے نہیں دیا گیا کیونکہ کسی کو یہ اعتبار نہیں آ سکتا تھا کہ یہ بے ریش لڑکا وہی مشہور عالم ہے جس کا سب لوگ انتظار کر رہے ہیں۔

قدرت اکثر مختلف لوگوں کو مختلف قسم کے انعامات سے نوازتی ہے۔ کسی کو جسمانی طاقت عطا ہو جاتی ہے تو کسی کو ذہنی قوت۔ قدرت بعض لوگوں کو دھن دولت دیتی ہے تو بعض کو شہرت و عظمت عطا کرتی ہے۔ ایسا شاذ و نادر ہوتا ہے کہ یہ سارے انعامات ایک ہی شخص کو ملیں۔ مولانا آزاد ان چند خوش قسمت انسانوں میں سے تھے جنھیں قدرت نے

نیاز فتحپوری

مولانا آزاد کی صحافتی عظمت

مولانا آزاد کی تمام ذہنی خصوصیات اور جامعیتِ فضل و کمال سے ہٹ کر محض ان کی صحافتی عظمت و خصوصیت پر اظہارِ خیال بہت دشوار ہے۔ مولانا کے صحافتی بدایع کا ذکر کرنا اور اُن تمام عطایائے فطرت کو نظرانداز کر دینا جو قدرت نے ان کے ذہن و دماغ میں ودیعت کئے تھے ممکن نہیں کیونکہ مولانا کی صحافت عہدِ حاضر کی اصطلاحی اور ٹیکنیکل صحافت سے بہت مختلف تھی۔ اتنی مختلف کہ اگر ہم اسے ماورائے صحافت کسی اور چیز سے تعبیر کریں تو غالباً یہ تعبیر غلط نہ ہوگی۔

مولانا اپنی فطری افتاد، اپنے فکر و تصور، اپنے رجحانات و میلانات اور ذہنی اکتسابات کے تنوع کے لحاظ سے اس قدر غیر معمولی انسان تھے کہ بیک وقت نہ ہم انکے جملہ فضائل و خصائص کا احصار کر سکتے ہیں، نہ ان کے دماغ کو مختلف خانوں میں تقسیم کر کے ان کی ادبی، علمی، مذہبی و صحافتی خصوصیات کے درمیان کوئی حدِّ فاصل قائم کر سکتے ہیں۔

لارڈ جارج سے ایک بار کسی نے پوچھا کہ "صحافی بننے کے لئے ایک انسان کو کیا کیا جاننا چاہیئے۔" انھوں نے جواب دیا۔ "سب کچھ اور کچھ نہیں۔ یعنی صحافی دراصل وہ ہے جو دنیا کی تمام باتوں کو جانے، لیکن ماہر کسی کا نہ ہو۔" لیکن مولانا کی یہ عجیب و غریب خصوصیت کہ وہ بہت کچھ جانتے تھے اور جو کچھ جانتے تھے ماہرانہ حیثیت سے جانتے تھے ایسی خصوصیت تھی جس کی نظیر دنیائے صحافت میں مشکل ہی سے مل سکتی ہے۔

منظور علی تمنّا فارقی بجنوری

قطعۂ تاریخ بایں وفاتِ آزاد

۱۹۵۸ء

ہزار حیف بیکایک ز گلشنِ ایجاد — برفت سوئے جناں مثلِ بوئے گل آزاد

نہ رفت پیکرِ آزاد، رفت روحِ کبیر — چہ شد کہ حیف جدا شد ز خانہ خانہ زاد

دریغ، رہبرِ مخلص بہ وقتِ نامسعود — برفت و کرد دلِ دوستاں ز غم ناشاد

زعیمِ عالی ہمم، نیک رائے، خوش تدبیر — کشادہ قلب و منظر، دوربین و دوراُفتاد

ادیب، نکتہ رس و اہلِ علم و صاحبِ فن — کہ بود جنبشِ چشمش پیامِ علم و رشاد

ہزار عقدۂ مشکل، ز ناخنِ تدبیر — بہ صد خلوص بہ فکرِ رسا گرفت و کشاد

ہمیں کہ قوم و وطن را ز پنجۂ افرنگ — بہ نسبتے کہ او آزاد بود، کرد آزاد

بہ قولِ فیصلِ خود مطمئن بہ استقلال — بہ عزمِ کوہِ گراں بار، ہر چہ بادا باد

کسے نہ بود بہ ایواں، مجالِ برگشتن — زباں بہ گفت و بگوش آمدہ "بجا ارشاد"

در آں زماں کہ بایں ظلمت احتیاجش بُود — فتیلئے شمعِ ہدایت، دریغ رفت بہ باد

تمنّا با دلِ غمگین، چشم اشک فشاں — سرِ تلاش چو بہ آستانِ فکر نہاد

برائے سالِ وفاتش ندا ز غیب آمد

کہ حیف رفت بہ جنت ابوالکلام آزاد

۱۳۷۷ھ

واصل بن عطا کا ذکر آیا ہے تو اس کے تبحرِ علمی کا بھی ایک لطیفہ سُن لیجئے۔ یہ پیدائشی تو تلا تھا جسے عربی میں الثغ کہتے ہیں۔ رے کا تلفظ وہ صحیح نہ کر سکتا تھا۔ لیکن اس کی ذہانت اور لسانی مہارت کا یہ عالم تھا کہ جب وہ کسی مجمع میں تقریر کرنے کھڑا ہوجاتا تو وہ کوئی لفظ ایسا استعمال ہی نہ کرتا جس میں رے پائی جاتی ہے۔ ایک بار اس سے کسی نے پوچھا کہ اگر تم کو یہ کہنا ہو کہ "وہ گھوڑے پر سوار ہُوا اور اپنا نیزہ تانا" تو کیا کہوگے۔ عربی میں اسی مفہوم کو یوں ادا کریں گے "رکب علی فرسہ وجر رمحہ" اس میں چار جگہ رے آتی ہے۔ واصل نے کہا کہ میں اسے یوں کہوں گا:۔ "استوی علی جوادہ سحب عاملہ" خیر یہ تو ایک دلچسپ بات تھی جس کا ذکر ضمناً آگیا۔ لیکن اس میں شک نہیں کہ مولانا آزاد کو زبان پر اتنا ہی عبور حاصل تھا۔

مولانا عجیب وغریب دماغی اہلیتیں لے کر پیدا ہوئے تھے جن کو زمانہ نے یا خود اُن کی خلوت پسند طبیعت نے اُبھرنے کا موقع نہ دیا اور آج ہم انھیں صرف 'الہلال' و 'البلاغ' کے رئیس التحریر یا 'تذکرہ'، 'ترجمان القرآن' اور 'غبارِ خاطر' کے مصنف ہونے ہی کی حیثیت سے جانتے ہیں ورنہ حقیقت یہ ہے کہ وہ اس صدی کے مجدد ہونے کی تمام صلاحیتیں اپنے اندر رکھتے تھے۔

مولانا کے حالاتِ زندگی اور ان کے امیال وعواطف سے بحث کرنا ہمارے موضوع سے خارج ہے ورنہ یہ حکایتِ لذیذ دراز تر ہو جاتی لیکن اگر ہم محض ان کی صحافتی زندگی سامنے رکھیں تو بھی اس کی بوقلمونی اور بوالعجبی ایسی نہیں کہ اس سے سرسری گزر جایا جائے۔ کیونکہ یہی ایک ایسا ذریعہ ہے جس سے ہم نے ابوالکلام کو پہچانا اور اگر زمانہ مساعدت کرتا اور ان کے صحافتی مشاغل جاری رہتے تو ہم نہیں کہہ سکتے کہ ان کے اور کون کون سے قواء کا منہ بروئے کار آتے اور آج کتنا بڑا ذخیرہ علم وادب کا ہمارے سامنے موجود ہوتا۔

مولانا کی فطری اہلیت وصلاحیت قدرت کا ایک سربند راز تھی جس کے بعض گوشے تو ہمارے سامنے آگئے اور اکثر بے نقاب نہ ہوسکے۔ اس کا ایک سبب تو زمانہ کے حالات تھے جنھوں نے ان کو اپنے ذوق کی پوری وسعت سے کام لینے کا موقع نہ دیا اور دوسرا سبب

مولانا کے فضل و کمال کا تنوع، ان کے مطالعہ کی وسعت، ان کا پاکیزہ جمالیاتی ذوق اور ایک خاص قسم کا عالمانہ رکھ رکھاؤ۔ ان سب کا اتنا دل کش امتزاج ان کے اندر پایا جاتا تھا کہ ہم ان میں سے کسی ایک کو دوسرے سے جدا کر ہی نہیں سکتے۔ گویا وہ ایک ایسا کل تھے جس کا کوئی جزو اس سے علٰحدہ نہیں کیا جا سکتا۔

ہمارے سامنے اگر مختلف رنگ کے پھول علٰحدہ علٰحدہ رکھ دئے جائیں تو ہم ان کے رنگ و نکہت پر علٰحدہ علٰحدہ اظہار خیال کر سکتے ہیں۔ لیکن اگر ان کا گلدستہ بنا کر سامنے لایا جائے تو ہم اسے گلدستہ ہی کی حیثیت سے دیکھیں گے اور امتیاز رنگ و نکہت کا کوئی سوال ہمارے سامنے نہ ہوگا۔ بالکل یہی حال مولانا کے ذہنی اکتسابات کے تعدد و تنوع کا تھا کہ ہم ان کو ایک دوسرے سے علٰحدہ کر ہی نہیں سکتے، خواہ وہ شعر و ادب سے متعلق ہوں، خواہ مذہب و حکمت سے وابستہ ہوں، خواہ صحافت و سیاست سے!

یہ بات کم لوگوں کو معلوم ہوگی کہ مولانا کی جو خصوصیات دنیا پر ظاہر ہو سکیں وہ ان سے بہت کم تھیں جو چھپی ہوئی رہ گئیں۔ حالاں کہ وہ بہت زیادہ وزنی و گراں قدر تھیں۔ ہم نے مولانا کو اتنا ہی جانا جتنا وہ چاہتے تھے کہ ہم جانیں اور ان کی ہستی کے بہت سے امکانات دنیا پر ظاہر نہ ہو سکے۔

وہ امکانات کیا تھے ان کی تعیین و صراحت آسان نہیں، تاہم جس حد تک میرے ذاتی ربط و مطالعہ کا تعلق ہے میں کہہ سکتا ہوں کہ اگر ان کی زندگی ایک خاص سانچے میں ڈھل کر وہ نہ ہو جاتی جو ہمارے سامنے آئی تو وہ خدا جانے کیا کیا ہو سکتے تھے۔ وہ اگر عربی شاعری کی طرف توجہ کرتے تو متنبی و بدیع الزماں ہوتے۔ اگر وہ محض دینی و مذہبی اصلاح اپنا شعار بنا لیتے تو اس عہد کے ابن تیمیہ ہوتے۔ اگر محض علوم حکمیہ کے لئے اپنے آپ کو وقف کر دیتے تو ابن رشد اور ابن طفیل سے کم درجے کے متکلم و فیلسوف نہ ہوتے۔ اگر وہ فارسی شعر و ادب کی طرف متوجہ ہوتے تو عرفی و نظیری کی صف میں انھیں جگہ ملتی۔ اگر وہ تصوف و اصلاح اخلاق کی طرف مائل ہوتے تو غزالی اور رومی سے کم نہ ہوتے اور اگر وہ مسلک اعتزال اختیار کرتے تو دوسرے واصل بن عطا ہوتے

مولانا کو ندوہ واپس ندوہ سے بے زار کر دیا۔ علاوہ اس کے وہ یوں بھی اپنی موجودہ خدمت سے خوش نہ تھے کیونکہ الندوہ ایک خاص تعلیمی ادارہ کا آرگن تھا۔ مولویوں کا پرچہ تھا جن کی باہمی سازشوں سے وہ تنگ آ چکے تھے اس لئے انھوں نے اس خدمت سے ہاتھ اٹھالیا تاہم اس دور ناخوش گوار میں بھی انھوں نے الندوہ کو جس بلندی تک پہنچا دیا وہ الندوہ کا دور زریں کہا جاتا ہے۔

یہی وہ زمانہ تھا جب مولانا کی خطیبانہ شہرت بھی ملک میں عام ہوتی جا رہی تھی اور ان کے اندر زیادہ آزادی، زیادہ بلند حوصلگی کے ساتھ کام کرنے کا ولولہ تیزی سے ابھر رہا تھا۔ چناں چہ آپ کلکتہ واپس گئے اور وہاں سے 'الہلال' جاری کیا جس کی خصوصیات سے آج ہر شخص واقف ہے۔

'الہلال' کے اجراء سے قبل مولانا کی صحافت زیادہ تر علم و مذہب تک محدود تھی اور بہت گھٹی گھٹی سی تھی۔ لیکن اس کے بعد جب وہ صحیح طور پر میدانِ صحافت میں آئے تو اس شان سے کہ افقِ صحافت پر ایک نیا آفتاب طلوع ہو رہا تھا اور ایک نئی گرمی ہمارے دلوں میں پیدا ہو رہی تھی۔

مولانا کا رجحان سیاست کی طرف کب اور کیوں کر ہوا اس کی صحیح تاریخ متعین کرنا مشکل ہے لیکن ہم سمجھتے ہیں کہ اس کی ابتداء اسی وقت ہوئی جب مصر کے جامعۂ ازہر میں انھیں جمال الدین افغانی اور محمد عبدہ کی تحریکِ آزادی کے لٹریچر کے مطالعہ کا موقع ملا۔ اس کے بعد جب وہ ہندوستان واپس آئے تو یہ چنگاری اپنے سینہ میں لے کر آئے اور پھر رفتہ رفتہ اس کی حدت و تیزی بڑھتی گئی اور آخر کار شعلۂ جوالہ بن کر 'الہلال' کی صورت میں ہمارے سامنے آئی۔

جس وقت 'الہلال' جاری ہوا ہے اس وقت ہندوستان ذہنی اضطراب کے بڑے نازک دور سے گزر رہا تھا اور روئے زمین کی دوسری قوموں میں بھی سخت انتشار پیدا تھا۔ ملوکیت کہیں دم توڑ چکی تھی اور کہیں سنبھالا لے رہی تھی۔ امتراطیت و استعماریت اپنے بقا و تحفظ

ان کی فطری خلوت پسندی و کم آمیزی تھی۔ وہ نام نمود اور شہرت سے گریز کرتے تھے اور بر بنائے متانت و خودداری وہ بے تکلفی میں بھی وہ اپنی "شانِ گرانمایگی" ہات سے نہ جانے دیتے

مولانا کے دورِ صحافت کی تاریخی تعیین دشوار ہے۔ کیونکہ ہم سمجھ نہیں سکتے کہ اس کا آغاز کب سے سمجھا جائے۔ مولانا کی علمی و صحافتی زندگی کے سلسلے میں رسالہ مخزن، اخبار وکیل اور الندوہ کا بھی ذکر کیا جاتا ہے۔ لیکن ہم سمجھتے ہیں کہ اس کی ابتداء لسان الصدق کے اجراء سے ہوتی ہے جسے انھوں نے خود جاری کیا، خود مرتب کیا اور خود ہی بند کر دیا جس کا سبب غالباً یہ تھا کہ جس فضا و ماحول میں رہ کر اسے جاری کیا گیا تھا وہ مولانا کے لئے بہت تنگ تھی اور بہت سی ایسی باتیں جنھیں وہ زیادہ کھل کر کہنا چاہتے تھے نہ کہہ سکتے تھے۔ یہ زمانہ مولانا کی بہت کم سنی کا تھا۔ اتنی کم سنی کا کہ اس عمر میں لوگ اپنی تعلیم بھی ختم نہیں کر چکتے۔ کسی صحافیانہ قدم اُٹھانے کا کیا ذکر ہے لیکن مولانا کی غیر معمولی ذہانت اور فضل از وقت پختگیٔ ذہن و دماغ نے ان کے مستقبل کو بھی حال میں تبدیل کر دیا تھا اور لوگ اس مستقبل کی درخشانی کو دیکھ کر حیران تھے۔

اس کے بعد جب مولانا شبلی کے اصرار پر الندوہ کی ادارت اپنے ہاتھ میں لی تو فضا دوسری تھی، ماحول کچھ اور تھا۔ معاملہ عوام کا نہیں خواص کا تھا اور خواص بھی جماعت علماء کا۔ لیکن مولانا نے اپنی انفرادیت کا اعتراف کرائے بغیر ان کو بھی نہ چھوڑا۔

علامہ رشید رضا اڈیٹر "المنار" ایک عظیم الشان اجتماع میں جو بڑے بڑے علماء پر مشتمل تھا تقریر کرنے جارہے ہیں اور ضرورت ہے ایک ایسے شخص کی جو عربی و اردو دونوں کا ماہر ہو اور ان کی عربی تقریر برمحل ترجمہ کرتا جائے۔ مولانا شبلی کے منصب سے یہ بات فروتر تھی کہ وہ خود اس خدمت کو انجام دیں اس لئے وہ اس باب میں بہت متفکر تھے۔ آخر جزء قیس کوئی اور نہ آیا پردۂ کار" مولانا ابوالکلام بے تکلفانہ سامنے آجاتے ہیں اور اس خدمت کو اتنی خوبی و دلکشی سے انجام دیتے ہیں کہ معلوم ہوتا ہے وہ ترجمہ نہیں بلکہ خود تقریر کر رہے ہیں۔

یہ تھا مولانا کی ذہانت و قابلیت کا پہلا عملی مظاہرہ جسے کھلے اسٹیج پر سینکڑوں مدعیانِ فضل و کمال نے دیکھا اور اسی وقت سے وہ حاسدانہ ریشہ دوانیاں شروع ہو گئیں جنھوں نے

چاہیئے تھی لیکن یہ کہنا غلط ہوگا کہ وہ علی گڑھ یا مسلم لیگ کا آرگن تھا تاہم اس میں کلام نہیں کہ وہ مسلمانوں کا جماعتی اخبار تھا اور سیاست میں اس کا نقطۂ نظر ملت پرستی ہو تو ہو لیکن خالص وطن پرستی یقیناً نہ تھا۔ وہ آزادی کا محرک و معاون ضرور تھا لیکن انھیں خطوط پر جو مسلم لیگ کے پیشِ نظر تھے۔ وہ انگریزوں سے خوش نہیں تھا لیکن اس کی یہ بھی نہ جارحانہ تھی نہ حریفانہ بلکہ اس کا انداز ایک ایسے دوست کا سا تھا جو روٹھتا ہے صرف منائے جانے کی توقع پر۔

یہ تھا وہ ماحول، یہ تھے وہ حالات، یہ تھی مسلمانوں کی عام ذہنیت جب مولانا آزاد نے الہلال جاری کیا اور اس شان کے ساتھ کہ صحافت کا تمام اگلا پچھلا تصوّر ہمارے ذہن سے محو ہو گیا اور ہم سوچنے لگے کیا یہ آواز ہماری ہی دنیا کے کسی انسان کی ہے۔ کیا یہ زبان ہمارے ہی ابنائے جنس میں سے کسی فرد کی زبان ہے۔

ڈاکٹر طٰہٰ حسین نے اپنی مشہور کتاب "الفتنۃ الکبریٰ" میں صدرِ اسلام کی حکومت پر بحث کرتے ہوئے ایک جگہ لکھا ہے کہ وہ ملوکیت تو یقیناً نہ تھی کیونکہ شخصی استبداد کا اس میں مطلقاً گذر نہ تھا۔ ہم اسے ارستقراطیت بھی نہیں کہہ سکتے۔ کیونکہ ارستقراطیت یا جماعت اشراف کی کوئی حکومت دنیا میں ایسی نظر نہیں آتی جس نے سماجی مساوات اور عدل و انصاف کی اتنی سخت پابندی کی ہو جتنی اسلامی حکومت کے ابتدائی دور میں کی گئی۔ ہم اسے ڈیماکریسی یا جمہوریت بھی نہیں کہہ سکتے۔ کیونکہ خلفاء اسلام کا انتخاب جمہور کی رائے سے نہ ہوتا تھا۔ ہم اسے اشتراکیت یا اشتمالیت بھی نہیں کہہ سکتے۔ کیونکہ اس نے شخصی و انفرادی رائے کی آزادی کو نہیں چھینا۔ اس لئے ہم یہی کہہ سکتے ہیں کہ ابتداء عہدِ اسلام کی حکومت خالص عربی اسلامی حکومت تھی جو خود مسلمانوں ہی نے وضع کی اور جس کی نوعیت حکومت کی تمام دوسری حکومتوں سے بالکل علیحدہ تھی۔

میں جس وقت مولانا ابوالکلام کی صحافت پر غور کرتا ہوں تو میں بھی کچھ ایسا ہی محسوس کرتا ہوں کہ وہ مغربی انداز کی صحافت تو یقیناً نہ تھی کیونکہ اس میں شانِ خطابت قطعاً نہیں ہوتی مشرق میں البتہ بعض عربی رسائل و اخبارات کا لب و لہجہ خطیبانہ ہوتا ہے لیکن ان میں وہ

کے لئے ناخن وچنگال کی پوری قوت صرف کر رہی تھی۔ ڈماکریسی کی مدعی حکومتوں کے چہرے بے نقاب ہوئے جا رہے تھے اور قومی آزادی وخودداری کا احساس بڑے آزمائشی دور سے گزر رہا تھا۔ برطانوی مستعمرات کا طنطنہ ختم تو نہ ہوا تھا لیکن اس سورج کو گہن لگنا ضرور شروع ہوگیا تھا اور وہ اپنے بقاء وتحفظ کے لئے آستینیں چڑھائے ہوئے ہر انسانیت شکن اقدام پر آمادہ تھا۔ ہندوستان میں کانگریس آزادی کا بیج بو چکی تھی اس کے کلّے پھوٹ چکے تھے لیکن انگریز یہ طے کر چکا تھا کہ وہ اس پودے کو کبھی بار آور نہ ہونے دے گا اور جماعتی تفریق پیدا کر کے ملک کی ذہنیت کو دو متضاد حصوں میں تقسیم کر دینا چاہتا تھا۔ مسلم لیگ وجود میں آچکی تھی لیکن مسلمانوں کی ذہنی رفتار ہندوؤں سے مختلف تھی۔ ان کے سامنے ملکی مسائل ثانوی حیثیت رکھتے تھے۔ ان کی نگاہیں ترکی، بلقان وطرابلس پر لگی ہوئی تھیں اور سرسید کی تعلیمات نے جو وقار انگریزوں کا مسلمان کے دل میں پیدا کر دیا تھا وہ بڑی حد تک اپنی جگہ پر قائم تھا۔ ہرچند مسلمانوں میں ایک ایسی جماعت بھی تھی جو انگریزوں سے منحرف ہو چلی تھی لیکن یہ انحراف واختلاف داخلی نہ تھا خارجی تھا، فاعلی نہ تھا انفعالی تھا۔ وطن سے اس کا تعلق نہ تھا بلکہ مذہب ومذہبیت سے تھا۔ ملکی سیاست سے نہیں بلکہ ترکی کے انقلاب، بلقان وطرابلس کی تباہیوں اور مذہبی لامرکزیت کے احساس سے تھا۔ اس لئے ٹھیک اسی وقت جب کہ کانگریس اجتماعی تحریک آزادی کی بنیادیں استوار کر رہی تھی مسلمان چند نفوس کو چھوڑ کر سب کے سب بیرونِ ہند کے مسائل میں اُلجھے ہوئے تھے جن کا تعلق زیادہ پان اسلامزم کی تحریک سے تھا۔

اس وقت ہندوستان میں مسلمانوں کے دو قابلِ ذکر اخبار جاری تھے۔ ایک زمیندار دوسرا مسلم گزٹ۔ زمیندار کی توجہ تمام ترترکی پر مرکوز تھی اور اس کا عظیم ترین مقصد شہدائے بلقان کے پس ماندگان کے لئے چندہ جمع کرنا تھا۔ اندرونِ ملک کے معاملات اور یہاں کی داخلی سیاست سے اسے بہت کم دلچسپی تھی۔ مسلم گزٹ کے اڈیٹر مولانا وحیدالدین سلیم مولانا حالی کے عزیزوں میں تھے اور قدرتاً انھیں سرسید تحریک سے دلچسپی ہونا

جتیدا حمقانی نقوش مٹانے کی کوشش کی کیونکہ وہ جانتے تھے ہندوستان اس وقت تک آزاد نہیں ہوسکتا جب تک یہاں کی تمام آبادی بلا امتیازِ ملت و مذہب، بلا امتیازِ نسل و رنگ کسی ایک غرضِ مشترک پر متحد و متفق نہ ہو جائے اور یہ اشتراکِ ذہن و عمل ممکن نہ تھا جب تک مسلمان ہندوؤں سے کٹ کر اپنے جداگانہ مستقبل کی تعمیر کا خیال ترک نہ کر دیں اور اس راہ میں سب سے زیادہ پچھڑی ذہنیت تھی جس نے مسلمانوں کو انگریزوں کے رحم و کرم پہ جینا سکھایا اور جو باوجود تلخ تجربات کے اب تک اپنے جذباتِ نیازمندی ہی کو حصولِ مقصود کا صحیح ذریعہ سمجھتے تھے۔

پھر آپ الہلال کے دورِ اوّل کے پرچے اٹھا کر دیکھئے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ مولانا نے کس کس پہلو اور کن کن زاویوں سے اس ذہنیت کو توڑنا چاہا اور وہ کس حد تک اس میں کامیاب ہوئے۔ جیسا کہ میں ابھی ظاہر کر چکا ہوں، یہ زمانہ بڑی آپا دھاپی کا زمانہ تھا، سخت ذہنی خلجان کا دور تھا اور مولانا کے لئے ممکن نہ تھا کہ وہ ان غیر ملکی مسائل کو نظر انداز کر دیتے جن سے براہِ راست یا بالواسطہ مسلمانوں کے اذہان متاثر ہو رہے تھے۔ چناں چہ آپ دیکھیں گے کہ اصل مقصد کی تبلیغ کے ساتھ ساتھ انھوں نے طرابلس و بلقان کے مسائل پر بھی مجاہدانہ گفتگو کی؛ ترکی کی اندرونی کشاکش اور اس کے خونچکاں انقلابات پر بھی واضح روشنی ڈالی اور جب مسجد کان پور کا حادثہ پیش آیا تو اس پر بھی اپنے قلم کی پوری قوت صرف کر دی۔ پھر یہ سب کچھ اس لئے نہ تھا کہ وہ مسلمان تھے اور ان مسائل کا تعلق اسلام و اسلامیات سے تھا بلکہ اس سے مقصود صرف یہ ظاہر کرنا تھا کہ جب کسی قوم پر بیرونی قوتیں مسلط ہو جاتی ہیں تو اس قوم کا کیا حشر ہوتا ہے اور اسے کتنے ذہنی و جسمانی دکھ جھیلنا پڑتے ہیں۔

مولانا کے سامنے ہی کانگریس نے اپنا کام شروع کر دیا تھا اور وہ اس کے عزائم و اقدامات سے بے خبر نہ تھے۔ اسی طرح وہ مسلم لیگ اور اس کے نصب العین سے بھی واقف تھے اور چاہتے تھے کہ یہ دونوں ادارے کسی طرح ایک ادارہ میں تبدیل ہو جائیں اور مسلم لیگ بھی کانگریس کے اصول پر اپنا لائحہ عمل مرتب کرے۔ چناں چہ الہلال کا ادبین دور اسی سعی و کوشش

تنوع نہیں پایا جاتا جو الہلال میں نظر آتا ہے۔ خود ہندوستان میں البتہ نہ میندار ایک بلند پایہ اخبار تھا لیکن اس میں الہلال کی سی گہرائی، سنجیدگی اور علمی وزن کا فقدان تھا۔ مسلم گزٹ کے لب و لہجہ میں بے شک ایک تفصیت تھی لیکن اس کا خطاب صرف عوام سے تھا عوام ہی کی زبان میں۔ اور کوئی دوسری خصوصیت اس میں نہیں پائی جاتی تھی۔ اس لئے مولانا آزاد کی صحافت کے متعلق بھی ڈاکٹر طٰہٰ حسین کی زبان میں یہی کہہ سکتا ہوں کہ ان کی صحافت خود ان کی اپنی صحافت تھی جسے خود انھوں نے ایجاد کیا اور جو انھیں کے ساتھ ختم ہو گئی۔

مولانا نے الہلال بہت سوچ سمجھ کر جاری کیا تھا اور ملک کے حالات کے نہایت غائر مطالعہ کا نتیجہ تھا۔ وہ یہ فیصلہ تو الہلال کے اجراء سے قبل ہی کر چکے تھے کہ ملک کو آزاد ہونا چاہیئے اور فرنگی تسلط کو ختم۔ لیکن اس کے ساتھ وہ اس حقیقت سے بھی بے خبر نہ تھے کہ اس فیصلہ پر عمل کرنا بچوں کا کھیل نہیں اور یہ وہ راہ ہے جس میں "شرط اول قدم آن ست کہ مجنوں باشی"
وہ اچھی طرح جانتے تھے کہ جب تک ملک میں اجتماعی حیثیت سے ایک عام مشترک جذبۂ وطنیت پیدا کر کے مذہب و ملت کے اختلاف کو نہ مٹایا جائے حصول مقصود ممکن نہیں ملک کی آیندہ سیاست کا جو نقشہ ان کے سامنے تھا اس کا تقاضہ یہ تھا کہ تعمیر سے پہلے عمل تخریب سے کام لیا جائے۔ کیونکہ مولانا کا نظریہ یہ تھا کہ جب کوئی ڈھانچہ اتنا بگڑ جائے کہ اس کی اصلاح و مرمت ممکن نہ ہو تو ضرورت اس امر کی ہے کہ پہلے اس ڈھانچہ کو توڑا جائے اور پھر از سر نو تعمیر کی جائے۔ وہ پرانے مٹے ہوئے نقوش اور کج مج خطوط پر تعمیر کے قائل نہ تھے بلکہ وہ ان کو مٹا کر نئی داغ بیل پر عمارت قائم کرنے کے قائل تھے۔ وہ سمجھتے تھے کہ جب ذہن انسانی رسوم و روایات سے اس حد تک داغدار ہو جائے کہ اس کی اصلاح ممکن نہ ہو تو بہتر صورت یہی ہے کہ پہلے اس کے پرانے نقوش کو مٹایا جائے اور ذہن و دماغ کو صفحۂ سادہ بنا کر اس پر دوسرے نقوش قائم کئے جائیں۔

یہی وہ اصول کار تھا جس کے پیش نظر انھوں نے سب سے پہلے مسلمانوں کے ذہن سے

ان کی قوتِ حافظہ و استدلال کو دیکھ کر دنگ نہ رہ گیا ہوں۔

ایک بار حکماء اسلام کے سلسلہ میں ابنِ طفیل کا ذکر آ گیا تو مولانا نے اس کی مشہور کتاب " حیّ بن یقظان " کی پوری داستان ایک نشست میں اس طرح سنادی گویا وہ اس کے حافظ تھے۔ ایک دوسری صحبت میں جو سیاست سے شروع ہوئی اور ادب پر ختم ہوئی اس سے زیادہ دل چسپ تھی۔ انسان کے فطری احساسِ آزادی اور ضمیرِ انسانی کی بے اختیار پکار کے سلسلے میں میں نے کہا کہ اس کے مظاہر انتہائی متضاد ماحول میں کبھی کبھی سامنے آجاتے ہیں۔ عُرفی مدحیہ قصیدہ لکھتا ہے اور جب وہ ذہنِ انسانی کا تجزیہ قسمیہ اشعار کے ذریعے سے کرتا ہے تو ایک شعر بے اختیار اس کے قلم سے ایسا بھی نکل جاتا ہے جسے عہدِ حاضر کی اشتراکیت پسندی اور سرمایہ و عمل کے تصادم کی بنیاد کہنا چاہیئے۔ کہتا ہے ؎

بزورِ بازوئے نُفعِ کاسبانِ ضعیف   بہ چینِ ابروئے وجہہِ خواجگانِ کبار

حیرت ہے کہ مغلیہ دَورِ ملوکیت واستبداد میں یہ خیال عرفی کے ذہن میں آئے۔ یہ سن کر مولانا کے چہرہ پر ایک رنگ آ گیا اور وہ اس موضوع پر کچھ کہنے ہی والے تھے کہ ناگہاں ایک صاحب اور آ گئے اور مولانا نے گفتگو کا سیاسی پہلو بدل کر اسے ادبی رنگ میں تبدیل کر دیا اور فرمایا کہ اس میں شک نہیں عرفی کا یہ قصیدہ اس کا شاہکار ہے اور اس کے تمام قسمیہ اشعار اس طرح سُنانا شروع کئے گویا کتاب ان کے سامنے کُھلی رکھی تھی۔

مولانا کا حافظہ اس میں شک نہیں عجیب وغریب خداداد ودلیت تھی اور مولانا کی صحافتی و علمی زندگی کی کامیابی بہت کچھ اسی انعامِ خداوندی کی ممنون تھی۔ اسی کے ساتھ دوسری خصوصیت جس نے الہلال کو معراجِ کمال تک پہنچایا وہ مولانا کا مخصوص اسلوبِ تحریر تھا۔ بہت کم ایسا دیکھا گیا ہے کہ ایک شخص تحریر وتقریر دونوں پر یکساں قدرت رکھتا ہو لیکن وہ اس باب میں " ذوالریاستین " ہونے کی حیثیت رکھتے تھے۔

مولانا کے اسلوبِ تحریر وتقریر کی دو خصوصیتیں ایسی تھیں جو کبھی ان سے منفک نہیں ہوئیں۔ ایک اس کی بلند ادبیت، دوسری اس کی شانِ خطابت۔ کہ جب ہم الہلال کو

کا دور تھا کیونکہ ان کی انتہائی خواہش یہ تھی کہ وہ کانگریس میں تنہا شریک نہ ہوں بلکہ اپنی ساری قوم کو ساتھ لے کر شریک ہوں لیکن وہ اس میں خاطر خواہ کامیاب نہ ہو سکے اور مجبوراً انھیں تنہا کانگریس میں شامل ہونا پڑا۔

مولانا ابناء ملک اور بالخصوص مسلمانوں کے ذہن تک جن جن راہوں سے پہنچنا چاہتے تھے ان میں سب سے زیادہ واضح اور روشن راہ مذہب کی تھی۔ چنانچہ آپ الہلال کا فائل اُٹھا کر دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ دنیاوی سیاست کی تعلیم کے سلسلے میں ذہنی و اخلاقی اصلاح کا کوئی پہلو ایسا نہ تھا جس کی تائید میں انھوں نے قرآنی دلائل پیش نہ کئے ہوں اور مسلمانوں کی ہدایت کے لئے احکامِ الٰہی کی حجت سے کام نہ لیا ہو۔

دوسری راہ جو مسلمانوں کے کلچر اور فطری ذوق کے لحاظ سے ان کے لئے قابلِ قبول ہو سکتی تھی ادب وانشا کی راہ تھی۔ سو اس باب میں بھی الہلال کی یہ خصوصیت کبھی فراموش نہیں کی جا سکتی کہ اس نے اتنا بڑا ذخیرہ شعر وادب کا فراہم کر دیا کہ اگر آج تمام مشہور شعراء فارسی کا کلام دنیا سے محو ہو جائے تو بھی اس کا ایک بڑا ستھرا انتخاب آپ الہلال کی مدد سے پیش کر سکتے ہیں۔

مولانا کی صحافتی عظمت کا تعلق کسی ایک چیز سے نہ تھا بلکہ اس کی تشکیل متعدد عناصر سے ہوئی تھی جن میں ایک بڑا زبردست عنصر ان کی غیر معمولی قوتِ حافظہ تھی۔

غالباً ۱۹۱۵ء کی بات ہے کہ انھوں نے مجھے کلکتہ سے دہلی جاتے ہوئے تار دیا کہ میں ان سے دہلی میں ملوں۔ وہ حاذق الملک حکیم اجمل خاں کے صاحبزادہ جمیل میاں کی تقریب شادی میں شرکت کی غرض سے دہلی آ رہے تھے۔ یوں تو باہمی مراسلت اور میری نظموں کے ذریعہ سے جو الہلال میں شائع ہوتی رہتی تھیں میں مولانا سے غیر متعارف نہ تھا لیکن ذاتی ملاقات کا موقع نصیب نہ ہوا تھا۔ میں اس فرصت کو غنیمت سمجھ کر فتح پور سے دہلی پہنچا اور کامل ایک ہفتہ تک ان کی معیت کی سعادت مجھے نصیب ہوئی۔ اس دوران میں ادب، مذہب و سیاست سے متعلق کوئی موضوع ایسا نہ تھا جس پر مولانا سے تبادلہ خیال کا موقع مجھے نہ ملا ہو اور میں

البلاغ نے اس چاک سے نظارۂ پرتو ماہ کی دعوت دی۔

الہلال مولانا کی تمام خصوصیات ذہنی کا ایک ایسا رنگین دستۂ گل تھا جو بیک وقت اخبار بھی تھا اور قرنِ اوّل کا میگزین بھی، جس میں سیاسی مقالات، علمی و تاریخی مضامین، مذہبی و ادبی مباحث، مطائبات، منظومات الغرض وہ سب کچھ پایا جاتا تھا جس سے ہر ذوقِ انسانی آسودہ ہو سکتا ہے اور جو اپنے بعد ایسا خلا چھوڑ گیا جس کا پُر ہونا ممکن نہیں۔ اور البلاغ ایک مذہبی تبلیغی آرگن تھا جس کا خطاب زیادہ تر مسلمانوں سے تھا تاکہ ان کے ذہن و دماغ سے رسم و روایات کے نقوش محو کرکے ان کو صحیح تعلیم قرآنی سے آشنا کیا جائے اور وہ سمجھ سکیں کہ اسلام کا حقیقی مقصود انسانیت پرستی کے سوا کچھ نہیں اور جو ماوراء دیر و حرم ہر جا کنیم بلند آستانِ ما کا پیغام ہے۔

اس طرح ہم مولانا کے زمانِ صحافت کو تین ادوار میں تقسیم کر سکتے ہیں، ایک وہ جو مخزن، اخبار وکیل اور لسان الصدق سے تعلق رکھتا ہے۔ دوسرا دور الہلال کا اور تیسرا البلاغ کا۔ دورِ اوّل خالص علمی تھا۔ دوسرا سیاسی اور تیسرا مذہبی و اصلاحی اور ان تینوں زمانوں میں انھوں نے جو کچھ لکھا وہ ان کی انفرادیت و "انانیت" کا بڑا زبردست مظاہرہ تھا۔ میں نے "انانیت" کا لفظ قصداً استعمال کیا ہے کیونکہ ان تحریروں میں جو خود اعتمادی و کیفیتِ ایقان پائی جاتی تھی وہ صرف لفظ "انانیت" ہی سے ظاہر ہو سکتی ہے۔ جس میں منطقی چون و چرا اور استدلالی "این و آں" کی کوئی گنجائش نہیں۔

مولانا کے دینی و علمی مقالات کا فاضلانہ لب و لہجہ، سیاسی مضامین کا مجاہدانہ و فقیہانہ انداز، مذہبی افکار کا حکیمانہ اسلوب اور اسی کے ساتھ ان کی خطیبانہ بلند آہنگی عسکرانہ رجز خوانی، مردِ مجاہد کا سا اذعان و ایقان، کاہنوں کا سا وزن و وقار جس نے ہم کو نیا ولولۂ حیات، نیا جوشِ زندگی بخشا، اب کہاں؟

اک دھوپ تھی کہ ساتھ گئی آفتاب کے

پڑھتے ہیں تو ایسا محسوس کرتے ہیں کہ کوئی شخص کسی بلند منارہ پہ کھڑا ہو کر پُرجوش خطبہ دے رہا ہے اور ایک بے پناہ ذخیرۂ الفاظ کا اس کے پاس ہے جسے وہ موتیوں کی طرح بکھیرتا جا رہا ہے۔ اس میں شک نہیں مولانا ایک ایسی عجیب و غریب طرزِ تحریر کے موجد و مخترع تھے کہ نہ اس سے قبل اس کی کوئی مثال دیکھنے میں آئی اور نہ اس کے بعد کوئی شخص اس کی تقلید کی جرأت کر سکا۔

الہلال کے بعد جب مولانا نے البلاغ جاری کیا تو اس کا نصب العین بھی وہی تھا جو الہلال کا، لیکن طریقِ ابلاغ کچھ مختلف تھا۔ نغمہ وہی تھے لیکن لَے دوسری تھی۔ انداز قدرے وہی تھا مگر لباس بدلا ہوا تھا۔ الہلال نفسیاتِ عملی کا درس تھی اور البلاغ نفسیاتِ ذہنی کا۔ الہلال حرکت و عمل، جوش و ولولہ کا پیام رساں تھا اور البلاغ فکر، بصیرت اور روحانی عزم و ثبات کا۔ الہلال کا پیام تھا:

"شیر شو، شیرانہ در صحرائے شیراں پائے نہ"

اور البلاغ کا: "جلوہ بر خود کن و خود را بہ تماشا دریاب"

الہلال خونِ منصور کی شعلہ آہنگی تھی اور دعوتِ دار و رسن۔ البلاغ بشارتِ روحانی تھی اور پیامِ طاغوتیت شکن۔

الہلال۔ عرفی کی زبان میں نویدِ سرفروشی تھا کہ

برو پیالۂ خونیں مخور ز قصابان ۔۔۔ مشو گدائے شبانان کہ شیر می دوشند

اور البلاغ: بیدل کی زبان میں پیام تھا۔ "خونے بہ جگر جمع کن و برِ دل آ" کا

الہلال ایک کھلا ہوا چیلنج تھا، ایک بے باکانہ اعلان کہ

نازک دلانِ باغ تو چوں شبنم سحر ۔۔۔ بر روئے برگِ گل شکنند آبگینہ ہا

اور البلاغ نہایت بلیغ درس تھا اس حقیقت کا کہ

دلِ گم گشتہ سراغے ست ز کیفیتِ شوق ۔۔۔ نشۂ بالد اگر از دست رود شیشۂ ما

بات وہی ایک تھی لیکن فرق صرف اتنا تھا کہ الہلال نے دامنِ کتاں چاک کیا اور

فلسفے کی روح گھل کر جانِ میخانہ بنی — شوخیٔ تحریر سے تاریخ افسانہ بنی

خامشی محفل میں کیف و کم کا پیمانہ بنی — سینہ چاکی گیسوئے الہام کا شانہ بنی

ایک بے تابی حرم سے تا بہ بتخانہ ہے آج

سوزِ دل تیرا متاعِ شمع و پروانہ ہے آج

مرحبا اے ساقیٔ کیف و نشاطِ حریت — ذہنِ مستقبل میں تجھ سے انبساطِ حریت

مرحبا اے مجلس آرائے بساطِ حریت — کس قدر باریک و نازک تھی صراطِ حریت

پائے ہمت کو ترے دی اک خلش ہر خار نے

چن لئے کانٹے بیاباں سے تری رفتار نے

آستانوں سے اُٹھائی تو نے تہذیبِ سجود — سربلندوں کو سکھائی تو نے تعظیمِ حدود

کیوں مورخ پر نہ گم ہوں تیری آیاتِ نمود — تو نے خود مقصد پہ قرباں کر دیا حبِّ نمود

روشنی کیونکر پہنچتی امرکہ میں روس میں

شمع تو جلتی رہی تا زندگی فانوس میں

وقت کو تو نے دیا اک شوخ آہنگِ خرام — جوش کو سنجیدگی، جذبات کو اک انتظام

ہند کو روحِ عمل اردو کو اک زورِ کلام — راکھ کو چنگاریاں شعلے کو ایک رقصِ دوام

سوز کو اک نغمگی دی ساز کو نغمہ دیا

اب بھی کیا تاریخ پوچھے گی کہ تو نے کیا دیا

جمیل مظہری

ماتمِ آزاد

آہ اے آزاد، اے بھارت کے لعلِ شب چراغ
آہ اے آزاد، اے قومی سیاست کے دماغ

لہلہایا تیرے خونِ دل سے آزادی کا باغ
تجھ کو تربت میں مبارک آج لمحاتِ فراغ

کارواں جائے کدھر اب رہبری کے واسطے
ذہن بھٹکے پھر رہے ہیں روشنی کے واسطے

ہند کی تاریخ کا تو مستقل اک باب تھا
کچھ دنوں تک سب نے دیکھا کہ وہ خواب تھا

سینۂ ہندوستاں کا شعلۂ شاداب تھا
زینتِ کرسی و زیبِ منبر و محراب تھا

کیوں نہ تجھ کو اک چمن، اک بزمِ رندانہ کہیں
اک ادارہ اک دبستاں اک کتب خانہ کہیں

تیرا ہر نقشِ ادب اک نقشِ پائے اعتبار
سرمۂ چشمِ بصیرت تیری خاطر کا غبار

تیرا آہنگِ خطابت جوششِ قلزم در کنار
کچھ سمندر کا جلال اور کچھ پہاڑوں کا وقار

نبضِ ملت میں دہک تیرے لبِ گفتار سے
دھڑکنیں دل کی معین وقت کی رفتار سے

محمد اجمل خاں

مولانا آزاد کے نام کچھ خط اور اُن کے جواب

اگست ۱۹۴۲ء میں مولانا آزاد کو پوری ورکنگ کمیٹی کے ساتھ گرفتار کر کے راتوں رات ہندوستان میں کسی جگہ بھیج دیا گیا۔ عام افواہ یہ تھی کہ ہندوستان سے باہر کہیں بھیجے گئے ہیں بعد میں پتہ چلا کہ یہ احمد نگر کا قلعہ ہے۔ آل انڈیا کانگرس کمیٹی نے "ہندوستان چھوڑ دو" والا رزولیوشن پاس کر دیا تھا۔ کانگرس سے یہ امید نہ رہی تھی کہ وہ برٹش جنگ کو بلا شرط اپنی جنگ سمجھے۔

میں اور بھابھی (یعنی مسز اروناآصف علی) بھی کسی نہ کسی طرح اسٹیشن کے اندر داخل ہو گئے تھے۔ مولانا نہایت خندہ پیشانی سے اپنے ورکنگ کمیٹی کے ساتھیوں کا استقبال کر رہے تھے، اس لئے کہ وہ بہ حیثیت صدر کانگرس کے سب سے پہلے گرفتار کئے گئے تھے اور چونکہ بھولا بھائی ڈیسائی ورکنگ کمیٹی سے استعفیٰ دے چکے تھے اس لئے وہ گھر ہی پر رہ گئے۔ مولانا نے فرمایا کہ بھئی یہاں کہیں چائے بھی ملے گی۔ میں نے ہر طرف تلاش کیا، کسی کا پتہ نہ چلا۔ ریفرشمنٹ روم بند تھا۔ اتنے میں ایک پولیس افسر آیا اور اس نے فہرست نکالی جس میں میرا نام نہ تھا۔ ہمیں گاڑی میں رہنے کی اجازت نہ ملی۔ ارونا جی بھی باہر ہی رہیں۔ کہا گیا کہ ریل میں چائے کا انتظام ہے۔ جب سب آ گئے تو دوبارہ حاضری لی گئی اور ریل خدا جانے کہاں چل دی۔

گوالیہ ٹینک پر دا تیرڈ دل اور وا لنٹیروں کی پریڈ تھی۔ وہاں مولانا آزاد یا پنڈت جی جھنڈا لہرانے اور آزادی کا رزولیوشن سنانے والے تھے۔ ان لوگوں کی گرفتاری کی خبر رضا کاروں کو نہ تھی

ہوگا جب تیرا اجمالِ باغبانی بے نقاب   کھیت سے تاروں کے جب اُگنے لگیں گے آفتاب

تب وفا اس دل کے زخموں کا لگائے گی حساب   جس کے خونِ نو کا ہر قطرہ تھا تخمِ انقلاب

جس کے چھینٹوں سے ہری کشتِ چمن ہے آج بھی

جس کی سُرخی غازۂ روئے وطن ہے آج بھی

ناخدا کو بھی سُلا سکتے نہیں جھونکے خواب کے   جاگی طوفانوں کی قسمت دن پھرے گرداب کے

دھمکیاں ساحل کو دیں اب حوصلے سیلاب کے   اک جنازہ جا رہا ہے دوش پر احباب کے

تیرگی سی ہے دماغوں میں مناظر کی طرح

صبح کا چہرہ بھی اُترا ہے جو آہر کی طرح

پھر بھی تیری روح زندہ ہے کہ زندہ ہے وفا   سن رہے ہیں موت کا ہم فاتحانہ قہقہا

کیوں نہ اس بے رحم کا ہم بھی اُڑائیں مضحکا   نعرۂ "آزاد زندہ باد" سے گونجے فضا

ہے طبیعت پہ جو مایوسی کا زنگ اُڑنے لگے

سن کے نعرے موت کے چہرے کا رنگ اُڑنے لگے

اے جلوسِ آخری تیرا نگاہوں کا سلام   گرم اشکوں کا سلام اور سردِ آہوں کا سلام

رہبروں کا، رہروؤں کا، شاہراہوں کا سلام   عالموں کا، شاعروں کا، کج کلاہوں کا سلام

آج وہ دن ہے کہ بھارت کا غم سجدے میں ہے

مظہری سجدے میں ہے اس کا قلم سجدے میں ہے

فیڈرل جرمن ریپبلک کے صدر پروفیسر تھیوڈور ہیس کے ساتھ (جولائی ۱۹۵۵ء)

وہ سب منتظر تھے۔ہم (اروناجی اور میں) وہاں پہنچے۔اروناجی نے جھنڈا لہرایا۔پولیس نے جس میں گورے سپاہی زیادہ تھے مداخلت کی۔میدان کو چاروں طرف سے دخانی توپوں سے گھیر لیا گیا تھا۔ننھے ننھے رضاکار بچوں، لڑکیوں اور لڑکوں پر یکایک گولہ باری ہونے لگی۔ہم نے اس تہلکہ کو دیکھ کر جلدی جلدی " جھنڈا اونچا رہے ہمارا " ختم کیا اور معصوموں کو دھوئیں کی دم گھٹا دینے والی اور زہریلی تیزی سے بچانے کی کوشش کی۔انگریز سپاہیوں نے نہتے راہ گیروں کو پستول کا نشانہ بنانا شروع کیا۔دھیرو بھائی ڈیسائی اور ان کی دھرم پتنی مع کچھ اور لوگوں کے پہنچ گئیں۔بے ہوش لڑکیوں کے لئے اسپتال بھیجنے کا انتظام ہونے لگا اور لاشوں کے لئے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

احمد نگر فورٹ جیل میں اخبار بھی بند تھے۔آخر وہ قیدی کیوں اپنی بے بسی کے عالم میں ہندوستانیوں کے قتل و خون کے قصے پڑھیں ؟

گوشے میں قفس کے مجھے آرام بہت ہے ۔۔۔ نے تیر کماں میں ہے نہ صیاد کمیں میں

اس پس منظر کے بعد مولانا نے اپنا غم غلط کرنے یا یوں سمجھیے کہ اپنے دلی بوجھ کو ہلکا کرنے کے لئے یہ طریقہ اختیار کیا کہ کچھ لکھنے لگے۔مخاطب نواب صدر یار جنگ مرحوم تھے۔خطوط سیاسی نہ تھے۔یعنی نہ اُن میں منطقی خشکی کے ساتھ تاریخی حقائق سے نتیجے نکالے گئے تھے نہ قربانی کے فلسفے پر لکچر تھے۔اور اگر یہ ہوتے بھی تو کس کے لئے ہوتے۔قلعہ سے ایک پرچہ بھی باہر نہ جا سکتا تھا۔نہ یہ لوگ اس طرح کے تھے کہ خفیہ سوسائٹی کے اصولوں کو مانتے۔وہ سب مہاتماجی کے بتائے ہوئے اصول کے پابند تھے یعنی "مقصد" کے ساتھ " ذرائع مقصد" بھی پاکیزہ و مناسب یا جائز ہوں۔نوجوان طبقہ اس اصول کو نہ مانتا تھا اور کہتا تھا کہ جن اصولوں کو ہمارے بڑے بوڑھے (یعنی ورکنگ کمیٹی کے ممبر) ناجائز سمجھتے ہیں، وہ اگرچہ عام حالات میں ناجائز سمجھے جائیں مگر مقصد کی پاکیزگی انھیں بھی پاکیزہ بنا دیتی ہے۔مثلاً کسی شخص کا ہاتھ کاٹنا بُرا سمجھا جاتا ہے، لیکن اگر اس ہاتھ کی بدولت سوسائٹی کا مسلسل نقصان ہوتا ہو تو کیا اس ہاتھ کو کاٹنا نامناسب سمجھا جائے گا۔یا اگر خود اس شخص کا ہاتھ سڑ رہا ہو تو کیا ڈاکٹر کی رائے

مولانا آزاد افریقی طلباء سے مصافحہ کر رہے ہیں۔ (نومبر ۱۹۵۴ء)

گھانا کے وزیر تعلیم اور وزیر مالیات کے ساتھ (ستمبر ۱۹۵۷ء)
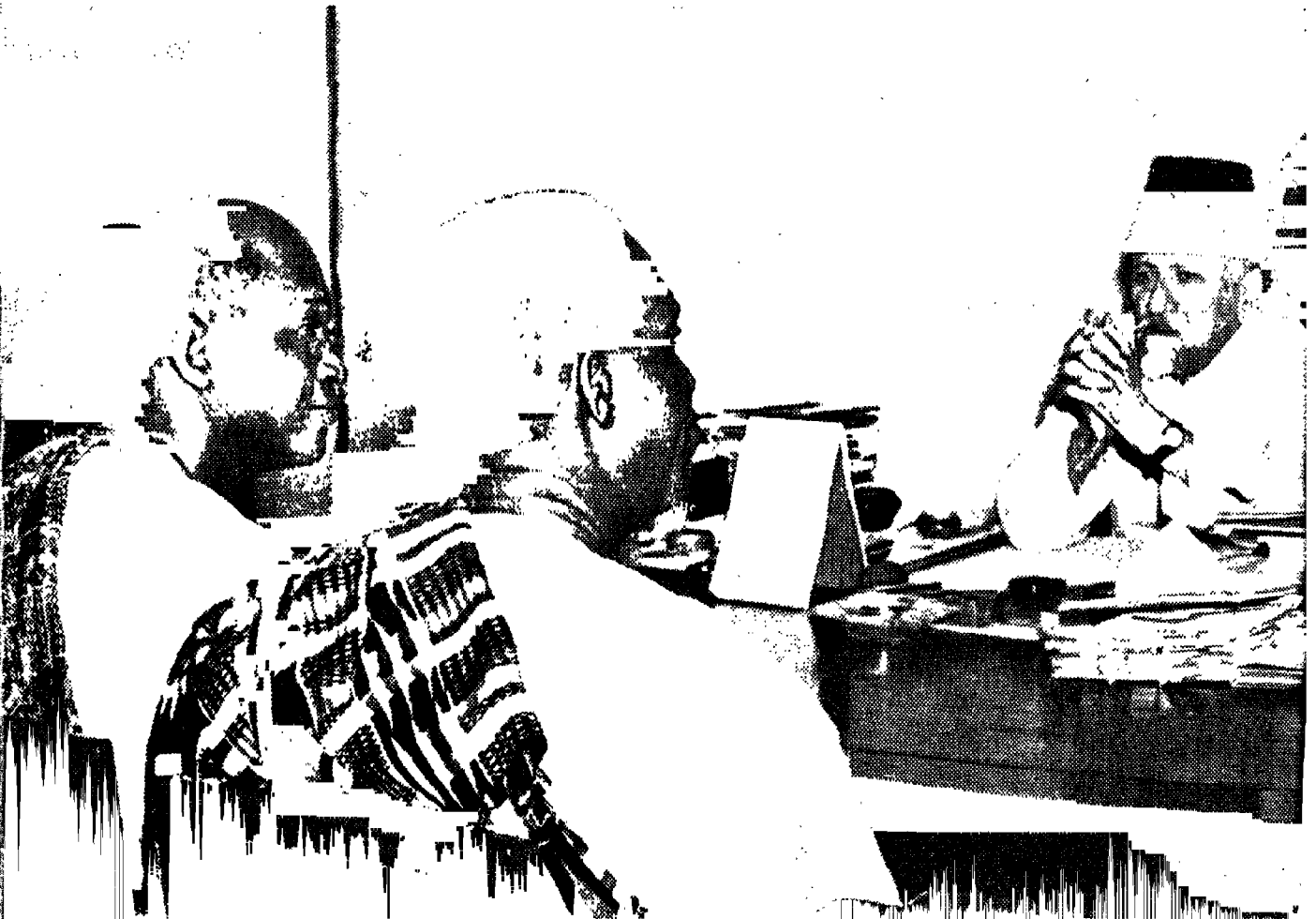
ہندوستان اور انڈونیشیا کے مابین ثقافتی تعاون کے معاہدے پر دستخط کر رہے ہیں (دسمبر ۱۹۵۵ء)

نیپالی طلباء کے وفد کے ساتھ (فروری ۱۹۵۷ء)
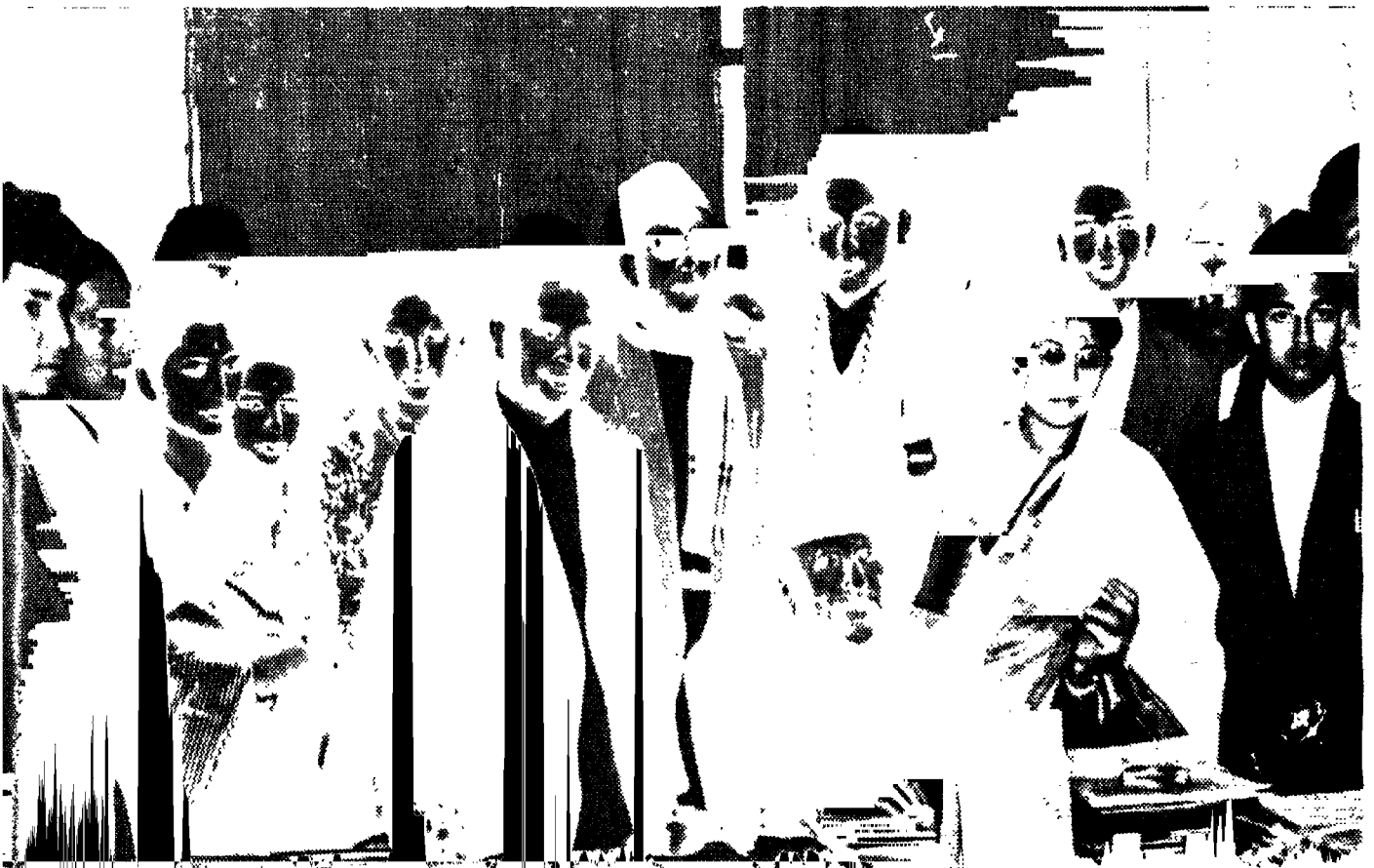
نہ مانی جائے گی۔ بہرحال یہ لوگ خفیہ کارگزاری کے خلاف تھے۔ اور کوئی خط اس طرح باہر نہ بھیج سکتے تھے۔

مجبوراً مولانا نے خطوط لکھنے شروع کیے۔ جواہر لال جی نے "ہندوستان کی تلاش" شروع کر دی۔ اور جب میں نے مولانا کے ان خطوط کو شائع کیا تو بہت سے ادب نوازوں نے تو یہاں تک مجھے لکھنا شروع کیا کہ کاش یہ لوگ سیاست میں نہ پڑتے اور عمر بھر قید بند میں رہتے تاکہ ایسے ایسے تاریخی و ادبی شاہکار تیار ہوتے رہتے۔ دیکھا آپ نے ان خودغرضوں کو! یہ لوگ تو جیل سے باہر رہ کر دماغی عیش کرتے اور لیڈر بیچارے دیوارِ زنداں سے سر پھوڑا کرتے۔ خود ان کی قید ایک پیغام تھی جس نے پورے ملک کو یہ دعوت دی تھی کہ

ہاں تا کہ در سینہ نہاں است نہ وعظ است | بر دار تواں گفت بہ منبر نتواں گفت

'الہلال' و 'البلاغ' نے مسلسل یہی دعوت دی تھی۔ 'ہری جن' کا یہی پیغام تھا۔ مجھے یاد ہے کہ ان لوگوں کی گرفتاری کی صبح کو جو ہفتہ وار 'ہری جن' نکلا تھا وہ پانچ پانچ روپے میں بک گیا اور پھر ڈھونڈے نہ ملا۔ اس میں پیامِ عمل تھا۔ اسی کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہزاروں نوجوانوں نے سینے پر گولیاں کھائیں اور آخرکار حکومتِ برطانیہ مجبور ہوئی کہ اپنا بستر سنبھالے Quit India زندہ باد!

مولانا نے اپنی زندگی میں مختلف حیثیتوں سے ہزاروں خط لکھے اور لکھوائے ہوں گے۔ ان خطوں کی الگ الگ نوعیتیں کی جا سکتی ہیں۔ مولانا شاعر نہیں کہے جا سکتے، لیکن آپ کے ادبی خطوط کی نثر میں جو شعریت پائی جاتی ہے وہ شاعری نہیں تو اور کیا ہے۔ یا ہاں انھوں نے جو خط بہ حیثیت ادیب کے نہیں لکھے، ان میں ہر صنف کا خط ظاہر کرتا ہے کہ کاتب مدبر ہے، مبلغ ہے، فقیہہ ہے، دوست ہے، بزرگ ہے یا کیا ہے!

حسرت موہانی نے اشعار کی کئی قسمیں کی ہیں جس کلام میں آمد ہی آمد ہو وہ عاشقانہ عارفانہ یا فاسقانہ ہوگا۔ جس میں آورد ہی آورد ہو وہ ماہرانہ، ناقدانہ یا ضاحکانہ ہوگا۔ جس میں آمد و آورد ملحوظ ہو وہ شاعرانہ، واصفانہ یا باغیانہ ہو سکتا ہے۔ ضاحکانہ کلام میں اگر

تاریخ داں ڈاکٹر آرنلڈ ٹون بی کے ساتھ مصروف گفتگو (فروری ۱۹۵۷ء)

جولائی ۱۹۵۵ء میں انڈیا ہاؤس (لندن) میں ہندوستانی طلبا سے خطاب کرتے ہوئے
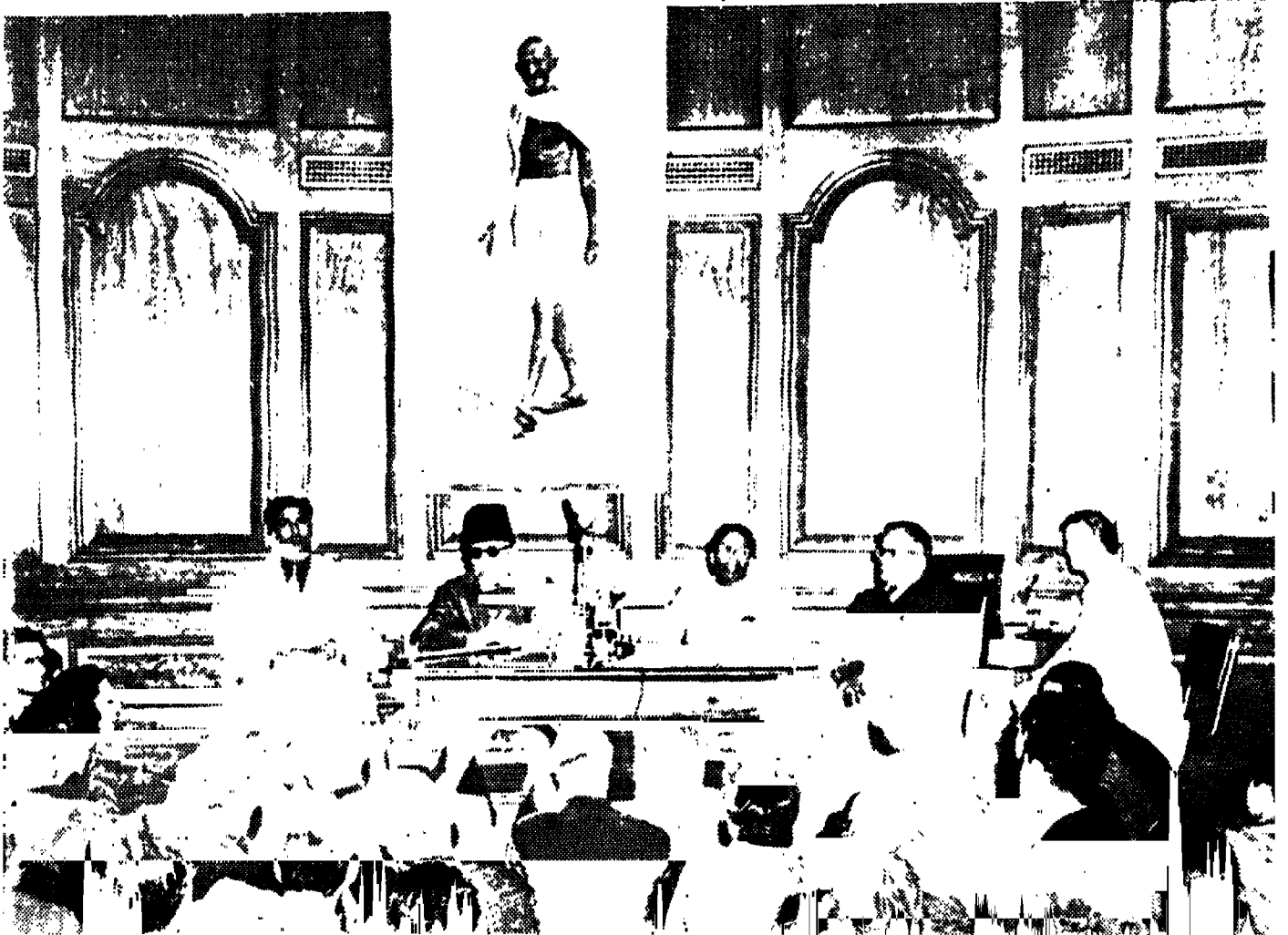
مولانا کے ہاتھ کا لکھا ہوا ایک خط تبرکاً یہاں درج کر دیتا ہوں۔ یہ خط مولانا محمد میاں فاروقی (حال ام۔ پی) کو لکھا گیا تھا۔ مولانا احمد نگر جیل سے بانکوٹا بھیج دئے گئے تھے اور ۱۵ جون ۱۹۴۵ء کو رہا کر دئے گئے تھے۔

رام نواس

بانکوڑا

۱۵۔ جون ۱۹۴۵ء

صدیق العزیز جیسا کہ کل شام آپ کو ریڈیو سے معلوم ہو گیا ہوگا آج صبح مجھے رہا کر دیا گیا۔ میں آج رات کی ٹرین سے کلکتہ جا رہا ہوں۔ میں نے اس وقت ایک تار ایکسپرس آپ کے نام اس مضمون کا بھیجا ہے کہ اجمل خاں صاحب بلا تاخیر کلکتہ آ جائیں۔ امید ہے کہ وہ تار ملتے ہی روانہ ہو گئے ہوں گے۔

کھڑک پور میں آپ کو دیکھ کر نہایت خوش ہوئی تھی۔ اس محبت و اخلاص کے لئے شکر گزار ہوں۔ افسوس ہے کہ یہ اطمینان گفتگو کرنے کا موقعہ نہ تھا۔ اس لئے چند منٹوں سے زیادہ ملاقات کا سلسلہ قائم نہ رہ سکا۔

امید ہے آپ بخیر و عافیۃ ہونگے والسلام علیکم و رحمۃ اللہ و برکاتہ

ابوالکلام

یہ دو خط جناب اقبال شیدائی صاحب کے ہیں۔ یہ بہت پرانے ہندوستانی نیشنلسٹ ہیں اور آج کل اپنے سوانح حیات لکھ رہے ہیں۔ ان سے آپ کو معلوم ہوگا کہ ۱۹۱۵ء میں حضرت مولانا عبید اللہ سندھی مرحوم (۱۸۷۲۔ ۱۹۴۱) کابل میں تھے اور وہاں انھوں نے انڈین نیشنل کانگرس کی بنیاد ڈالی تھی۔ پھر جب وہاں دو انقلابیوں یعنی مولانا برکت اللہ اور راجہ مہندر پرتاپ نے ہندوستانی عارضی حکومت قائم کی تو اس کے وزیر داخلہ تھے۔ مولانا برکت اللہ بھوپالی مرحوم پرائم منسٹر تھے (جنھوں نے ۱۹۲۶ء میں کیلیفورنیہ میں وفات پائی)۔ مولوی محمد بشیر صاحب امیر مجاہدین سرحد

ابتذال ہو تو وہ سوقیانہ ہو جائے۔ اور فاسقانہ کلام میں جذبات ہوس کی جگہ مذہب یا حکومت پر حملہ ہو اور سوسائٹی کو انقلاب کی دعوت دی جائے تو وہ باغیانہ ہے۔

اگر ہم نثر مرصع و عاری و عریاں وغیرہ کی صوری صنعت گری سے قطع نظر کرلیں تو معنوی حیثیت سے حسرت کی تبویب نثر پر بھی عائد ہو سکتی ہے۔ اس کے علاوہ بھی بہت سی قسمیں ہو سکتی ہیں۔ مثلاً حاکمانہ (جابرانہ، ظالمانہ یا عادلانہ) عالمانہ (موٴرخانہ، ناقدانہ، فلسفیانہ) احمقانہ یا مجنونانہ (مثلاً بک رہا ہوں جنوں میں کیا کیا کچھ کچھ نہ سمجھے خدا کرے کوئی) غاویانہ (مجرمانہ، لائمانہ، الشعراء یتبعھم الغاوون)۔ ناصحانہ (مشفقانہ، دوستانہ) بے بسانہ (فریاد کی کوئی لے نہیں ہے نالہ پابند نے نہیں ہے) اسی کی ایک قسم بڑبڑانا بھی ہو سکتی ہے۔ خامشانہ (یعنی وہ کلام جس کا جواب خاموشی ہو) خاموشی کی کئی وجہیں ہو سکتی ہیں۔ ایک تو یہ کہ سوال ہی لغلانہ ہو۔ دوسرے یہ کہ جواب کے لئے سائل کی بصیرت و علم اونچے درجے کی نہ ہو۔ تیسرے یہ کہ جواب نہ دینے میں کوئی مصلحت ہو۔ چوتھے یہ کہ جواب دینے سے فتنہ بڑھنے کا اندیشہ ہو اسی لئے ایک محاورہ بن گیا ہے کہ گنوار کی گالی ہنس کے ٹالی۔ بہرحال

خموشی معنیٔ دارد کہ در گفتن نمی آید

ذیل میں ہم چند خطوط کے اقتباسات دیتے ہیں جو دوسروں نے مولانا کو لکھے تھے۔ بعض کے جواب مفصل دئے گئے ہیں، بعض کے دو حرفی ہیں اور بعض کے متعلق خموشی ہی جواب ہے۔ ان خطوط میں آپ کو 'غبارِ خاطر' کے خطوں کا لطف تو شاید نہ آئے، اس لئے کہ وہ ایک خاص صنف کے خط ہیں اور بالارادہ 'غبارِ خاطر' کو ادبیات کے خم میں غرق کرنے کے لئے لکھے گئے ہیں۔ لیکن علاوہ سیاست کے دوسرے میدان بھی ہیں جن میں مولانا کے فیصلے نہ صرف ناطق ہیں بلکہ مختتم ہیں۔ یہ خط انھیں پیش کئے گئے اور پیش کرتے ہی ان کے جواب برجستہ اور بے تکان دئے گئے۔ جواب دینے میں ایک لمحے کا تامل نہیں ہوا۔ ان میں سیاسی خطوط نہیں ہیں اور مشتے نمونہ از خروارے ہیں جنھیں موقع ملنے پر شائع کیا جاسکتا ہے۔

ہوگی۔ جواب آنے پر یہاں سے سفر کی تاریخ مقرر کروں گا۔

والسلام

حضور کا خادم

اقبال

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ نحمدہٗ و نصلی علیٰ رسولہ الکریم

قاہرہ۔ ۴۔ اکتوبر ۱۹۳۱ء

حضرۃ مولانا صاحب قبلہ۔ سلام مسنون۔ مکرمی محمد اجمل خاں صاحب نے میرے عدن سے مکتوب کا جواب دیا کہ حضور میرے لئے دست بدعا ہیں کہ مجھے سکون و اطمینان حاصل ہو شکریہ۔ مسلمان ممالک میں سکون و اطمینان کسی حساس شخص کو حاصل ہونا جوئے شیر کا لانا ہے بہرحال مایوسی گناہ ہے۔

میں ابھی یہاں کچھ روز اور قیام کروں گا۔ ارادہ ہے کہ اس ماہ کے آخر میں اطالیہ چلا جاؤں وہاں پرانے دوست بھی ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ ان کے ساتھ مل کر کچھ تجارتی کام کروں۔ آخر دن کٹی کرنا ہے۔ فی الحال مدنظر کوئی خاص مقصد نہیں۔ یعنی سیاسی۔ خدا کرے کچھ تجارتی کام چل نکلے۔ دعا فرمائیے گا۔

یہاں مسٹر ڈیبسائی مائی کمشنر اتفاق سے مل گئے۔ ان کے ہاتھ ایک مکتوب خدمتِ عالی میں بھیج دیا۔ استاد مرحوم کا مرید ہوں یعنی ؎

خط لکھیں گے گرچہ مطلب کچھ نہ ہو ، ہم تو عاشق ہیں تمھارے نام کے

اجمل خاں صاحب کی خدمت میں سلام عرض کرتا ہوں۔

والسلام علیکم و رحمۃ اللہ و برکاتہٗ

حضور کا خادم اور دعا کا طلبگار

اقبال

وزیر جنگ تھے۔ ڈاکٹر رحمت علی (جو آج کل لاہور یونیورسٹی میں فرنچ پڑھاتے ہیں) وزیر رسل و رسائل تھے۔ مسٹر پلّے وزیر خارجہ تھے (جو برلن میں نازیوں کے ہاتھوں قتل ہوئے) اور راجہ مہندر پرتاپ (جو آج کل رکن پارلیمان ہند ہیں) حکومت کابل آریانہ اور انقلابیانِ ہند کے روحِ رواں تھے۔ اقبال شیدائی صاحب بھی وزارتِ جنگ و رسل و رسائل کے نائب وزیر تھے۔ ان کو مولانا ابوالکلام آزاد نے کابل بھیجا تھا۔ اب وہ پاکستانی ہیں اور اتحادِ اسلامی کے خواہش مند ہیں:

یہاں علم تنجیم یا جوتش کا خیال آ گیا۔ میرے سامنے متعدد "اقبال" اپنی اپنی شان میں نظر آنے لگے۔ مثلاً اقبال احمد خاں سہیل (مرحوم) شاعر و ادیب۔ ڈاکٹر اقبال شاعر۔ ڈاکٹر اقبال (پروفیسر لاہور) پروفیسر اقبال علی شاہ (میرٹھی۔ مصنف) اقبال شیدائی صاحب انقلابی۔ سر اقبال (جج ہائی کورٹ) اقبال سنگھ (کرکٹ)....

بسمہ اللہ تعالےٰ

۱۲ جون ۵۶ء

سیدی و مولائی۔ السلام علیکم و رحمۃ اللہ

یہ غالباً تیسرا مکتوب ہے جو خدمتِ عالی میں ارسال کر رہا ہوں۔ اس مکتوب کے ساتھ چند صفحات ایک خاص واقعہ کے متعلق جو اب تاریخی واقعہ ہو چکا ہے ارسالِ خدمت ہیں۔ دو ایک عربی اخبارات کے کٹنگ بھی بھیج رہا ہوں۔ ممکن ہے باعث دل چسپی ہوں۔ ایک اور صحیفہ بھی ہے جو مولوی فضل الٰہی صاحب مرحوم و مغفور نے ہرہٹلر مرحوم اور سینر موسولینی مرحوم کو لکھا تھا۔ اور جس کی کاپی مولوی صاحب مرحوم نے مجھے دی تھی۔ کسی دوسرے وقت میں ارسال کروں گا۔ یہ سب چیزیں تاریخی حیثیت رکھتی ہیں اور بہت ممکن ہے، ہندوستانی تاریخ نویس اس سے کچھ فائدہ حاصل کر سکیں۔

حضور کے جواب کا ایک مدۃ سے منتظر ہوں۔ تاخیر غالباً گوناگوں مصروفیات کی وجہ سے

اس دفعہ سال نامہ کی ترتیب و تزئین کا اچھا خاصہ نقشہ جمایا ہے، دو سو صفحے، کئی تصویریں۔ سہ رنگی و یک رنگی۔ پریس اپنا ہے۔ آپ طباعت دیکھ کر یقیناً خوش ہوں گے۔ اپنے قلم کو حرکت میں لائیے۔ مولانا مدظلہ کی سیرت کے بعض خاص پہلوؤں پہ کچھ لکھئے۔ یہ میری دوستانہ استدعا ہی نہیں دردمندانہ خواہش بھی ہے۔ ایک بات ضرور پیشِ نظر رہے کہ پندرہ دسمبر تک مضمون مل جائیں۔ آپ کا بھی اور مولانا کا بھی۔ فرمائیے اُن سے کیسے التماس ہو۔

جواب کا منتظر

المخلص

شورش کاشمیری

9-11-55

جواب۔ کبھی موقع ہو تو آپ دہلی آ کر مل لیں۔

ایک ہندو سنیاسی کا خط

۲۴۔ جولائی ۵۲ء

مخدوم و مکرّم جناب پیر مرشد صاحب دام ظلکم

بندہ اک عرصہ سے آرزوِ خاص دل میں پوشیدہ رکھتا تھا کہ جناب کی خدمت میں چند حروف ارسال کروں مگر موقعہ محل و نیز دیگر مجبوریاں تھیں۔ آج خوش قسمتی سے تحریر کرتا ہوں امید قوی ہے کہ جواب دے کر بندہ پہ بڑی عنایت کریں گے تاہم ڈر بھی ہے کہ ایک ملک کا اتنا بڑا آدمی اک غریب فقیر کو کیوں جواب دینے لگا۔ مگر بلند خیالی و پاک دامنی کا سہرہ روحِ دنیا پہ ہرسو پھیلا ہُوا ہے اس لئے امید ہے۔

آج میں نے ہندی کی شعر و شاعری کی ایک کتاب پر غور کیا جس میں ملک محمد جائسی کے تصانیف اشعار تھے۔ ایک ہندی شاعر نے ان کو "صوفی" لکھا جس کو میں بھی مانتا ہوں اور

یہ دو خط ایک ایسے شورش پسند کے ہیں جس کا مقصدِ حیات ہی حرکت و ہیجان ہے ۔ جس نے اپنے قید و بند کے زمانے میں جیلروں تک کو انقلاب پسند نہیں بلکہ انقلابی بنا دیا ۔ وہ ایک کوہِ وقار ہے جو بچپن سے آج تک چٹان کی طرح اپنے مسلک پر قائم ہے ۔ شمعِ حریت کے ان پروانوں کے سوز و گداز کو کوئی کیا جانے! مولانا کے بعد

ہو غم ہی جاں گداز تو غم خوار کیا کریں!

محترم المقام سلام مسنون

ادارۂ ہفت روزہ "چٹان" نے فیصلہ کیا ہے کہ ۱۹۵۷ء کے آغاز میں مولانا ابوالکلام آزاد کی جامع صفات شخصیت سے متعلق ایک خاص اور ضخیم نمبر شائع کرے ۔ اصلاً یہ ایک اعتراف ہوگا ان علمی ۔ ادبی ۔ تفسیری ۔ دینی اور سیاسی خدمات کا جو اس بزرگ ہستی نے پچھلی نصف صدی میں سرانجام دی ہیں

ہماری کوشش یہ ہوگی کہ ہم اس نمبر کو مولانا کی شان کے شایاں اور ان کے مذاق کی نفاست کے مطابق شائع کریں ۔ اس ضمن میں ہم نے ان تمام اہلِ قلم اور اہلِ سیاست سے رجوع کیا ہے جو مولانا سے قریب رہے یا آپ کی عظمت کے کسی نہ کسی اعتبار سے معترف ہیں ۔

نیازکار

شورش کاشمیری

ایڈیٹر "چٹان" لاہور

بھائی اجمل!

سلام مسنون، آج ہی ایک خط، حضرت مولانا مدظلہ کو بھی لکھا ہے ۔ کبھی تو اُن کی نگہہِ التفات کو آمادہ کیجئے ۔ ع

ترس گئے ہیں کسی مردِ راہ داں کے لئے

سال ہوئے دہلی میں چھپی تھی۔ میں سفارش کرتا ہوں کہ محکمۂ تعلیم یا کوئی اور شعبۂ تعلیم اس ترجمہ کو چھپوا کر شیخ سعدی کے پند و نصائح سے اہلِ ہند کو مستفیض کرے۔ بہ شرطِ طلب یہ ہندی کتاب بہ سر و چشم ارسالِ خدمت ہوگی۔

کچھ عرصہ ہوا ایک کتاب میں دیکھا تھا کہ انگریزوں کے عہد میں جب آپ احمد نگر کے قلعہ میں سلطانی مہمان یا خاکم بدہن اسیر تھے تو ایک چڑیا سے جو آپ کے کمرہ میں مخل ہو کر باعثِ تکلیف ہوتی تھی آپ کو زیر ہونا پڑا کیونکہ اس کی مداخلت سے روکنے کی تمام تدبیریں بے کار ثابت ہوئیں۔ مبادا موجودہ سیاسی جد و جہد میں پھر حالاتِ ماضی رونما ہو جائیں یہ تجویز پیشِ خدمت ہے کہ آیندہ آپ کے بستۂ وزارت میں ایک ربڑ کا گیند بھی اضافہ کر دیا جائے جو بوقتِ ضرورت ایسے مُدخلین سیاسی کے تدارک و اندفاع میں تیر و تفنگ تو کیا بمب اور بومرینگ Boomrang سے بھی زیادہ مؤثّر ہوگی۔

چونکہ میں بہا جتا در مزدور ہوں اس خدمت کے اجر کا بھی مستدعی ہوں اور اجر بھی تجویز کر دیتا ہوں۔ و ہو ہذا۔ مجھے دو غزلوں کی نقلیں جن کے ایک ایک مصرع ذیل میں منقول ہیں عنایت فرمائی جائیں۔ ان کے حصول میں میں اب تک ناکام رہا۔

۱۔ بیا در کشتیٔ چشم نشیں و سیرِ دریا کن

۲۔ منم آں شمعِ تنہائی کہ در ویرانہ می سوزد

نیز مغلیہ بادشاہوں کے مشہور عالم باغ موسومہ شالامار کے صحیح نام اور وجہِ تسمیہ سے بھی مطلع فرمائیں۔ یاد پڑتا ہے کہ وقائعِ نعمت خاں عالی میں مذکور ہے کہ اس کا اصل نام شعلۂ ماہ باغ تھا۔ براہِ کرم اس کی تدقیق و تصدیق فرمائیں۔ اخبار Blitz نے اس سے متعلق ایک غلط بیان شائع کیا ہے اس کی تصحیح اپنا فرض سمجھتا ہوں۔

دعاگو و محتاجِ دعا

نیاز اساس

سری کرشن داس یاس خراب آبادی

ہر شخص ماننے کو تیار رہے۔ مگر کتاب مذکور کے اندر "صوفی" الفاظ کی تشریح نے مجھے پریشان کر دیا بعض اشخاص نے تو صوفی اس جماعت کا نام لکھا ہے جو سفید اون کے کپڑے پہنتے تھے۔ غرض کتنے ہی الفاظ پے تکے تھے۔ کیا میں امید کروں کہ وقت سیاست سے نکال کر مجھے دو الفاظ یعنی صوفی الفاظ کے مرادف الفاظ و نیز اس جماعت کی ابتدائے تواریخ پر چند حروف عنایت فرمائیں گے۔

میں ایک ہندو فقیر (سنیاسی) ہوں اور اردو ہندی دونوں سے پریم ہے۔ امید ہے حروف غلط و نیز دیگر غلطی پہ غور نہ کریں گے۔ مجھے یہ شعر نامعلوم کیوں پسند ہے۔

ہزاروں بندے تو ہیں خدا کے بتوں میں پھرتے ہیں مارے مارے
میں اس کا بندہ بنوں گا جس کو خدا کے بندوں سے پیار ہوگا

آپ کا خیر اندیش

سوامی برھم دتہ ہنس

جواب۔ میرا خیال ہے کہ یہ لفظ یونانی لفظ صوفہ یونان سے نکلا ہے جس کے معنی حکمت و عقل ہیں۔ اس سے فیلاسوف بنا ہے۔ قطعی طور پہ کہنا مشکل ہے لیکن یہی خیال زیادہ معقول معلوم ہوتا ہے۔

ایک ادبی سوال اور اس کا جواب

رانی کھیت ضلع الموڑہ

۲۰۔ ستمبر ۱۹۵۶ء

فضیلت مآب قبلہ مولانا صاحب مدظلہ،

آداب۔ آپ پر بخوبی روشن ہے کہ بچوں اور نوجوانوں کے لئے شیخ سعدی کی مشہور و مستند تصنیف کریما سے بہتر کتاب آج تک کسی زبان میں شائع نہیں ہوئی۔ خوش قسمتی سے اس لطیف کتاب کے ہندی ترجمہ کی ایک جلد میرے پاس موجود ہے جو غالباً ساٹھ ستر

کوشش نہ کر۔ جوابات لکھنے کی زحمت گوارا فرمائیں گے؟ یہ مقالہ چونکہ دائرۃ المعارف میں چھپے گا۔ اس لئے تمام معلومات زیادہ سے زیادہ واضح اور مستند ہونی چاہئیں۔ مثلاً

۱۔ مولانا کا سالِ ولادت ۱۳۰۵ھ ہے۔ لیکن مہینے تاریخ اور دن کے متعلق کہیں سے کچھ معلوم نہ ہوسکا۔

۲۔ 'لسان الصدق' کا پہلا پرچہ ۲۰۔ نومبر ۱۹۰۳ء کو نکلا تھا۔ یہ پرچہ اور متفرق پرچے میرے پاس ہیں۔ یہ معلوم نہ ہوسکا کہ یہ کب تک جاری رہا؟

۳۔ 'الندوہ' کی ایڈیٹری کا زمانہ ۱۹۰۵ء کے اواخر سے ۱۹۰۶ء کے اوائل تک کا معلوم ہوتا ہے۔ کیا اس تعلق کی قطعی تاریخیں معلوم ہوسکتی ہیں؟

۴۔ مولانا 'وکیل' میں کب سے کب تک رہے؟

۵۔ مولانا کی تحریروں سے مترشح ہوتا ہے کہ عراق کا سفر ۱۹۰۸ء میں ہوا تھا۔ کیا اس کی صحیح تاریخ اور مدت کا علم ہوسکتا ہے؟ مولانا کے بھائی کا انتقال کس مقام پر ہوا تھا؟

۶۔ مختلف لوگوں نے لکھا ہے کہ مولانا بہ سلسلۂ تعلیم مصر بھی گئے تھے۔ یہ سفر کس زمانے میں ہوا تھا؟

۷۔ مولانا کے والد ماجد ۱۸۸۶ء میں حجاز گئے تھے۔ اس وقت ان کی عمر کیا تھی؟

۸۔ میرا خیال ہے کہ وہ وقتاً فوقتاً ہندوستان آتے رہے، اس لئے کہ بمبئی، بنگال، برما وغیرہ میں ان کے بے شمار مرید تھے۔ مستقل اقامت کی نیت سے ۱۸۹۸ء میں آئے۔ کیا یہ درست ہے؟

۹۔ مولانا کے والدین کی تاریخ ہائے وفات؟ میں نے ۱۹۲۲ء میں ان کی قبروں کی زیارت کی تھی اور تاریخیں لکھ لی تھیں، لیکن اب وہ تحریر انہیں کاغذوں میں گم ہوگئی ہے اور نہیں ملتی۔

۱۰۔ رانچی میں مدتِ قیام کو "نظربندی" سے تعبیر کرنا درست ہوگا یا "اسیری" سے؟

جواب - پہلا مصرع آتشی قندھاری کا ہے۔ عبدالقادر بدایونی نے منتخب التواریخ میں ذکر کیا ہے اور یہ مطلع لکھا ہے۔

شالامار کے بارے میں کئی روایتیں ہیں لیکن صحیح وجہ تسمیہ نہیں بیان کی جا سکتی۔ شالامار باغ دلّی میں بھی تھا۔ اورنگ زیب نے اپنی تخت نشینی کا وہیں سے اعلان کیا تھا لیکن اب اس کا نام نشان باقی نہیں ہے۔

مکرّم و محترم چودھری غلام رسول مہر (سابق اڈیٹر 'انقلاب' لاہور) اردو کے بہترین ادیب، فارسی کے رمز شناس، عربی اور انگریزی ادب کے قدر دان کا مولانا سے بہت قدیم یارانہ ہے۔ سیاسی زلزلوں نے اس رشتہ کو جنبش نہیں دی بلکہ مزید استواری بخشی۔ لاہور میں اُن سے مولانا کی ملاقاتیں بھی مجھے یاد ہیں اور تقسیم ہند کے بعد مہر صاحب کا دِلّی میں مولانا کے یہاں فروکش ہونا بھی کل کی بات ہے ان کے خطوں پر جو مولانا کے جواب ہیں وہی محبت و خلوص کے لئے شاہدِ عدل ہیں:

باسمہ سبحانہ

۲۲۔ مارچ ۱۹۵۴ء

برادرِ محترم - میں نے جب آپ کو لکھا تھا کہ جلد آرہا ہوں تو اسی وقت تیاری کر لی تھی۔ لیکن دفعتہً بیمار ہو گیا اور اب تک بیماری سے پیچھا نہیں چھوٹا۔ ذرا طبیعت سنبھلے تو چند روز کے لئے حاضر ہو جاؤں۔ چند ضروری باتیں پیشِ نظر ہیں، پھر میں یورپ جانا چاہتا ہوں اغلب ہے اس سفر میں چار یا پانچ مہینے لگ جائیں۔

یہاں پنجاب یونیورسٹی ایک دائرۃ المعارف مرتب کر رہی ہے۔ اس کے لئے حضرت مولانا کے متعلق ایک مقالہ میرے ذمّے لگا ہے۔ وہ تمام حالات میرے پیشِ نظر ہیں جو مولانا نے اپنی تصانیف میں ضمناً لکھے یا دوسرے اصحاب نے مستقل کتابیں تصنیف کرتے وقت تحریر کئے۔ بعض امور کے متعلق تعین کے ساتھ کچھ معلوم نہ ہو سکا۔ کیا آپ ازراہِ عنایت میرا یہ عریضہ مولانا

تبصرہ لکھا تھا؟ آیا اس کا دیوان بہت اچھا ہے؟ آیا اس تبصرہ کا کوئی ٹکڑہ آپ کے مسودات میں موجود ہے؟ لیکن اب اس کے سوا چارہ نہیں کہ دہلی دوبارہ آؤں تو پوچھوں۔

والسلام علیکم

نیاز مند

ماہر

جواب۔ ہو سکتا ہے کہ میرے حافظے میں وہی الفاظ ہوں جو میں نے لکھ دیئے۔ اگر آپ نے دیوانِ عرفی دیکھا ہے تو وہی الفاظ ٹھیک ہیں۔

شرف جہاں قزوینی کی خصوصیت یہ ہے کہ اس نے فارسی شاعری میں وقوعہ گوئی کے طرز کی بنیاد ڈالی، وقوعہ گوئی اس معاملے میں بولا جاتا ہے جس معنی میں اردو میں معاملہ بندی کہتے ہیں۔ اس کے مسودات ضائع ہو گئے موجود نہیں ہیں۔

خان بہادر ظفر حسین کی معرکۃ الآرا کتاب "انواعِ فلسفہ" چھپ گئی ہے۔ مولانا نے باوجود اپنی گوناگوں مصروفیات کے جو کچھ فرمایا ہے وہ کتنا دقیع ہے!

"انواعِ فلسفہ" میں آپ نے بعض مصطلحات ایسی استعمال کی ہیں جو غور طلب ہیں۔ آپ نے Resultant کے لئے معلولات استعمال کیا ہے۔ یہ صحیح نہیں معلوم ہوتا Resultant ریاضی کی مشہور اصطلاح ہے جس کے لئے صحیح عربی لفظ حاصلات ہے Emergant کے لئے آپ نے خارجات کا لفظ استعمال کیا ہے۔ حالانکہ خروج اس کے مفہوم کو ادا نہیں کرتا۔ میں نے الہلال کے زمانے میں اس کے لئے ظہورِ فجی کا لفظ استعمال کیا تھا لیکن پھر میں نے اس کے لئے زیادہ موزوں عربی فلتات پایا جو فلتۃ کی جمع ہے۔

Atom کے لئے آپ نے ذرہ استعمال کیا ہے۔ ٹھیک ہے لیکن عربی کی پرانی اصطلاح جوہر فرد ہے۔

آپ نے Dilectic کے لئے کلامیات وجدلیات دو لفظ لکھے ہیں۔ کلامیات اس

مولانا نے 'غبارِ خاطر' میں اس مدّت کو 'اسیری' میں محسوب کیا ہے۔

میں نے بڑی ہمّت سے یہ سطریں لکھی ہیں۔ لطفاً یہ بھی لکھیئے کہ مولانا کی صحت اب کیسی ہے۔ مجھے ہر حال میں جلد آنا ہے۔ صرف اس انتظار میں ہوں کہ ذرا طبیعت سنبھل جائے تاکہ سفر کے قابل ہو جاؤں۔

امید ہے آپ بخیر ہوں۔ سیّد صاحب کی سیرت کی جلد اوّل کے پروف بھی دیکھے گئے۔ دوسری جلد کے پروفوں کا انتظار ہے۔ کتاب انشا اللہ جلد چھپ جائے گی۔

والسلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

نیاز مند

مہر

جواب۔ بہتر یہ ہے کہ آپ دو تین دن کے لئے یہاں آئیں تو ان سوالوں کے زبانی جوابات مل جائیں۔

باسمہٖ سبحانہٗ

۶۔ مئی ۱۹۵۴ء

حضرت مولانا۔ میں کل ایک مفصل عریضہ خان صاحب کی وساطت سے خدمتِ گرامی میں بھیج چکا ہوں۔ آج دوپہر کو لیٹا تو معمول کے مطابق سب سے پہلے آپ ہی کی یاد تازہ ہوئی۔ میں یہ عرض کرنا بھول گیا کہ عرفی کا ایک شعر آپ نے 'غبارِ خاطر' میں کسی قدر بدل کر چھاپا ہے اور بدلا ہوا ٹکڑا اصل سے بہتر نہیں۔ غور و فکر کے باوجود معلوم نہ ہو سکا کہ اس میں مصلحت کیا تھی۔ شعر یوں ہے:۔

من از یں دردِ گراں مایہ چہ لذت یابم   کہ بہ اندازۂ آں صبر و ثباتم دادند

لیکن غبارِ خاطر میں "دردِ گراں مایہ" کی جگہ "رنجِ گراں بار" چھپا ہے۔

یہ بھی پوچھنا چاہتا تھا کہ آپ نے مترفِ جہاں قزوینی کے دیوان پر کس وجہ سے

شری دیانند شرما کا سوال اور اس کا جواب

دہلی ۱۷۔ اکتوبر ۱۹۵۱ء

محترم مولانا صاحب

معاصر "مردِ" لاہور نے آپ کا مضمون "اسوۂ حسین" ماخوذ از "داستانِ کربلا" بشکریہ نفیس اکیڈیمی، اپنے مورخہ ۱۴ اکتوبر کے شمارے میں شائع کیا ہے۔ ایڈیٹر لکھتا ہے کہ ہم مولانائے موصوف سے دریافت کرتے ہیں کہ کیا وہ اس موقعہ پر مسلمانانِ کشمیر کو بھی یہی مشورہ دیں گے کہ وہ "ہر ظالمانہ و جابرانہ حکومت کا علانیہ مقابلہ کریں اور کسی ایسی حکومت سے اطاعت و فرمانبرداری کی بیعت نہ کریں جو خدا کی بخشی ہوئی انسانی حریت اور حقوق کی غارت گر ہو۔"

قطع نظر اس کے کہ معاصر ایسا کرنے میں کہاں تک حق بجانب ہے۔ میں ایک بات آپ سے دریافت کرنا چاہتا ہوں اور وہ یہ ہے کہ اسلام میں بنیادی حقوق کا نظریہ کیا ہے۔ کیا یہ خدا کی بخشش ہیں جیسا کہ آپ کے مضمون میں درج ہے یا انسانی دماغ کی کاوش کا نتیجہ ہیں اس معاملے میں اگر آپ مجھے راہ دکھا سکیں تو آپ کا بہت شکر گزار ہوں گا۔

خادم

دیانند شرما

جواب۔ جو چیز قرآن کے مطالعہ سے معلوم ہوئی ہے وہ یہ ہے کہ مساوات پر یعنی انسانی برادری "بھائی چارہ" پر عام طور سے اس میں زور دیا گیا ہے اور اس خیال کی مخالفت کی گئی ہے کہ معاشرت یا نسل کی بنا پر انسان کا کوئی گروہ دوسرے گروہ سے افضل ہو سکتا ہے۔

مساواتِ انسانی کا تصور فطری ہے اور خدا کی بخشش ہے۔ رہ گئی اس کے حصول کی کوشش یا عدم سعی۔ یہ انسانی دماغ پر منحصر ہے۔ فطرت صحیحہ اسے راستہ دکھا چکی ہے۔ اس پر چلنا نہ چلنا اس کے اختیار میں ہے۔

کے لئے درست نہیں ہوگا۔

Experimentalism کے لئے آپ نے اختیاریت استعمال کیا ہے۔ جو بھی لفظ استعمال کیا جائے اس میں تجربہ کا مفہوم آنا چاہیئے۔

آپ نے Mass اور Quantity کو مرادف قرار دیا ہے اور دونوں کے لئے کمیّت کا لفظ استعمال کیا ہے۔ حالاں کہ اس کے لئے صحیح لفظ حجم ہے نہ کہ کمیّت۔ ' الہلال ' کے مضامین میں میں نے اس کے لئے حجم ہی استعمال کیا ہے۔

آپ نے Platonic Ideas کے لئے افلاطونی اعیان کی اصطلاح استعمال کی ہے۔ عباسی مترجموں نے اس کے لئے مثال کی اصطلاح استعمال کی تھی اور وہی صحیح ہے۔ اعیان کا عربی فلسفہ اور تصوّف میں دوسرا مفہوم ہے۔

Response کے لئے آپ نے جوابی حرکت اور ردِّ عمل دو لفظ لئے ہیں۔ ردِّ عمل Reaction ہے Response کے لئے صرف جواب صحیح اصطلاح ہوگی۔

Self کے لئے آپ نے ذات اور نفس دو لفظ لکھے ہیں۔ صرف ذات استعمال کیجئے نفس صحیح نہیں ہوگا۔ اگر Self کے لئے نفس استعمال کریں گے تو Nous کے لئے کیا باقی رہے گا۔ عربی فلسفے میں Noetic کے لئے نفسِ ناطقہ استعمال کیا گیا ہے۔

Velocity کے لئے آپ نے حرکت کا لفظ لیا ہے۔ پھر آپ Movement کو کیا کہیں گے۔

Proton کے لئے آپ نے برقِ مثبت کی اکائی لکھا ہے۔ میری رائے یہ ہے کہ اس قسم کے تمام انگریزی مصطلحات جو ہمارے لئے سہل المخارج ہوں بجنسہٖ اختیار کر لینے چاہیئں۔ الیکٹرون Electron اور پروٹون ہم کہہ سکتے ہیں۔ Pluralism کے لئے آپ نے کثریت کا لفظ استعمال کیا ہے۔ یہ صحیح نہیں ہوگا۔ اسے مذہب کثرت کر دیجئے۔

ڈاکٹر نور حسین صاحب کا سیالکوٹ (پاکستان) سے مکتوب

سیالکوٹ - ۴ ستمبر ۱۹۵۴ء

مکرمی و محترمی جناب مولینا! السلام علیکم و رحمۃ اللہ

ایک مدت سے ارادہ کر رہا تھا کہ آپ کی خدمت میں عریضہ لکھوں چند ایک مسائل ہیں جو میرے لئے ایک مدت سے اُلجھن بنے ہوئے ہیں۔ آج میں آپ ہی کی خدمت میں ان کے حل کرنے کے لئے رجوع کر رہا ہوں کیونکہ میری دانست میں ان مسائل کی دشواریوں کو طے کرنے کی اہلیت سرزمینِ پاکستان و ہندمیں آپ کی ذات کے بغیر اور کوئی نہیں رکھتا۔ لہذا آپ ہی کو تکلیف دے رہا ہوں۔ میں جانتا ہوں کہ آپ کی معروفیتیں بے حد ہیں۔ لیکن اسے کیا کیا جائے کہ اور کوئی راستہ بھی دکھائی نہیں دیتا۔

اسلام کی ہمہ گیر سادگی اور یہ کہ یہ فطرت کا مذہب ہے۔ مسئلۂ توحید اور اس کے بعد محض عمل صالحہ پر زور۔ یہ سب کچھ نہایت عمدہ اور قابل قبول۔ لیکن اس کا کیا جواب کہ نتائج کے اعتبار سے (قرونِ اولےٰ کے شاندار زمانہ سے قطع نظر) سوائے مایوسی کے اور کچھ نہیں۔ کم از کم یارھویں صدی عیسوی یا خلافتِ عباسیہ کے خاتمہ کے بعد اسلام کی تمام ترقی کا دروازہ ایسا مسدود ہوا کہ پھر نہ کھلا اور آج تک پیروانِ اسلام ذلت و ادبار میں مبتلا ہیں۔ میں اس حقیقت سے پوری طرح آشنا ہوں کہ اسلام اور پیروانِ اسلام دو مختلف چیزیں ہیں۔ اور دونوں کو خلط نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن اس کے باوجود میرے لئے یہ چیز معمہ بن چکی ہے کہ اتنی اچھی تعلیم کے ہوتے ہوئے مسلمانوں کی حالت ہر لحاظ سے اس قدر پست ہے اور کیوں۔ تہذیب و تمدن اقتصادی مرفہ الحالی، خدمتِ علم و سائنس، وراثت فی الارض، انسانیت اور اس کے جملہ خصائص، انفرادی اور اجتماعی، ان سب چیزوں میں مسلمان سب قوموں سے پیچھے ہیں۔ اور بظاہر کوئی صورت اصلاحِ حال کی دکھائی نہیں دیتی۔ مغربی ممالک کی نظروں میں مسلمان محض ایک مذاق بن کے رہ گئے ہیں۔ اس کے برخلاف دوسری اقوام کو دیکھا جائے تو وہ ہر چیز میں ہم سے پیش پیش ہیں۔ خدمتِ خلق، راستبازی، بلند اخلاق ان چیزوں کا عیسائی اقوام

مکتوب ڈاکٹر محمد نظام الدین صاحب ڈائرکٹر دائرۃ المعارف العثمانیہ۔ حیدرآباد

۲۳۔ اگست ۱۹۵۶ء

معظمی و محترمی

تسلیم۔ آپ کے الطاف نامہ مورخہ ۱۴۔ اگست کا بے حد مشکور ہوں۔ حضرت مولانا کی خدمت میں تمام علمی دنیا اور خصوصاً دائرۃ المعارف کی جانب سے ہدیۂ تشکر پیش فرمائیے۔ اور عرض کیجئے کہ آپ کے عہد اور آپ کی سرپرستی میں جو کام ہو رہے ہیں وہ ابدالاباد تک زندہ رہیں گے۔ خدا تعالے آپ کو ان کا اجر دے گا اور یہ کارنامہ تاریخ ثقافت عالم میں زرّیں حروف سے لکھا جائے گا۔ دائرۃ المعارف کی سرپرستی درحقیقت ہمارے مشاہیر کی سچّی قدردانی ہے۔ کتاب الہند جس کا ملنا مشکل تھا وہ بھی حضرت مولانا کے فیض سے عالم تحقیقات کو مکرر دستیاب ہوجائے گی اور ہندوستان اور بیرونی کا نام پھر روشن ہوجائے گا۔ پہلے پروف مکرر ملفوف ہیں۔

میری شخصی استدعا مورخہ ۱۴۔ جون ۱۹۵۶ء کے متعلق کیا کارروائی عمل میں لائی گئی کچھ پتہ نہیں چلا۔ دو حرفی جواب سے سرفراز فرمایئے کیونکہ یہاں حالات بہت جلد تبدیل ہو رہے ہیں۔

منتظر کرم

محمد نظام الدین

جواب۔ کتاب الہند کی طباعت واشاعت یقیناً ایک علمی وثقافتی کارنامہ ہے — دائرۃ المعارف کی شہرت ہندوستان کی شہرت ہے۔ حیدرآباد کے پولیس ایکشن کے زمانے میں متعدد استفسارات بیرونِ ہند سے اس ادارہ کی سلامتی کے متعلق موصول ہوئے تھے۔ آپ کے ذاتی مسئلہ پر غور ہو رہا ہے۔

تذکرہ میں جو کیا ہے وہ تو مایوس کن نہیں۔ لیکن آخر امید کی کرن کب روشن ہوگی۔ ان امور کا جواب دیجئے اور ضرور وقت نکالیئے۔ میں پرانا نیازمند ہوں اور تسکینِ قلب کی تلاش میں ہوں۔

آپ کا ادنےٰ نیازمند

نور حسین

جواب۔ اسلام دینِ فطرت ہے یا نہیں اس کا فیصلہ صرف اس بات سے ہو سکتا ہے کہ خود اسلام کی تعلیم کو پرکھا جائے باقی رہی یہ بات کہ لوگوں میں بے عملی کیوں ہے اس کی ذمہ داری اسلام کی تعلیم پر نہیں ہو سکتی لوگوں کی بدعملی پر ہے۔ اس تیرہ سو برس کے اندر اس تعلیم کے جو نتائج نکلے وہ بھی ہمارے سامنے ہیں۔ اور اب لوگوں کی بدعملی کے نتائج بھی ہم دیکھ رہے ہیں۔

غلامی کے متعلق ایک استفتاء

راپچی، چرچ روڈ
۴۔ اگست

ذوالمجد والکرم حضرۃ مولانا محترم! ادام اللہ بقاءکم۔ السلام علیکم ورحمۃ اللہ برکاتہ' —— ایک مسئلہ کی تحقیق کے لئے بصورت تحریر حاضر خدمت ہوا ہوں آپ نے اپنے 'ترجمان القرآن' میں " ماملکت ایمانکم " کے لئے نکاح ضروری قرار دیا ہے اور بغیر نکاح وطی ناجائز ہے اور اس کی وضاحت آپ نے دوسرے حصہ سورۂ مومنون کے نوٹ کے اندر کی ہے کہ " قرآن کے نزدیک اتحادِ تناسلی کا جائز طریقہ صرف ایک ہی ہے اور وہ ازدواج کا طریقہ ہے۔ اس کے علاوہ جو طریقہ بھی اختیار کیا جائے گا ناجائز ہوگا خواہ کسی شکل اور کسی نوعیت کا ہو۔ " حالانکہ آیاتِ قرآنیہ سے اس کا صاف طور سے ثبوت نہیں ملتا ہے۔ ہاں، اس کا ثبوت ملتا ہے کہ جبکہ وہ لونڈی کسی دوسرے کی ملک میں ہو تو مالک سے اجازت لے کر اس کا نکاح کیا جائے گا جیسا کہ آیت شاہد ہے: 'فانکحوھن باذن اھلھن' اور دوسری آیت وانکحوا الایامیٰ منکم والصالحین من عبادکم وامائکم سے اس کا ثبوت ملتا ہے

کے اندر اس قدر دَور دورہ ہے کہ حیرانی ہوتی ہے۔ علم وفن کے ہر گوشے میں وہ ہم سے پیش پیش ہیں

اس سلسلے میں ایک چیز نے بظاہر میری رہنمائی ضرور کی ہے اور وہ یہ کہ جن جن تہذیبوں نے اس دنیا میں آج تک سر اُٹھایا مثلاً بابل وکلدانیوں کی تہذیب، ہندوستان میں آریاؤں کی تہذیب، مصریوں کا عروج وترقی، یونانی اور رومن تہذیبیں یہ سب اپنے اپنے زمانے میں انتہائی عروج پر پہنچیں اور پھر ان کا زوال ایسا آیا کہ پھر نہ اُبھریں۔ تو کیا فطرت کا یہ ازلی قانون تو نہیں کہ جو قوم یا تہذیب ایک انتہائی بلندی پر پہنچ جائے اس کی پستی لازمی اور یقینی ہے۔ اور پھر وہ نہیں اُبھرتی۔ بجز یہ کہیں اسلام کے ساتھ تو ایسا نہیں ہوا۔ ولن تجد لسنۃ اللہ تبدیلا کے ماتحت تو ایسا نہیں ہو رہا۔ لیکن قرآن حکیم میں بھی تو لکھا ہے کہ هُوَ الَّذِیٓ اَرۡسَلَ رَسُوۡلَهٗ بِالۡهُدٰی وَدِیۡنِ الۡحَقِّ لِیُظۡهِرَهٗ عَلَی الدِّیۡنِ کُلِّهٖ تو اس کے ماتحت اس دین کو سب پر غالب آنا چاہیئے لیکن ایسا نہیں ہو رہا۔

اگر بہ نظرِ غور دیکھا جائے تو صاف معلوم ہوگا کہ جو ذلیل اور پست حرکتیں ہیں وہ مسلمانوں کے اندر بدرجہ اتم موجود ہیں۔ حالیؔ مرحوم جس قدر برائیاں گن گئے تھے ان سے کئی گنا زیادہ اب موجود ہیں۔ آج کے مقابلے میں شاید وہ دَور بہتر تھا۔ شرافت، دیانت، تحمل، وسعتِ قلبی ایثار، رحم، سچائی، عدل وانصاف، ان سب خصائص سے ہمیں دُور کا بھی تعلق نہیں۔ نفرت، خود غرضی، ظلم، بددیانتی، تنگ نظری یہ سب ہمارا شیوہ بن چکی ہیں تو خدارا بتلایئے کہ ایسا کیوں ہے اور کیا کوئی اصلاحِ حال کی امید ہے۔

جو میرے ظنون وشبہات ہیں وہ یہ ہیں کہ قرآن وسنّت کے صحیح اور سیدھے راستے کی موجودگی میں مسلمانوں کی تمام عالمِ اسلام میں یہ حالت کیوں ہے۔ مشرقِ وسطیٰ کے اسلامی ممالک کی حالت شاید ہم سے بھی زیادہ زبوں ہے تو آخر ایسا کیوں ہے کیا نعوذ باللہ اسلامی تعلیم میں وہ دلکشی ختم ہو گئی اور محمد علی باب کے مطابق کہ ہر مذہب ایک ہزار سال کے بعد اپنی اصلی ماہیت کھو بیٹھتا ہے یہی اطلاق ہمارے اوپر تو نہیں۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی پیشین گوئیوں کا، کہ آپ نے

سرمد شہید کے متعلق استفسار

۴۸۶

لاہور

گرامی قدر جناب!

السلام علیکم۔ قافلے چلتے رہیں گے اور انسانی فکر میں بھی ترقی رونما ہوتی رہے گی اور چند ایسے انسان بھی قرطاس عالم پہ اُبھریں گے جو اوراقِ پارینہ سے زندگی حاصل کریں۔ مجھے بھی انھیں میں سے ایک فرض کر لیجئے۔

سرمد کی ذات، صفات اور ارشادات پر کچھ تحقیق کر رہا ہوں۔ آپ کی کتاب "خوانِ شہادت کے قطرے" نظر سے گزری تو دل نے کہا کہ آپ اس سلسلے میں میری معاونت کر سکیں گے۔ براہ کرم مجھے وہ کتب و رسائل تجویز فرما دیجئے جن کا مطالعہ مجھے منزلِ مطلوبہ تک لے جائے۔

آپ کی عدیم الفرصتی کے باوجود جواب ملنے کا یقین رکھتا ہوں۔ فقط

آپ کا خیر اندیش

کرم الہیٰ بیدل

جواب۔ فارسی شعراء کے جو تذکرے ہیں اکثر میں مختلف حال موجود ہے۔ ہندوستان کے تذکروں میں مراۃ الخیال میں کسی قدر تفصیل ملتی ہے۔ دبستانِ مذاہب میں بعض تفصیلات ملیں گی۔ نیز کتاب پیدائش کا فارسی ترجمہ بھی سرمد کی نگرانی میں ہوا۔

کہ جبکہ کسی کے پاس کوئی لونڈی ہو اور اس سے فائدہ نہ اُٹھا رہا ہو تو دوسرے سے اس کا نکاح کر دے۔

اور سورۂ مومنون میں " الا علیٰ ازواجہم اوما ملکت ایمانہم " سے تو صاف طور سے اس کا ثبوت ملتا ہے کہ بغیر نکاح لونڈی سے وطی کرنا جائز ہے کیونکہ یہ آیت ازواج اور ما ملکت ایمانہم کے حق وطی میں ظاہر ہے اس لئے کہ عقدِ مناکحت کے بعد ملکِ یمین بھی اندراج میں داخل ہے تو پھر دوبارہ ملکِ یمین کا تذکرہ کیوں ہوا۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ آزاد حرّہ بیوی اور لونڈی سے وطی جائز ہے۔ اس آیت کے علاوہ فتاویٰ عالمگیری وعزیزی و قاضیخان وغیرہ سے اس کا ثبوت ملتا ہے کہ ملکِ یمین سے بدون نکاح وطی جائز ہے اور اس دورِ حاضرہ میں حجاز کے بادشاہ سلطان ابنِ سعود کا بھی اسی پر عمل ہے اور ہمارے شہر کے علماء بھی قرآن و حدیث اور دلائلِ عقلیہ کی روشنی میں اسی کو ثابت کرتے ہیں کہ شرعی لونڈی سے بغیر نکاح وطی جائز ہے۔

اب میں حیران ہوں کہ صحیح مسئلہ کس کو سمجھوں۔ مہربانی فرما کر اس مسئلہ کی وضاحت قرآن، حدیث و واقعات کی روشنی میں فرما دیجئے تاکہ پیدا شدہ شکوک و شبہات رفع ہو جائیں۔

راقم نیازمند
محمد نعیم

جواب۔ مختلف موقعوں پر مختلف نوعیت کی تصریحات ہیں۔ لڑائی کے قیدیوں کی نسبت عام رواج یہ تھا کہ وہ لونڈی غلام بنائے جاتے تھے۔ اسلام نے ابتداء میں رحم و شفقت کے احکام دے کر اس رسم کے شدائد کو کم کیا اور پھر سورۂ محمدؐ کی آیت واِمّا منّاً اِمّا فداءً نازل کر کے اس رسم کو بھی بند کر دیا۔ البتہ اس سے پہلے جو لونڈیاں لوگوں کے تصرف میں آ چکی تھیں ان کے تعلق کو باطل نہیں کیا۔ سورۂ مومنوں میں اسی کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

نشیمن تلاش کر لیتی ہیں جیسے اٹلی میں لیونارڈو ڈی ونچی، جرمنی میں گوئٹے، امریکہ میں ابراہیم لنکن۔ ہندوستان میں ٹیگور، گاندھی اور مولانا آزاد اس ہندو مسلم تہذیب کا ایک شاہکار تھے جو گذشتہ ہزار برس میں پروان چڑھی ہے۔ انھوں نے مشرقی تہذیب اور علوم و فنون کے ماحول میں ابتدائی تربیت پائی، مذہب کو اپنی توجہ کا خاص مرکز بنایا اور اس طرح ان کی بہترین قدروں کو اپنی ذات میں جذب کیا۔ لیکن وہ اس پر قانع نہیں ہوئے۔ ان کی خلّاق طبیعت نے اس کے ساتھ ساتھ مغربی تہذیب کی بہترین قدروں کو بھی اس طرح اپنایا کہ ان کی ذات مشرق و مغرب کا ایک حسین سنگم بن گئی۔ اس میں ایک طرف مشرق کی سکون پسندی اور گہرائی، رواداری اور وضعداری، انسانیت اور روحانی بصیرت تھی اور دوسری طرف مغرب کی روشن خیالی، ذہنی جرأت، انسان دوستی عملیت اور عوام کی پاسداری کا جذبہ کارفرما تھا۔ اس طرح ان کی ذات ماضی اور حال کے درمیان مشرق اور مغرب کے درمیان ایک پُل کا کام کرتی تھی۔ وہ ایک زبردست عالم دین تھے لیکن مُلّا کی تنگ نظری سے آزاد۔ فلسفے میں گہری نظر رکھتے تھے لیکن کبھی اس کی سطحی موشگافیوں میں راستہ نہیں بھٹکے۔ ان کا مسلک گویا یہ تھا ؎

نہ فلسفی سے نہ مُلّا سے ہے غرض مجھ کو
یہ دل کی موت، وہ اندیشہ و نظر کا فساد!

ان کے نزدیک مذہب، فلسفہ، سائنس، سیاست سب کا ایک ہی مقصد تھا اور وہ یہ کہ انسان اپنی زندگی کو شرافت کے سانچے میں ڈھالے اور اس غرض کے لئے اپنی جسمانی، ذہنی اور روحانی قوتوں کو پورا فروغ دے۔ ان کی زندگی میں دین اور دنیا کی تفریق نہ تھی، دونوں میں حق پسندی اور شرافت کے اصولوں کی کارفرمائی تھی۔ وہ ایک پختہ کار اور بیدار مغز سیاست داں تھے لیکن ان تمام ریشہ دوانیوں اور گھٹیا چالوں سے بلند، جن کے ذریعہ بہت سے سیاست کا کھیل کھیلنے والے اپنی قوت اور اثر کو بڑھانے کی کوشش کرتے ہیں۔ انھوں نے اپنی قوم اور ملک کے دل میں اپنی جگہ پیدا کی تھی لیکن اس کے لئے کبھی اشتہار بازی کے طریقوں سے کام نہیں لیا۔ وہ کبھی عوام کی سطح پر نہیں اترے، بلکہ محبت اور سمجھداری کے ساتھ انھیں اپنی سطح پر لانے کی کوشش کی اور جب

خواجہ غلام السیدین

مولانا ابوالکلام آزاد

ایک روشن دماغ تھا نہ رہا ملک میں اک چراغ تھا نہ رہا

مولانا آزاد کا ذکر کن لفظوں میں کروں اور جذبات کی یورش کو کس طرح دماغ کا تابع بناؤں؟ ان کی عظمت کا صحیح اندازہ تو اس وقت ہوگا جب وقت تاریخ کی سخت گیر کسوٹی پر ان کے ہم عصر مشاہیر کی شخصیت اور ان کے کارناموں کو پرکھے گا۔ ہم لوگ جو پہاڑ کے دامن میں اپنی زندگی گزارتے رہے ہیں کیا اندازہ کر سکتے ہیں اس کی بلندی کا، اس کی برف پوش چوٹیوں کا جن پر سکون کی ایک ابدی کیفیت چھائی معلوم ہوتی ہے، اس کے دل کی شورشوں کا جس میں لاوا کھولتا رہتا ہے، ان طوفانوں کی یورش اور بجلیوں کی تڑپ کا جو اس کی آغوش میں پلتی ہیں یا جواہرات کے ان خزانوں کا جو اس کے سینے میں پوشیدہ ہیں؟ اس مختصر مضمون میں تو بس اتنا ہی کر سکتا ہوں کہ ان کی عصر آفریں شخصیت کے چند نمایاں پہلوؤں کی طرف اشارہ کردوں۔

ہر بڑی تہذیب صدیوں وقت کی گود میں پل کر اپنے کمال کو پہنچتی ہے اور اپنی خاص قدریں خاص اصول اور نیک و بد کے خاص سانچے ڈھالتی ہے۔ ہندوستان کی تہذیب بہت سی مختلف تہذیبوں کا سنگم ہے جس کے بنانے میں مختلف قوموں نسلوں، زبانوں اور مذہبوں نے حصہ لیا ہے۔ اور اس کا ٹوٹ سلسلہ ہزاروں برس سے قائم ہے۔ قدرت کی فیاضی سے تاریخ میں کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک تہذیب کی تمام یا بہت سی اچھی قدریں کسی غیر معمولی شخصیت میں اپنا

پورا بھروسا تھا اور وہ جانتے تھے کہ مولانا ان کے جائز حقوق کی حمایت کریں گے۔ میں نے ان کی زبان سے کسی شخص کی بُرائی میں سخت سے سخت لفظ یہ سنا کہ فلاں "چھوٹے دل اور دماغ کا آدمی ہے" یعنی ان کی ترازو میں دل اور دماغ کی تنگی انسان کی سب سے بڑی محرومی اور ذلت تھی!

انھوں نے جنگِ آزادی کے زمانے میں اس تحریک کی سرداری کی اور قید و بند کی مصیبتوں اور قربانی اور ایثار کی آزمائشوں کو شہد کا گھونٹ بنا کر پیا۔ لیکن جب آزادی حاصل ہوئی تو انھوں نے اپنی ساری قوت اور توجہ اس بات پر وقف کر دی کہ قومی زندگی صالح بنیادوں پر قائم ہو۔ جب کبھی کوئی ایسا نازک موقع یا مشکل مقام آیا جہاں یہ اندیشہ ہو کہ شاید مصلحت کی کشش انصاف اور دیانتداری پر غالب آ جائے تو ان کی اصول پرستی، جرأت اور حق گوئی نے سدِ سکندری کا کام دیا اور مصلحت پرستی کو پسپا ہونا پڑا۔ اسی وجہ سے حق شناسوں نے ان کو "قوم کے ضمیر" کا خطاب دیا تھا یعنی اس میدان میں انھوں نے اس فرض کے بار کو اُٹھایا تھا جو گاندھی جی انجام دیتے تھے۔ ناواقف لوگ ان کو عام جلسوں یا سرکاری تقریبوں اور دعوتوں میں دیکھتے تو خیال کرتے کہ شاید مولانا آزاد اب سیاست کے مرکز سے دور ہو گئے ہیں لیکن انھیں یہ معلوم نہیں کہ ہر مقام اور زمانے کے اپنے آداب ہوتے ہیں۔ جب کانگرس آزادی کی جنگ کر رہی تھی مولانا اس کے ایک ممتاز رکن اور صدر کی حیثیت سے طوفان کے مرکز میں رہے۔ آزادی کے بعد انھوں نے اپنے لئے ایک دوسری شاہراہِ عمل معین کر لی تھی جس پر چل کر وہ ملک کی خدمت اور رہنمائی کر سکتے تھے۔ بے شک اب وہ ایک لحاظ سے گوشہ نشین تھے۔ لوگوں سے کم ملتے جلتے تھے لیکن ان کی انگلیاں قوم کی نبض پر تھیں اور وہ جانتے تھے کہ کیا کرنا ہے اور کیا کرنا چاہیئے۔ اس زمانے میں ان کی شان یہ تھی ؎

مثلِ خورشیدِ سحر فکر کی تابانی میں
شمعِ محفل کی طرح سب سے جدا سب کا رفیق

اور سب کی رفاقت کا ثبوت یہ ہے کہ جب ان کے بنانے والے نے ان کو یاد کیا اور وہ اس کا نام لیتے لیتے اس کے حضور میں پہنچ گئے تو نہ صرف لاکھوں دلی والوں کی، بلکہ کروڑوں ہندوستانیوں کی عقیدت اور محبت، صبر اور ضبط کے بندھن توڑ کر امنڈ پڑی اور باہمی فرقوں

کبھی وہ راستے سے بھٹکے اور مولانا کی طرف سے انھوں نے بدگمانی یا روگردانی کی، مولانا صراطِ مستقیم پر چلتے رہے اور علمی اور ہدایت کے فرض کو یکسوئی اور دل سوزی کے ساتھ سرانجام دیتے رہے۔ سیاست کے طوفان آئے، زلزلوں نے پہاڑوں کے ثبات قدم کو لڑکھڑایا لیکن یہ مردِ مجاہد، یہ کوہِ وقار مومن اپنی جگہ پر، اپنے اصولوں پر، اپنی رائے پر مضبوطی کے ساتھ قائم رہا اس شان کے ساتھ کہ نہ ستائش کی تمنا نہ صلے کی پروا، نہ مخالفوں اور بدنیا طنوں کی ملامت کا خوف اور شکوہ۔ ان کی دریدہ دہنی اور بدزبانی کو اس طرح برداشت کیا کہ پیشانی پر بل تک نہ آیا۔ زیادہ سے زیادہ کہا تو اتنا کہا کہ "یہ کیسے عاقبت ناشناس ہیں!" یعنی نہیں جانتے انہیں سمجھتے کہ ان کی حرکتوں کا کیا نتیجہ ہونے والا ہے۔ ان کے دل میں کینہ کے لئے جگہ ہی نہ تھی۔ انھوں نے کسی جگہ ظہوری کا ایک شعر نقل کیا ہے جو اُن کے قلبِ صافی کا نقشہ بھی کھینچتا ہے:

پُر است سینۂ ظہوری پر از محبت یار ۔۔۔ برائے کینۂ اغیار در دلم جا نیست

ان کا پیغام قوم کے لئے یہی تھا کہ نیکی اور شرافت کا ساتھ دو اور برائی اور بے انصافی کے ساتھ رشتہ نہ جوڑو۔ خدا کی رسی کو جو حق اور صداقت کی رسی ہے، جو حقیقت کا راستہ ہے مضبوطی کے ساتھ پکڑو۔ اور خود انھوں نے عمر بھر کبھی اس حبل المتین کو، اس مضبوط رسی کو ہاتھ سے نہیں چھوڑا۔ کبھی غلطی اور بے انصافی میں "اپنوں" کا ساتھ نہیں دیا۔ کبھی صحیح اور سچی بات میں "غیروں" سے پہلو تہی نہیں کی۔ ان کے لئے "اپنے" وہی تھے جو اُن کے اصولوں سے متفق ہوں اور "غیر" وہ جو ان اصولوں کی مخالفت کریں۔

قدرت نے انھیں ایسا روشن دماغ دیا تھا کہ وہ ہر مشکل سیاسی مسئلے کی گتھیوں کو سلجھا دیتے تھے اور ان کا ناخنِ تدبیر کامیابی کا راستہ کھول دیتا تھا۔ یہی حال دفتر کے کاموں کا تھا۔ ہم لوگ معاملے کی جزئیات میں اُلجھتے، موافق اور مخالف دلیلوں کا فریب کھاتے لیکن ان کی نظر تفصیلات کو چیرتی ہوئی نفسِ معاملہ تک پہنچ جاتی اور وہ واضح اور محکم فیصلہ صادر کر دیتے۔ ان کا دل اتنا فراخ تھا کہ اس میں کسی قسم کے تعصب یا تنگ نظری کو بار حاصل نہ تھا۔ اس کے سارے ایوان انصاف پسندی اور انسان دوستی سے معمور تھے۔ اسی وجہ سے ان پر تمام اقلیتوں کو پورا

چل کر علم اور دینی ہدایت حاصل کرنے آیا تھا:

"غالباً دسمبر ۱۹۱۸ کا واقعہ ہے کہ میں رانچی میں نظر بند تھا۔ عشاء کی نماز سے فارغ ہو کر مسجد سے نکلا تو مجھے محسوس ہوا کوئی شخص پیچھے آرہا ہے۔ مڑ کے دیکھا تو ایک شخص کمبل اوڑھے تھا۔

"آپ مجھ سے کچھ کہنا چاہتے ہیں؟"

"ہاں جناب، میں بہت دور سے آیا ہوں۔"

"کہاں سے؟"

"سرحد پار سے۔"

"یہاں کب پہنچے؟"

"آج شام کو پہنچا۔ میں بہت غریب آدمی ہوں۔ قندھار سے پیدل چل کر کوئٹہ پہنچا۔ وہاں چند ہم وطن سوداگر مل گئے تھے انھوں نے نوکر رکھ لیا اور آگرہ پہنچا دیا۔ آگرے سے یہاں تک پیدل چل کر آیا ہوں۔"

"افسوس، تم نے اتنی مصیبت کیوں برداشت کی؟"

"اس لئے کہ آپ سے قرآن مجید کے بعض مقامات سمجھ لوں۔ میں نے الہلال اور البلاغ کا ایک ایک حرف پڑھا ہے۔"

یہ شخص چند دنوں تک ٹھہرا اور پھر یکایک واپس چلا گیا۔ وہ چلتے وقت اس لئے نہیں ملا کہ اسے اندیشہ تھا میں اسے واپسی کے مصارف کے لئے روپیہ دوں گا اور وہ نہیں چاہتا تھا کہ اس کا بار مجھ پر ڈالے! اس نے یقیناً واپسی میں بھی مسافت کا بڑا حصہ پیدل طے کیا ہوگا۔

مجھے اس کا نام یاد نہیں۔ مجھے یہ بھی نہیں معلوم کہ وہ زندہ ہے یا نہیں لیکن اگر میرے حافظے نے کوتاہی نہ کی ہوتی تو میں یہ کتاب اس کے نام سے منسوب کرتا۔"

اور اخلاقوں کو بھول کر سب نے ان کی خاموشی اور بے لوث خدمت کا اعتراف کیا۔ میں نے اس جمِ غفیر میں جو ۲۲۔ فروری کو ان کے مکان کے گرد جمع تھا ایک بوڑھے سکھ کو یہ کہتے سنا "ارے تمھیں کیا معلوم ہے آزاد نے تو بادشاہت کی ہے بادشاہت۔" ایک معنی میں یہ بالکل سچ ہے۔ وہ دل اور دماغ کے بادشاہ بھی تھے اور حکومت کی پالیسی کے بنانے اور ڈھالنے میں ان کا جو حصہ تھا اور ان کے ساتھی ان کی رائے اور فیصلوں کی جو قدر کرتے تھے اس کے پیشِ نظر اس بوڑھے کا یہ قول ٹھیک معلوم ہوتا ہے۔

لیکن یہ بادشاہ جس میں ایک طرف انتہائی خودداری اور خودی کا احساس تھا جو کبھی کسی قوت کے سامنے سر نہ جھکاتا تھا، ایک فقیر بھی تھا۔ فقیر اقبالؔ کی اصطلاح میں، یعنی

دارا و سکندر سے وہ مردِ فقیر اولیٰ ہو جس کی فقیری میں بوئے اسد اللہی

اسی وجہ سے اس کے ہاں فقر و شاہی کے ڈانڈے مل جاتے تھے اور دل پکار اٹھتا تھا۔

نہ تخت و تاج میں نے لشکر و سپاہ میں ہے جو بات مردِ قلندر کی بارگاہ میں ہے

اس فقیر کے پاس متاعِ دنیا میں سے بہت کم تھا۔ نہ مال نہ دولت، نہ جائداد، نہ سرمایہ نہ خانگی زندگی کی وہ پابندیاں جو دل میں کمزوریاں پیدا کرتی ہیں۔ اس میں بے نیازی کی ایک خاص شان تھی اور نام و نمود اور شہرت پسندی سے نفرت۔ کبھی کسی انجمن، کسی درس گاہ، کسی عمارت کو اپنے نام سے منسوب نہیں ہونے دیا۔ شاید ایک دفعہ کے سوا کسی یونی ورسٹی کی اعزازی ڈگری قبول نہیں کی۔ تاریخ پیدائش تک پوشیدہ رکھی کہ دوست اور عقیدت مند اس کو منانے نہ لگیں۔

مولانا آزاد نے جہاں ایک شاہانہ شخصیت اور اندازِ فکر و عمل پایا تھا وہاں ان کے دل میں عام لوگوں، غریبوں اور سماج کے ستائے ہوئے طبقوں کے لئے خاص ہمدردی اور گداز تھا جس کے افسانے زبانِ خلق مدتوں تک سنائے گی لیکن اس کی ایک انوکھی جھلک آپ کو اس انتساب میں دکھائی دے گی جو انھوں نے ۱۹۳۱ء میں اپنے علمی اور مذہبی شاہکار "ترجمان القرآن" کے لئے لکھا تھا۔ اس زبردست تصنیف کو انھوں نے نہ کسی رئیس کے نام منسوب کیا نہ عالم کے نہ کسی دوست کے نہ عزیز کے بلکہ ایک غریب گمنام اجنبی کے نام جو اُن کے پاس ایک دوسرے دیس سے سینکڑوں

رحلت کی تاریخ تری نکلی منہ سے فغاں بن کر
دل پہ آئی ہجوم یاس تیرے غم میں ہے آزاد!
۱۹   ء   ۵۸

اتنے میں محسوس ہوا جیسے کوئی کہتا ہے
دل کی آنکھیں کھول کے دیکھو اب بھی ہم میں ہے آزاد!
روح فکر و عمل اس کی سارے جہاں میں ساری ہے
شرق و غرب میں ہے آزاد، دیر و حرم میں ہے آزاد!
یہ تو تھی جگ بیتی، آپ بیتی کوئی کیونکر سنائے سوائے اس کے
گفتنی نیست کہ بر غالب ناشاد چہ رفت   می تواں گفت کہ ایں بندہ خداوند نداشت

سرفراز حسین رضوی خبیر لکھنوی

قطعۂ تاریخ وفات حسرت آیات مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم

ہوا غروب وہ مہر کمال علم و ادب
قمر ہلال کی صورت تھا جس کا حلقہ بگوش
بلند جس نے کیا تھا نشان آزادی
عمل میں گاندھی و نہرو کے تھا جو دوش بدوش
بنایا ملک کو آزاد تھا جو نام آزاد
جگا چکا جو ہمیں، سو گیا وہ صاحب ہوش
بساط علم و فراست پہ اہل بست و کشاد
تھے اس کے سامنے شاگردین کے حلقہ بگوش
نہاں تھے للکھ تکلم سکوت میں اس کے
بتائے مشک کی خوشبو نہ جیسے مشک فروش
وہ سو رہا ہے بظاہر فنا کے دامن میں
پر اس کا نام بقا سے رہے گا ہم آغوش
زبان موجۂ سیلاب تھی دم تقریر
کہ جس طرح ہو سمندر میں وقت طوفاں جوش
جہان علم و ادب میں جو چھایا سناٹا
تو آئی غیب کی جانب سے یہ ندائے سروش

خبیر مصرع تاریخ لکھو ہجری میں
اداس اداس ہے مجمع ابوالکلام خموش
۱۳۷۷ ھ

کیسا شاندار اور اثر آفریں اعتراف ہے طلبِ صادق کا، علم کی پیاس کا، مذہب کی سچی لگن کا، خواہ وہ ایک بوسیدہ کمبل ہی میں ملبوس ہو۔

اس مردِ مومن کی زندگی میں خدا کی فیاضی کی ایک عجیب شان نظر آتی ہے۔ اسے قدرت نے کیا کچھ نہیں دیا۔ وجاہتِ ظاہری جو اس کو لاکھوں میں ممتاز بناتی تھی، دماغ کی تابانی جو فکر و عمل کے تاریک گوشوں کو منور کرتی تھی، دل کی فراخی جس میں تعصب کے سوا سب کے لئے جگہ تھی، علم کی وہ فراوانی کہ حسدوں کا پتہ نہ چلے، تحریر و تقریر کا وہ کمال جو اس کی زندگی ہی میں فسانہ بن گیا۔ زبان کو اس نے ایک نئی قدرت اور نیا انداز بخشا اور لفظوں سے کام لیا شعلہ اور شبنم کا، رزم اور بزم کا، پھول اور تلوار کا۔ مذہب میں اس کی وہ نظر تھی کہ اس کے آئینے میں دین اور دنیا دونوں کی واضح تصویر نظر آتی تھی اور فکرِ حاضر سے ایسی واقفیت کہ مغرب کے عالم بھی اس کا لوہا مانتے تھے ــــ یہ تھے مولانا آزاد ـــ ایسا دوسرا کہاں سے آئے گا؟

ملک یکسر ہُوا ہے بے آئیں	اک فلاطوں نہیں جو یوناں میں
ختم تھی اک زباں پہ شیرینی	ڈھونڈتے کیا ہو سیلِ تاں میں
لب جادو بیاں ہُوا خاموش	گوشِ گل وا ہے کیوں گلستاں میں
وہ گیا جس سے بزم روشن تھی	شمع جلتی ہے کیوں شبستاں میں

آخر میں ایک قطعۂ تاریخ سُن لیجئے جو ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب نے مولانا کی وفات پر لکھا ہے اور جس کے آخری شعر میں امید کا وہ پیغام ہے جو دُکھ اور مایوسی کی موجودہ کیفیت میں ہماری ہمت بندھاتا ہے۔

کل تک ہم سب ہند کے خادم خوش ہو ہو کر کہتے تھے
ہم کیوں دیش کی فکر کریں جب تک ہم میں ہے آزاد!
آج بچھڑ کر تجھ سے ہم تو سر کو پکڑ کر رو دیتے ہیں
اور تو سب فکروں سے چھٹ کر باغِ ارم میں ہے آزاد!

سول ملٹری ہوٹل اس زمانے میں لکھنؤ کا بہترین فیشن ایبل ہوٹل تھا جو مغربی انداز پر ایک یوروپین مہتمم کی نگرانی میں چل رہا تھا۔ مولانا اور سول ملٹری ہوٹل! یہ ایک اجتماعِ نقیضین سا معلوم ہوتا تھا۔ مولانا عبدالماجد دریابادی میرے ہم مکتب تھے اور مولانا ابوالکلام آزاد سے پہلے سے رسم وراہ رکھتے تھے۔ چناں چہ میں نے انھیں کو اپنے تعارف کا واسطہ بنایا۔ ہم دونوں جب اس کمرے کے برآمدے میں پہنچے جس میں مولانا مقیم تھے تو کمرے کے اندر سے میں نے ایک کلین شیو، نوجوان کو برآمد ہوتے دیکھا۔ مولانا عبدالماجد نے میرا تعارف کرایا۔ میرے ذہن میں مولانا آزاد کا جو تصور تھا اس پر یہ دوسری ضرب تھی۔ یعنی یہ کہ وہ کم وبیش ہم لوگوں کے ہم عمر ہی تھے اور ابھی ڈاڑھی مونچھ ان کے چہرے پر برآمد ہی نہیں ہوئی تھی۔ مولانا ہم لوگوں کو اپنے کمرے میں لے گئے اور چاء کے ساتھ اپنے حسنِ تقریر سے جو ہم لوگوں کی ضیافت کی اس کا ذائقہ حافظہ میں اب تک محفوظ ہے۔ واقعاتِ حاضرہ پر ہر خیال کے اظہار کے لئے بہتر سے بہتر الفاظ و فقرات کا انتخاب، برجستہ، مناسب حال اشعار کا استعمال! غرضیکہ وہ کالج کے دو نوجوانوں کے ساتھ معمولی بات چیت نہ تھی بلکہ ادبیاتِ عالیہ کا ایک کلاسیکل نمونہ تھا۔ اس قدر بے پناہ قوتِ بیان کا مظاہرہ دیکھنے کا اتفاق مجھے اس سے پہلے کبھی نہیں ہوا تھا۔

مشہور عالم اطالوی فلسفی کروچے نے اپنے 'جمالیات' میں ماہرِ فن کے کمال کا پیمانہ قوتِ اظہار ہی کو قرار دیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ بڑے سے بڑے مدعیانِ فن کے حواس اس وقت دنگ ہو جاتے ہیں جب وہ اپنے کمال کے اظہار پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ کروچے کا کہنا ہے کہ کسی مدعیِ فن کے امتحان کا سیدھا سادا طریقہ یہ ہے کہ اس سے کہئے کہ ذرا اس گیت کے دو بول تو گا دیجئے یا یہ پنسل حاضر ہے اس سے کوئی نقش کھینچ کر اپنے وارداتِ قلب کا ذرا اظہار تو فرما دیجئے۔ قوتِ اظہار کی اس جانچ سے ذرا کی ذرا میں ان کے کمال کی پول کھل جائے گی اور معلوم ہو جائے گا کہ وہ کتنے پانی میں ہیں۔

<u>قوتِ گویائی</u> | مولانا کی قوتِ اظہار و بیان کے نمونے ان کی ہر تحریر میں قدم قدم پر بغیر کسی تجسس کے ملتے ہیں چناں چہ 'تذکرہ' کے چند ورق الٹتے ہی مولانا کی یہ تحریر سامنے آجاتی ہے

ظفر حسین خاں

ابوالکلام بہ حیثیت انشا پرداز

مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم کی شخصیت اپنی جگہ ایک انجمن تھی۔ وہ ایک بڑے مقرر بھی تھے اور انشا پرداز بھی، مفکر بھی تھے اور مدبر بھی۔ لیکن غور کیجئے تو ان کی شخصیت کا مایۂ خمیر ادب ہی تھا اور وہی ان کے مشاغل کے مختلف میدانوں میں مختلف شکلوں میں ظاہر ہوتا تھا۔ ان کی سیاسی تقریریں اعلیٰ ادب کی بہترین مثالیں ہیں۔ ان کے فلسفیانہ افکار صاف اور ستھرے ادبی پیرایۂ بیان سے آراستہ ہیں۔ وہ مشکل سے مشکل مسائل کو ایسا سریع الفہم بنا دیتے ہیں کہ معمولی سمجھ کے آدمی کو بھی غلط فہمی کا امکان نہیں رہتا۔ اسے ادبی اعجاز نہیں تو کیا کہئے؟ مولانا سیاسیات میں بھی ادبی دروازے سے داخل ہوئے۔ الہلال اور البلاغ بہترین سیاسی رسالوں سے پہلے بہترین ادب پارے تھے جنھوں نے جمہور کے دل میں جگہ کر کے مولانا کو لیڈروں کی صفِ اول میں کھڑا کر دیا۔ غرضیکہ ہر شعبۂ حیات میں مولانا کی عظمت ان کی انشا پردازی کی رہینِ منت ہے اور یہی کہنا چاہیئے ان کا اصلی جوہر ہے۔

راقم الحروف کو مولانا کی خدمت میں شرفِ نیاز سب سے پہلی بار ۱۹۱۰ء میں حاصل ہوا۔ میرا طالب علمی کا زمانہ تھا اور مولانا کی تحریروں سے زبان آشنا تھی۔ ان سے ملنے کا کمال اشتیاق تھا کہ سنا مولانا لکھنؤ آئے ہیں اور سول ملٹری ہوٹل میں قیام ہے۔

یا پھر کمال ایجاز کے ساتھ ایک اہم حقیقت کا اظہار ان چند لفظوں میں سُن لیجئے :۔

" غور کیجئے تو انسان کی زندگی اور اس کے احساسات کا بھی کچھ عجب حال ہے۔
تین برس کی مدت ہو یا تین دن کی۔ مگر جب گزرنے پر آتی ہے تو گزر ہی جاتی ہے۔
گزرنے سے پہلے سوچیئے تو حیرانی ہوتی ہے کہ یہ پہاڑ سی مدت کیوں کر کٹے گی؟ گذرنے
کے بعد سوچیئے تو تعجب ہوتا ہے کہ جو کچھ گذر چکا وہ چند لمحوں سے زیادہ نہ تھا۔"

(غبارِ خاطر ص ۷۹)

زبان دانی جرمنی کے مشہور عالم، شاعر و ادیب، گوئٹے کا قول ہے کہ اگر انسان دوسری زبان نہ جانتا ہو تو وہ اپنی مادری زبان کو بھی سلیقے سے استعمال نہیں کر سکتا۔ ہوسکتا ہے کہ مولانا کی اس حیرت انگیز قوتِ گویائی کا باعث ان کی متعدد زبانوں سے واقفیت ہو۔ عربی اور فارسی ادب پر تو ان کو عبور حاصل تھا ہی، وہ فرانسیسی اور انگریزی زبان بھی خوب جانتے تھے اور آخر الذکر دونوں زبانوں کی کلاسکی کتابیں اکثر ان کے زیرِ مطالعہ دیکھی گئی ہیں۔ پھر قدرت سے حافظہ ایسا زبردست پایا تھا کہ ایک بار جو پڑھ لیا پتھر کی لکیر ہو گئی۔ مولانا کو عربی، فارسی، اردو کے ہزاروں شعر ازبر تھے۔ غبارِ خاطر میں فرماتے ہیں :۔

" معلوم نہیں ایک خاص طرح کے ذہنی واردہ کی حالت کا آپ کو تجربہ
ہوا ہے یا نہیں ؟ بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ کوئی بات برسوں تک حافظہ میں
تازہ نہیں ہوتی گویا کسی کونے میں سو رہی ہے۔ پھر کسی وقت اچانک اس طرح
جاگ اٹھے گی جیسے اسی وقت دماغ نے کواڑ کھول کر اندر لے لیا ہو۔ اشعار و مطالب
کی یاداشت میں اس طرح کے واردات اکثر پیش آتے رہتے ہیں۔ تیس چالیس
برس پیشتر کے مطالعہ کے نقوش کبھی اچانک اس طرح اُبھر آئیں گے کہ معلوم
ہوگا ابھی ابھی کتاب دیکھ کر اُٹھا ہوں۔ مضمون کے ساتھ کتاب یاد آجاتی ہے
کتاب کے ساتھ جلد، جلد کے ساتھ صفحہ اور صفحہ کے ساتھ یہ یقین کہ مضمون
ابتدائی سطروں میں تھا یا درمیانی سطروں میں یا آخری سطروں میں ; نیز صفحہ

" وہی دنیا جس کی میکدہ فراموشی نے غفلت کے جام انڈھائے تھے اپنے ہر جلوہ سے آنکھوں کو، اپنے ہر نغمہ سے کانوں کو سرمستی و سرشاری کی پیہم دعوتیں دی تھیں اب اس کا کونہ کونہ، چپہ چپہ ہشیاری و بینش کا مرقع تھا۔ بصیرت و موقت کا درس تھا۔ ذرّے ذرّے کو گرم گفتار پایا، پتہ پتہ کو مکتوب مسطور دیکھا، پھولوں نے زبان کھولی۔ پتھروں نے اُٹھ اُٹھ کر اشارے کئے۔ خاکِ پامال نے اڑ اڑ کر گہر افشانیاں کیں، آسمانوں کو یا رہا اتر تا پڑا تا کہ سوالوں کا جواب دیں زمین کو کتنی ہی مرتبہ اُچھالنا پڑا کہ فضاء آسمانی کے تارے توڑ لائیں فرشتوں نے بازو تھامے کہ کہیں لغزش نہ ہو جائے، سورج چراغ لے کر آیا کہیں ٹھوکر نہ لگ جائے، سب نے نقاب اتار دیئے، سارے پردے چلتی ہو گئے۔ سب کی ابروؤں میں اشارے تھے۔ سب کی آنکھوں میں حکایتیں بھری تھیں، سب کے ہاتھ بخشش و قبولیت کے لئے دراز تھے؛ بادل کو بچھڑا تو سازِ ہستی کا طنبورہ نکلا، بجلی کو پاس بلایا تو لب ہائے راز کا تبسم آشکارا نکلی ہوا کے جھونکے مٹھیوں میں آ گئے مگر پھر بھی خالی رہیں۔ سمندر نے اپنی ساری موجیں خرچ کر دیں مگر پھر بھی ہمارے ہاتھ کا پیالہ نہ بھرا........ غرضیکہ ہمّتِ خوابیدہ جاگ اُٹھی اور دلِ رفتہ پھر نئی نئی طاقتوں اور نئے نئے سامانوں کے ساتھ واپس آ گیا۔ عالمِ آفاق و انفس میں جو کچھ ہے ان میں سے کوئی نہ تھا جس کے ابرو پر گرہ یا آنکھوں میں غمزہ ہو۔ سب کی زبانیں گویا، سب کے اشارے آشکارا، سب کی سطریں اُبھری ہوئی تھیں، نہ کوئی لب بند رہا نہ کوئی جلوہ مستور، نہ آنکھوں نے دیکھنے میں کمی کی، نہ کانوں نے سننے میں، چشم و گوش نے جو کچھ بہم پہنچایا دل کی وسعت نے سب کو سمیٹ لیا۔ اس سے زیادہ اور کیا کہا جائے

سخنِ عشق بدل ورنہ و لب را مکشا   سرِ ایں شیشہ فرو بند کہ بادہ نہ خورد "

(ص ۳۰۳)

منتظر رہا کریں گے اور جمعہ کے دن خطیب منبر کے سامنے ہمہ تن انتظار ہو کر کھڑا رہے گا کہ شملہ سے تار آ جائے تو خطبہ پڑھنے کے لئے آمادہ ہو ....."

(الہلال ۶- نومبر ۱۹۱۴ء)

مولانا کی انشاپردازی کے اجزاء ترکیبی، استعارہ، تشبیہہ، تضاد | مولانا کے کمالِ انشاپردازی کا اصلی میدان ادب لطیف ہے جس کے جوہر تازہ استعاروں، بولتی ہوئی تشبیہوں کے ساتھ چھپتے ہوئے تضادات بھی ہیں جو ان کی نوشتہ جات میں بکھرے ہوئے پائے جاتے ہیں - ایک تضاد کی مثال ملاحظہ فرمایئے! استعارات و تشبیہات تو انھیں اقتباسات میں آپ نے دیکھے :-

"ہمارے تعلیم یافتہ دوستوں کا کچھ عجب حال ہے - ان کے پاؤں کو دیکھئے تو یورپ کی ناعاقبت اندیشانہ تقلید و عبودیتِ فکر کی زنجیریں پیٹی نظر آتی ہیں - مگر چہرے کی طرف نظر اٹھایئے تو زبان کو ادعاء اجتہاد سے فرصت نہیں - اس سے بڑھ کر دنیا میں جمع اضداد کا اور کون سا تماشا ہو سکتا ہے کہ ایک شخص آپ کے سامنے آئے اور عین اس وقت جب کہ اس کے پاؤں میں تقلید و استعباد کی زنجیریں پازیب کی طرح صدا دے رہی ہوں - اجتہادِ فکر اور حریتِ رائے پر بے تکان لکچر دینا شروع کر دے -" (الہلال ۱۷ ستمبر ۱۹۱۳ء)

ٹھیٹ ہندی کے الفاظ

چُست فارسی ترکیبوں کے ساتھ مولانا اکثر ٹھیٹ ہندی الفاظ استعمال کرتے ہیں جو ایک خاص لطف دیتے ہیں - مثلاً :-

"گو اس کی گرفتاری بھی گرفتاری اور اس کا اٹکاؤ بھی اٹکاؤ ہے"

"جس کو کیسی کیسی تمناؤں اور چاہتوں سے ہمیشہ سینے میں بچائے رکھا تھا کہ کہیں ناسور سینہ کی جگہ مندمل نہ ہو جائے -"

"الغرض توفیقِ الٰہی کی سینکڑوں راہیں ہیں - ہدایت و تربیتِ غیبی کے ہزاروں بھیس ہیں"

"دل کی ٹیس اور ٹیک" وغیرہ وغیرہ

کہ داہنی طرف کا تھا یا بائیں طرف کا۔ ابھی تھوڑی دیر ہوئی حسب معمول سو کر اُٹھا تو بغیر کسی ظاہری مناسبت اور تحریک کے یہ شعر خود بخود زبان پر طاری تھا۔

گوئی ثمر بیشتر از باغِ وجودم　　کم لذتم و قیمتم افزوں ز شمار است

ساتھ ہی یاد آ گیا کہ شعر حکیم صدرائے شیرازی کا ہے جو اواخر عہد اکبری میں ہندوستان آیا اور شاہ جہاں کے عہد تک زندہ رہا اور آفتاب عالم تاب میں نظر سے گزرا تھا۔ غالباً بائیں طرف کے صفحہ میں اور صفحہ کی ابتدائی سطروں میں۔ آفتاب عالم تاب دیکھے ہوئے کم سے کم تیس برس ہو گئے ہوں گے۔ پھر اتفاق نہیں ہوا کہ اسے کھولا ہو۔" (ص ۱۰۹ تا ۱۱۰)

اسالیب بیان اسی طرح مشرقی اور مغربی فلسفہ کے مسائل ان کے ذہن میں محفوظ تھے۔ جن میں مخصوص صحبتوں میں پر لطف محاکمہ کرتے تھے۔ ادب لطیف ہو یا فلسفہ، سیاسی بحث ہو یا مذہبی مسئلہ اور پھر تحریر ہو یا تقریر ہر جگہ ان کی 'ابوالکلامی' کا ثبوت ملتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ موضوع بحث کی نوعیت کے اعتبار سے مولانا کا اسلوب بیان فی الجملہ بدلتا ہے۔ فلسفیانہ مسائل کی گرہ کشائیوں میں ان کا اسلوب بالعموم صاف اور سادہ ہوتا ہے۔ ایسی تحریروں میں شاذ و نادر شعر استعمال کرتے ہیں لیکن جیسا اوپر اشارہ کیا گیا ان کی ذہنی تعمیر میں ادیبانہ صورت ہمیشہ مضمر پائی جاتی ہے جو ذرا سے غور کرنے سے نظروں کے سامنے آ جاتی ہے۔ خالص ادبی تحریرات میں جو استعارہ و تشبیہ تھا وہ فلسفیانہ تحریروں میں تمثیل کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ مولانا کی منطق اکثر و بیشتر تمثیلی ہوتی ہے استقرائی یا قیاسی نہیں۔ وہ اپنے تمثیلی استدلال سے مشکل سے مشکل مباحث اس طرح ذہن نشین کر دیتے ہیں کہ بایدوشاید، استقرا اور قیاس کی کاوشیں ان کی تمثیل کے سامنے پانی بھرنے لگتی ہیں۔ ایک اچھوتی تمثیل کی مثال پر اکتفا کرتا ہوں:۔

" میں سمجھتا ہوں کہ اگر ہمارا یہی حال رہا جو باوجود پیہم ظلمات استبداد و تنبیہ کے آج نظر آ رہا ہے تو کچھ عجب نہیں کہ مساجد کا دروازہ کھولنے، اذان دینے، نماز پڑھنے اور رمضان کو روزہ رکھنے کے لئے بھی گورنمنٹ کی اجازت اور رضا کے

انگریزی کھانا بوجہ سادہ اور بے آمیز ہونے کے قدرتی طور پر زود ہضم ہوتا ہے۔ اب ایسی بھی یہ غذائے نفیس کیا ثقیل ہوگی کہ صبح تک معدہ میں فروکش رہے اور آوازیں نکلیں تو حلق کی جگہ معدہ سے۔"

(الہلال "نشۂ نیم شبی کا صبح خمار"۔ ۵ فروری ۱۹۱۲ء)

"جن لوگوں نے ان عجیب و غریب گھڑیوں کو نہیں دیکھا ہے محال ہے کہ انھیں اس کی کیفیت سمجھائی جا سکے۔ چہرے جوش و ہیجان سے سُرخ، گردن کی رگیں ابھری ہوئیں، گلے شدتِ شور و ہنگامے سے پڑے ہوئے، ہاتھوں میں اچھلتی ہوئی ٹوپیاں اور پاؤں کو اضطرابِ رقص سے قرار نہیں، منہ سے کف اڑ رہی تھی اور چوں کہ قریب قریب کھڑے تھے اس لئے آپس ہی میں ایک دوسرے کے چہرے پر پڑ رہی تھی۔ رومال نکال کر منہ پونچھتے اور پھر کف اڑاتے۔ منتظمین جلسہ کو کیا معلوم تھا کہ بارہ دری کے اسٹیج سے میدانِ رقص کا کام لیا جائے گا ورنہ اس کی رعایت ملحوظ رکھتے۔ نتیجہ یہ تھا کہ جوشِ تواجد میں گردشِ رقص کی جگہ نہیں ملتی تھی اس لئے جو رقاص جہاں کھڑا تھا وہیں اپنے پاؤں سے اسٹیج کے چوبیں تختوں کو کوٹ رہا تھا۔ یہ رقصِ مغلوبہ کا اصلی ایکٹ تھا۔ اگر (سر ہنری اورنگ) زندہ ہوتا اور اس مجمع کو دیکھتا تو یقینی ہے کہ ان پُر جوش نوجوانوں کی ایک کھیپ تو ضرور اپنے ساتھ لے جاتا۔"

(الہلال ۱۳۔ مارچ ۱۹۱۳ء "نشۂ نیم شبی کا صبح خمار")

چند تذکرات | مولانا کے نقشِ قدم پر چلنے والوں کی تعداد کثیر ہے۔ الہلال صرف ان کی سیاسی کا آرگن نہ تھا بلکہ کالج کے نوجوانوں کے اندر ادبی ذوق و بیداری پیدا کرنے کا بھی ایک مؤثر آلہ تھا۔ راقم الحروف کو بھی اردو پڑھنے لکھنے کا شوق الہلال کے مطالعہ ہی سے پیدا ہوا اور پھر الہلال میں "ابوالاثر بہزاد" کے نام سے مضامین لکھنا شروع کئے جو مولانا کی اصلاح و تصحیح کے بعد الہلال میں شائع ہوتے رہے۔

مآخذ و موثرات مولانا کے قلم سے نکلے ہوئے ادب لطیف کو اگر "شعرِ منثور" کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ شاعری کا کون سا کمال ہے جو ان کی نثر میں جلوہ افروز نہ ہو۔ کون سی صفت ہے جو ان کی تحریر میں نہ ہو۔ بس وزن اور قافیہ ردیف سے عاری ہے۔ اس لئے آپ اسے نثر کہنے پر مجبور ہیں۔ ایسی نثر جس پر سینکڑوں نظمیں نثار ہیں۔ مولانا کی انشا پردازی اگرچہ اپنے مخصوص رنگ میں یکتا ہے لیکن غور کرنے سے اس میں کچھ اثرات ملتے ہیں جو محمد حسین آزاد، ظہوری، عرفی، غالب، متنبی کی معنی آفرینیوں اور ادبیانہ تراش خراش کے مرہونِ منت معلوم ہوتے ہیں۔ اگرچہ یہ مسلم ہے کہ مولانا آزاد ہر تقلید سے آزاد تھے اور جا بجا انھوں نے اپنی آزاد روی کا اپنی تحریرات میں اظہار بھی کیا ہے۔

ظرافت مولانا کی ظرافت اور عام ظرافت میں وہی فرق ہے جو کسی دہقانی کے لئے بے تکا ٹھٹھہ مارنے اور کسی متمدن و مہذب کے مسکرانے میں ہوتا ہے۔ مولانا کی ظرافت مہذب، سنجیدہ اور شان دار ہوتی ہے جو عالموں کے لئے مخصوص ہے جس میں کوئی سوقیانہ یا بازاری پہلو نہیں ہوتا۔ یہ خصوصیت ذیل کی مثالوں سے آشکارا ہوگی۔ یہ دونوں اقتباس مسلم یونی ورسٹی کے قیام کے سلسلے میں جو جلسے لکھنؤ میں ہوئے تھے ان کے متعلق ہیں۔ راقم الحروف ان جلسوں میں موجود تھا

"اتنے میں خبر آئی کہ (ہر آنر) کے ہاں ڈنر ہے ہم نے کہا کہ انا للہ وانا الیہ راجعون قومی طاقت کے ہزاروں آہنی حربے ایک طرف اور ان نقرئی چھری کانٹوں کی جھنکار ایک طرف۔ حریت پسندوں سے پوچھا کہ کہیئے اس ناوک کا بھی کوئی جواب آپ کے ترکش میں ہے جواب ملا کہ نہیں شکست کا اعتراف ہے

چشم اگر این است و ابرو این و ناز و عشوہ این

الفراق اے ہوش و تقوے الوداع اے عقل و دیں

لیکن پھر ہم نے دل کو تسلی دی۔ اطبائے قدیم و جدید کا اتفاق ہے کہ چھ گھنٹے کے بعد غذا کے جرم سے معدہ خالی ہو جاتا ہے۔ جلسہ رات کو نہیں بلکہ صبح آٹھ بجے ہے اور

کا بے نظیر نمونہ ہیں۔ مولانا ہر رنگ میں ادیب ہی ہیں

بہ ہر رنگے کہ خواہی جامہ می پوش　　　　من انداز قدت را می شناسم

مولانا کی شخصیت کی نفسیاتی تعمیر کی بنیاد تخیل پر ہے۔ تخیل ہی نے اُن کے ادب میں ایک بے مثال رمزیت Symbolism پیدا کر دی ہے۔ تخیل ہی ان کے تر و تازہ استعارات کا سرچشمہ ہے اور تخیل ہی ان کے فلسفیانہ مباحث میں تمثیلی استدلال کے بھیس میں ظاہر ہوتی ہے۔ حقیقت میں ان کی جگہ ادبیاتِ عالیہ ہی کا میدان ہے۔ دیگر میدانوں میں انکا عدوہ ولے پرند نش کا مصداق ہے۔

تصنیفات مولانا کے مضامین سے رسالہ الندوہ، الہلال اور البلاغ مالا مال ہیں اور ان کے جمع کرنے اور سلیقہ سے کتابی شکل میں شائع کرنے کی ضرورت ہے۔ ان کی بڑی تصنیفات مثلاً ترجمان القرآن، تذکرہ، غبارِ خاطر وغیرہ کے علاوہ ان کے بعض مقالے مثلاً خونِ شہادت کے دو قطرے، از سرِ نو مستقل طور پر طبع ہونے کے مستحق ہیں۔

موعظت و ذکریٰ

"۔۔۔۔ اگر پانی کہے کہ یہ میری کارفرمائی ہے تو آفتاب بھی چیک سکتا ہے کہ یہ اس کی حرارت کا معجزہ ہے۔ اگر دہقان مدعی ہو کہ اس نے بیج ڈالا تو موسم اسے جھٹلا سکتا ہے کہ بغیر میرے آئے ہوئے محض تخم ریزی کیا کر سکتی تھی؟ مزدور دعوٰی ہل جوتا، کاشتکار نے بیج ڈالا، نگہبانوں نے رکھوالی کی اور موسم نے آبیاشی، ان میں سے ہر فریق دعویٰ کر سکتا ہے کہ میں ہی اس لہلہاتے ہوئے کھیت کی وجود پذیری کی علت ہوں۔ مگر وہ جو ان سب سے بالاتر قوت ہے۔ کہتی ہے کہ تم سب ہیچ ہو۔ اگر قدرتِ الٰہی تمام اسباب و وسائل مہیا نہ کرتی تو نہ تو ایک بیج بار آور ہوتا اور نہ ایک سبز پتہ زمین پر نظر آتا۔!!

(الہلال ۲۳۔ فروری ۱۹۱۳ء)

ایک بات کا ملال مجھے تمام عمر رہے گا۔ الہلال جب اپنے اشاعت کے شباب پر تھا۔ مولانا نے مجھے اس کے عملۂ ادارت میں شامل ہونے کی دعوت دی مگر اپنی ناتجربہ کاری سے میں نے تکمیلِ تعلیم کو ترجیح دی اور نہ گیا۔ حق یہ ہے کہ مولانا کی صحبت ایک ایسی جنس تھی جو ہر قیمت پر خریدنا چاہئے تھی۔ اسی زمانے میں مولانا نے مولانا سید سلیمان ندوی کو بھی بلایا تھا۔ سید صاحب الہلال کے ادارہ میں عرصہ تک رہے اور مضمون نگاری کی خوب داد دی۔ الہلال کے بہت سے مضمون ایسے ہیں کہ لوگ اب تک مولانا کے رشحاتِ قلم سمجھتے ہیں مگر دراصل وہ نقوشِ سلیمانی ہیں مثلاً کان پور کی مسجد کے مسئلہ پر زبردست مضامین کا سلسلہ سید صاحب ہی کا لکھا ہوا ہے۔ مگر کون کہہ سکتا ہے کہ وہ مولانا کے قلم کا اثر نہیں۔ مولانا کا اسلوب تحریر بلاشبہ ناقابلِ نقل ہے لیکن الہلال کی بعض تحریریں جید سے جید ناقدِ فن کے سامنے رکھ دی جائیں اور پوچھا جائے کہ کون سی تحریر مولانا کی اور کون سی سید صاحب کی ہے تو بتانا مشکل ہوگا۔ مولانا کے مضامین اور مقالات جمع کرنے اور شائع کرنے والی کمیٹی میں ایسا شخص ہونا چاہیئے جو سید صاحب کے مضمونوں کو مولانا کے مضمونوں سے الگ کر سکے۔

چالیس برس سے زیادہ عرصہ گزرنے کے بعد جب مولانا پہلی بار پارلیمنٹ کی ممبری کے لئے رام پور سے کھڑے ہوئے تو میرا قیام رام پور ہی تھا۔ الہلال سے سطحی ربط ایسا نہ تھا کہ یاد رکھنے کے قابل ہو۔ لیکن مولانا کو سب یاد تھا۔ نہایت گرمجوشی سے مجھے دہلی آنے کی دعوت دی اور واپس تشریف لے جانے کے دو ڈیڑھ مہینہ کے بعد پروفیسر محمد اجمل خاں صاحب کا خط آیا۔ عرض نہیں کر سکتا کہ صحبت کے چند دن کس لطف سے کٹے اور الہلال کے دفتر میں شامل نہ ہونے کی حماقت پر میں نے اپنے تئیں کتنی نفرین کی۔ مولانا شاکی تھے کہ دہلی میں کوئی ایسا ہم ذوق و ہم نوا نہیں کہ جس کے ساتھ گھڑی دو گھڑی بات کی جا سکے۔ یہ امر واقعہ ہے کہ اپنی افتادِ طبیعت کے اعتبار سے وہ سیاسی ہنگاموں، بجلی کے تیز قمقموں اور شہرت پسندی سے نفور تھے۔ وہ پڑھنے لکھنے اور غور و فکر کے لئے گوشۂ تنہائی کے طالب تھے لیکن ان شورشوں نے ان کا پیچھا نہ چھوڑا اور ان کی ساری زندگی انہیں ہنگاموں میں کٹی۔ مگر جیسا عرض کیا گیا ان کی ہنگامہ خیز سیاسی تقریریں بھی اعلیٰ ادب

تیری مرگ و زیست دو حلقے ہیں اک زنجیر کے
سلسلہ کردار کا تیرے ہے مثلِ کوہسار

تھا اسی کا مقتضی تیرا عمل آغاز سے
زندگی جس موت پر منتج ہوئی پایانِ کار

ماتمِ انسانیت کرنے کو تیری موت پر
آج شاید آسماں پر ہوں ملائک سوگوار

سلسلہ جن کی فضیلت کا ہے تا خیر القروں
چند اُن اسلاف کا تھا آخری تو یادگار

موج اندر موج تھا اک قلزمِ زخارِ فہم
علم کا تو ایک عالم تھا دیار اندر دیار

ما کدر تھا رد تیرا اور ما صفا تیرا قبول
نہی و امرِ دینِ برحق تیرا ترک و اختیار

در کفے جامِ شریعت در کفے سندانِ عشق
تو مشیرِ عقل تھا اور تو جنوں کا مستشار

تیرے ہی نقشِ قدم پر پڑتے ہیں سب کے قدم
کس قدر روندی ہے تو نے عظمتوں کی رہگزار

دیکھ کر اندازِ تیری روح کے روزِ ازل
دی حیاتِ دنیوی تجھ کو ابد نے مستعار

بر بنائے پختگیٔ فکر تیری زندگی
اپنی ایک اک سانس میں رکھتی ہے قرنوں کا شمار

ہو سکا تجھ تک پہنچ کر مفتخر دورِ جہاں
ہو سکے گا اور کیا فوزِ عظیم روزگار

تھا ترے آغازِ عظمت ہی کا پرچم الہلال
تھی تری صبحِ نخستیں ردکشِ نصف النہار

کس قدر ویران ہے مستقبلِ انسانیت
عالمِ تخلیق میں ہے اک خلائے بے کنار

ہو سکے گی کیا تلافی اب غمِ مافات کی
حشر تک شاید رہے گی چشمِ ہستی اشکبار

تھی تری وضعِ تواضع میں سرافرازی کی شان
تیری افتادِ طبیعت میں ہمالہ کا وقار

پیش پا افتادہ رہتی تھی بہ صد عجز و نیاز
کج کلاہی سے تری، شانِ کلاہِ تاجدار

ناطقہ تیری طلاقت پر اگر قربان تھا
تھی طلاقت تیرے اندازِ خطابت پر نثار

بسمل سعیدی

مولانا ابوالکلام آزاد

کم ہوا کرتے ہیں اس دنیا میں وہ مردانِ کار
زندگی اور موت دونوں کو ہو جن سے افتخار

زندگی اپنے محاسن خود بیاں کرتی نہیں
موت کرتی ہے محاسن زندگی کے آشکار

زندگی رکھتی ہے آغوشِ بقا میں کچھ نفس
موت کرتی ہے حیاتِ جاوداں سے ہم کنار

جب سماتی ہے یہ بڑھ کر وسعتوں میں موت کی
آب جوئے زندگی بنتی ہے بحرِ بے کنار

ثبت ہو جاتا ہے لوحِ دہر پر اس کا دوام
موت کر دیتی ہے جس کی زندگی کو استوار

زندگی جس سمت چاہے بدل سکتی ہے رُخ
موت ہی پر منحصر ہے زندگی کا اعتبار

اپنے زشت و خوب میں ہوتی ہے ساری زندگی
موت کے اک لمحۂ آخر کے زیرِ اختیار

زندگی ہے موت کے تابع مگر با ایں ہمہ
موت کا بھی ایک شفعِ زندگی پہ ہے مدار

زندگی بھر کے خیالوں ہی کا ہے اک خواب موت
موت خود بھی زندگی کی ہوتی ہے آئینہ دار

بالعموم انساں کو موت آتی ہے حسبِ زندگی
ہے یہی کچھ فطرتِ عادل کا دستور و شعار

الفراق اے منزلت یابندۂ مرگ و حیات
موت کے راس البضاعت، زندگی کے شاہکار

انگریزی سے ترجمہ　　　　محمد مجیب　　　　مترجم۔ محمد شفیق الرحمٰن

تذکرہ

"ان اوراقِ پریشاں کی تالیف کا باعث ایک دوستِ عزیز کا اصرار تھا۔" مولانا آزاد نے تذکرہ کے آخر میں تحریر فرمایا ہے "اب وہ مُصر ہیں کہ اپنے حالات بھی قلمبند کروں۔ اس تمام داستان سرائی کے اہتمام سے ان کا اصل مقصد یہی تھا۔" تذکرہ اسلامی فکر کے موضوع پر ایک مقالہ کی حیثیت سے پڑھا جا سکتا ہے۔ اس کی حیثیت ایک کتاب سے بہت زیادہ ہے۔ وہ ایک اشاریہ ہے، ایک شخصیت ہے، ایک شعلہ اور جوش ہے، ایک الہامی واعظ کی قوتِ نطق، ایک بڑے دل کا گریہ و بکا، ایک المیہ کا محزوں نغمہ اور ایک فتح کا مسرت انگیز زمزمہ۔ وہ ایسی خود نوشت سوانح عمری ہے جو ایک تصوّر کا پیکر بن گئی ہے اور ایسا تصوّر جو فطرتِ انسانی کی جیتی جاگتی تصویر ہے۔

لیکن تذکرہ ایک انوکھی کتاب ہے وہ کتاب نہیں جس کی خواہش ناشر کو تھی۔ ان کا مقدمہ بہت دلچسپ اور قابلِ توجہ ہے۔ وہ صریحاً ایسے مشاہیر پرست معلوم ہوتے ہیں جو تمام مشاہیر کی پریشانی کا باعث بن جاتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں کہ ان کی مولانا آزاد سے ۱۹۰۲ء میں واقفیت ہوئی۔ اس وقت مولانا طالب علم ہی تھے۔ انھوں نے مولانا آزاد کے ارتقاء کو دیکھا۔ جب مولانا آزاد نے 'الہلال' شائع کرنا شروع کیا اور ہندوستانی مسلمانوں کے قلوب کو ایک خاص اثر سے مسخر کر لیا تو مرزا فضل الدّین کو خیال ہوا کہ اس کا عین وقت

اس طرح منہ سے ترے جھڑتے تھے پھول الفاظ کے
خُلد سے جیسے بہاروں کا گرے اک آبشار

جنبشِ ادنیٰ بھی تیرے کلک کی اعلیٰ ادب
غازۂ رخِ نگارش تیری خاطر کا غُبار

نامۂ اعمال در دست آئیں گے جس وقت لوگ
حشر میں تُو آئے گا تفسیرِ قرآں در کنار

ناموافق جس قدر ہوتی سیاست کی فضا
ہمّتِ عالی کو ہوتی اتنی ہی کچھ سازگار

قلعۂ احمد نگر کو یاد ہیں وہ صبح و شام
تھی جہاں شامِ خزاں تیرے لیے صبحِ بہار

تھا ترے نزدیک عینِ وقتِ آزادئ ہند
عہدِ افرنگی کا دَورِ قید و بند و گیر و دار

ہاں پریشاں کُن تری جمعیتِ خاطر کو تھا
مسلمِ ہندوستاں کا افتراق و انتشار

تو امیرِ کارواں بھی تھا امام الہند بھی
ماسوائے ملک، ملّت کا بھی تھا تو ذمّہ دار

منتہائے عزم تیرا اس سے ظاہر ہے کہ تھی
ہمرہوں کی منزلِ مقصود تیری رہگزار

تھا جہانِ تابِ فضیلت تیرا خورشیدِ حیات
اب حیات افروزِ عظمت ہے تری شمعِ مزار

سر بہ افلاک اس زمیں کو کر گئی کس کی نظر
زیرِ پائے مسجدِ جامع بنا کر یہ مزار

مسجدِ جامع اب تری رفعت کا ضامن ہو گیا
علم و دیں کا اک ستوں، عزم و عمل کا اک منار

سر بہ سجدہ ہے وہ تیری سیڑھیوں کے سامنے
تیری محرابوں میں بھی ایسے نہیں طاعت گزار

اس کے ذمّے تھے جو تیرے حق وہ پورے کر گیا
اب ترے ذمّے ہے اُس پر رحمتِ پروردگار

ثبت ہے عظمت پہ تیری مہرِ توثیقِ دوام
یہ عظیم المرتبت تُربت، فلک رفعت مزار

لہ پنڈت جواہر لال نہرو

تذکرہ دو جلدوں میں لکھا جانے والا تھا۔ مرزا فضل الدین کی اصل متن کی قطع برید اور طویل حاشیوں کی کاٹ چھانٹ بھی اس کو مختصر نہ کرسکی۔ لیکن جب انھوں نے دیکھا کہ دوسری جلد کا شائع ہونا بہت بعید ہے تو انھوں نے خود نوشت سوانح عمری کا مقالہ پہلی جلد کے ضمیمہ کے طور پر شامل کردیا۔ کوئی کتاب بہ مشکل ناشر کی خواہش کے اس قدر خلاف ہوسکتی ہے جتنا تذکرہ ہے اور ایسا بھی شاذ ہی ممکن ہے کہ کوئی مصنف جس نے اپنے تخیل اور قلم کو آزاد رکھا ہو اور ترتیب اور تعلیل استدلال کا لحاظ چھوڑ دیا ہو، اس طرح ناشر کے دام میں آگیا ہو کہ وہ مسودہ پر نظر ثانی نہ کرسکے، حوالوں کی جانچ نہ کرسکے اور پروف بھی نہ پڑھ سکے۔ جب دو ثلث کتاب چھپ گئی تو مولانا کو اطلاع کی گئی کہ کیا ہو رہا ہے۔ انھوں نے بے اعتنائی سے کہا: "لوگوں نے اپنی دل جمعی اور فراغِ خاطر کی یادگاریں چھوڑی ہیں۔ اپنی پریشان خاطری اور پراگندگیٔ طبع کی بھی ایک یادگار رہے تو بہتر ہے۔" یہ غیر محدود آمدہی ہے جس نے تذکرہ کو اشخاص کا ایسا مؤثر بیان اور مذہبی اور اخلاقی مسائل کا اس قدر پُرجوش مذاکرہ بنادیا ہے اور یہ اس ہی سبب سے ہے کہ اس سے مولانا آزاد کی شخصیت واقعی طور پر اس قدر منعکس ہوتی ہے کہ کسی صحیح سے صحیح سوانح عمری سے بھی ظاہر نہیں ہوسکتی۔ تذکرہ واقعی موضوع نہیں ہے وہ حمایتِ حق ہے جس کی تکمیل کے لئے بتحرِ علم و فضل اور الفاظ پر پُر زور اقتدار اور غیر معمولی قدرت کے طرزِ بیان سے کارفرمائی کی گئی ہے۔ مولانا آزاد اس سے بھی واقف ہیں کہ کن بیانات کی کمی کی طرف اشارہ کیا جاسکتا ہے اور وہ کہتے ہیں کہ وہ بالارادہ ہیں اور ان کا مقصد ان کے موضوع کی زیادہ مؤثر وضاحت ہے۔ ان کو اس کا بھی یقین ہوگا کہ بیانات میں جو غلو انھوں نے اپنے ذوق سے کیا ہے وہ اک دل آویزی ہے اور ناظرین کو مسحور کرنے میں ناکام نہیں ہوسکتا۔

تذکرہ کہاں سے شروع ہوتا ہے؟ ابتداء میں جہاں مولانا آزاد اپنے خاندان کا مختصر ذکر کرتے ہیں اور اس استدلال پر ختم کرتے ہیں کہ خاندان سے آدمی نہیں بنتا۔ اور آخر میں تتمہ میں وہ اپنی "سوانح عمری" لکھتے ہیں۔ فی الحقیقت تذکرہ کو کما حقہٗ سمجھنا ممکن نہیں جب تک کہ اس کو اختتام سے شروع نہ کیا جائے۔ اس سے نہ صرف ان کا اندازِ فکر واضح ہوگا بلکہ ان کا ذریعۂ بیان

ہے کہ ایسی پُر اثر شخصیت کے مدّاحوں کو ان کے حالات سے واقفیت ہونی چاہیئے۔ لیکن مولانا آزاد نے ان کی خود نوشت سوانح عمری کی فرمائش کا مذاق بنا کر ٹال دیا۔

" کتنی بزرگ اور عظیم الشّان زندگیاں ہمارے سامنے ہیں جن کے سوانح اور حالات نہیں لکھے گئے۔ ان کو نظر انداز کر کے میری زندگی کے حالات مرتب کرنا محض ایک تمسخر انگیز حرکت ہوگی۔"

لیکن یہ بات قابلِ تشکر ہے کہ مرزا فضل الدّین مزاح کے معاملہ میں نکتہ رس نہ تھے۔ انھوں نے مولانا آزاد پر مسلسل تقاضہ جاری رکھا۔ یہاں تک اُن کو یہ وعدہ حاصل ہو گیا کہ "ہر ہفتہ کچھ" ملتا رہے گا۔ جو کچھ ان کو ہر ہفتہ ملتا رہا اس سے ابتداء میں مرزا فضل الدّین نے یہ سمجھا کہ مولانا آزاد اپنی خود نوشت سوانح عمری کو اپنے خاندان کے حالات سے شروع کرنا چاہتے ہیں۔ لیکن جب مولانا آزاد موضوع سے ہٹنے لگے اور یہ معلوم ہونے لگا کہ وہ اصل مضمون پر آنا نہیں چاہتے تو مرزا فضل الدّین اس پر مجبور ہوئے کہ ان کو روکیں اور فرمائش کریں کہ مختصر لکھیں اور مطلوبہ موضوع پر لکھیں۔ لیکن مولانا آزاد کسی ہدایت کے پابند ہونے والے نہیں تھے۔ انھوں نے اصرار کے جواب میں لکھا۔ "میری طبیعت میں رکاوٹ نہ پیدا کرو۔ جو کچھ بے اختیار قلم سے نکل جاتا ہے بھیج دیتا ہوں، جمع کرتے جاؤ ہر حال میں فائدہ سے خالی نہ ہوگا۔"

لیکن مرزا فضل الدّین بھی مایوس ہونے والے نہیں تھے۔ وہ رانچی پہنچ گئے اور مقیم ہو گئے۔ مولانا آزاد رانچی میں نظر بند تھے۔ مرزا فضل الدین پندرہ سوال ایسے مقرر کر کے لے گئے کہ جن کے اندر مولانا آزاد کی زندگی کی تمام تفصیلات آجاتیں۔ انھوں نے مولانا آزاد سے ان سوالات کے بالترتیب جوابات کا اصرار کیا لیکن مولانا آزاد نے اپنی شخصیت کو شاعرانہ اشارات کے مزیّن پردے کے اندر چھپا لیا اور اپنے وجود کو گویا ایک روحانی مہم بنا لیا اور ان کی مادّی زندگی ایسی ہو گئی کہ موضوعِ کلام سے خارج ہو گئی۔ مرزا فضل الدّین کو یہ اندازہ ہوا کہ وہ ناکامیاب رہے۔ لیکن ہم یہ سمجھتے ہیں کہ مولانا آزاد نے جیسی سوانح عمری لکھی ہے ایسی نہ لکھی جاتی تو کسی قدر غلط فہمی کا باعث ہو سکتی ہے۔

ساری فیروز بختی و جوان طالعی کا معاملہ آج نہیں کل فیصل ہونے والا ہے۔ یوم تبیض وجوہ و تسود وجوہ۔ اصلی فیروز مندی وہاں کی فیروز مندی ہے۔ اور جوان بخت وہی ہے جو اُس آنے والے دن آزمائش میں پورا اُترے۔ لکل امرئ منہم یومئذ شان یغنیہ۔ اگر وہاں روح و ریحان و جنت النعیم اور فوز عظیم کی فیروزی و کامرانی ہاتھ آئی تو پھر بخت بخت ارجمند ہے۔ لیکن اگر وجوہ یومئذ علیہا غبرۃ ترہقہا قترۃ اور لا بشری یومئذ للمجرمین کی رسوائی اور محرومی ملی تو پھر نہ اُس حرماں نصیبی کے لئے امید ہے نہ اس ماتم حسرت کے لئے خاتمہ بخت اسکندری اور تخت جمشیدی بھی ہاتھ آئے تو لے کر کیا کیجئے۔

گر بدانم کہ وصالِ تو بدیں دست دہد   دل و دیں را ہمہ در بازم و توفیر کنم ....."

ان خیالات میں منہمک ہونے کے بعد مولانا آزاد واقعات اور تاریخوں کی طرف منعطف ہوتے ہیں

"آبائی وطن دہلی مرحوم ہے سلام علی نجد و من بالنجد۔ مگر وطن مادری سرزمین مطہر طیبہ و دار الہجرت سید الکونین و شہرستان نبوت و وحی ہے۔ قبلۂ عبادت گذرانِ عشق و کعبۂ نیاز مندانِ شوق، علی صاحبہا الصلوٰۃ والتحیۃ

دارم دلے گردان کہ من قبلہ نما میخوانمش   رو سوئے ابرویش کند، ہر چند می گردانمش

اور وطن حقیقی کی نسبت کیا کہئے کہ بحکم "کن فی الدنیا کانک غریب" ہم سب غربت سرائے ارضی کے آوارہ و مسافر، تمام مسافرانِ ہستی ایک ہی قافلۂ غربت کے رہ سپار، سب کو ایک ہی مستقر و موطن در پیش البتہ کسی کے لئے ساءت مستقرا و مقاما میں داخل اور کسی خوش نصیب کے لئے حسنت مستقرا و مقاما....

"مولد و منشاء طفولیت" وادی غیر ذی زرع عند بیتک المحرم ہے۔ یعنی مکہ معظمہ زاد اللہ شرفہا و کرامۃ محلہ قدوہ متصل باب السلام......

"اس وقت کہ ۱۳۳۵ ھجری قریب الاختتام ہے، قافلۂ برق رفتار عمر منزل ثلاثین تک پہنچ چکا ہے۔

روانی، ان کی اشاریت، ان کی اردو زبان کے زمین و آسمان کی خداوندی بھی۔ وہ صرف ادبی اکتساب ہی نہیں ہے بلکہ وہ روحانی قوت ہے اور اُس تجلی کا نتیجہ ہے جو اس دنیا کی روشنی سے نہیں ہے۔ تذکرہ عمیق روحانی کیفیتِ مزاج کی تخلیق ہے اور اس ہی کیفیتِ مزاج کے اثر میں پڑھا جانا چاہیئے۔

"یہ غریب الدیارِ عہد، و ناآشنائے عصر، بیگانۂ خویش، و نمک پروردۂ ریش، معمورہ تمنا و خرابہ حسرت کہ موسوم بہ احمد و مدعو بابی الکلام ہے ۱۸۸۸ء مطابق ذوالحجہ ۱۳۰۵ھ میں ہستیٔ عدم سے عدمِ ہستی نما میں وارد ہوا اور تہمت حیات سے متہم۔ الناس نیام، اذا ماتو فانتبھوا۔

شورے شد و از خواب عدم چشم کشودیم دیدیم کہ باقیست شب فتنہ غنودیم

والد مرحوم نے تاریخی نام "فیروز بخت" رکھا تھا اور مصرعہ ذیل سے ہجری سال کا استخراج کیا تھا ع

جواں بخت و جواں طالع، جواں باد

سبحان اللہ بخت کی فیروزی اور طالع کی ارجمندی! نیمۂ عمر لغزشوں اور ٹھوکروں کی پامالی و درماندگی میں بسر ہو چکی ہے۔ نیمۂ عمر جو شاید باقی ہے دم لینے اور سستانے میں ختم ہو رہی ہے۔ نہ منزلِ مقصود کا پتہ ہے نہ شاہراہِ منزل پر قدم، جب پاؤں میں تیزی اور ہمت میں جوانی تھی تو رہ نوردی اور منزل طلبی کا دروازہ نہ کھلا تھا۔ اب پامالیوں اور درماندگیوں سے نہ قدم میں پامردی رہی نہ ہمت میں کارفرمائی، تو طلب نے آنکھیں کھولیں اور غفلت نے کروٹ بدلی۔ راہ دور اور نشانِ منزل گم، کیسۂ زاد خالی اور سروسامانِ کار ناپید، وقت جا چکا اور ہر آن و لمحہ کاروانِ مقصود سے دوری اور منزلِ مراد سے مہجوری بڑھتی گئی۔ اب قدم کی تیزی اور ہمت کی چستی واپس بھی مل جائے تو بھی وہ دولتِ وقت کب واپس مل سکتی ہے جو لُٹ چکی؟ اور قافلۂ امید کب پس ماندگانِ غفلت کی خاطر لوٹ سکتا ہے جو جا چکا؟

رفتم کہ خار از پا کشم، محمل نہاں شد از نظر یک لحظہ غافل بودم و صد سالہ راہم دور شد

پھُنکتے رہے، دوسرے دن دیکھا تو راکھ کا ڈھیر تھا جس پر جی بھر کے آنسو بہائے۔

دریں چمن کہ بہار و خزاں ہم آغوش ست　　زمانہ جام بدست و جنازہ بردوش ست

ابوطالب کلیم نے چار مصرعوں میں پوری سوانح عمری لکھ دی۔

بدنامیِ حیات دو روزے نہ بود بیش　　آں ہم کلیم با تو بگویم چساں گذشت
یک روز صرف بستنِ دل شد باین و آں　　روزے دگر بکندنِ دل زین و آں گذشت

" اور دراصل اس شعبدہ گاہ ہستی کی بڑی سے بڑی مہلتوں کا بھی یہی حال ہے۔

لم یلبثوا الا عشیۃ او ضحاھا اور قالوا لبثنا یوما او بعض یوم کلیم کو معلوم نہ تھا

کہ اس سے پہلے یہی مضمون زیادہ ایجاز بلاغت کے ساتھ کہا جا چکا ہے۔

دمتی بساعدنا الوصال، ودھرنا　　یومان، یوم نوی ویوم صدود

عہدِ طفلی ایک خوابِ عیش تھا۔ حیف صد حیف کہ ما زود خبردار شدیم۔ آنکھیں کھلیں تو

عہدِ شباب کی صبح ہو چکی تھی اور خواہشوں اور ولولوں کی شبنم سے خارستانِ ہستی کا ایک ایک کانٹا

پھولوں کی طرح شاداب تھا۔ اپنی طرف دیکھا تو پہلو میں دل کی جگہ سیماب کو پایا۔ دنیا پر نظر

ڈالی تو معلوم ہوا کہ اس صبحِ فریب کے لئے نہ تو سوز و تپش کی دوپہر ہے، نہ اُمیدی و ناکامی کی شام

یہ سارا شہرستان امید و نگارخانۂ منظر فریب صرف ایک ہمارے ہی دیدہ و دل کی کام جوئیوں

کے لئے بنا ہے۔ اور گویا گوشہ گوشہ اور ذرہ ذرہ ہماری ہوسناکیوں کے لئے چشم براہ ہے۔ جس

طرف کان لگایا یہی صدا سنائی دی۔ معلوم نہیں اپنے ہی گنبدِ غفلت اور ہنگامۂ ہوس کی گونج تھی

یا تو گرفتارانِ طلسمِ شباب کی ہوش رُبائیوں کے لئے سازِ ہستی کا نوائے فریب ہی یہی ہے۔

شہر یست پر ز خوباں، وز ہر طرف نگارے　　یاراں صلائے عام ست گر می کنید کارے

غفلت و مدہوشی نے افسوں پھونکا، سرمستی و سرگردانی نے جام بھرے، جنونِ شباب

نے ہاتھ پکڑا اور ولولوں اور ہوس نے جو راہ دکھلائی دل کی خود فروشیوں نے اسی کو منزلِ مقصود

سمجھا۔ ہوش و خرد کو گو پہلے حیرانی ہوئی لیکن پھر اس نے بھی آگے بڑھ کر اشارہ کیا، راہ ہے

تو یہی ہے اور وقت ہے تو اسی کا، ساقیا مرنج از من عالم جوانی است . . . . جس راہ

نقلت دلی قبل الثلاثین ملعبا ؛ یعتو دون ہل بعد الثلاثین ملعبا

قریب ہے کہ چشم زدن میں یہ منزل بھی پیچھے رہ جائے اور آگے کا حال کچھ معلوم نہیں۔

صد بیابان بگذشت و دگرے در پیش است ۔ کس نمی گویدم از منزلِ آخر خبرے

جتنی زندگی گزر چکی ہے گردن موڑ کر دیکھتا ہوں تو ایک نمودِ غبار سے زیادہ نہیں اور جو کچھ سامنے ہے وہ بھی جلوۂ سراب سے زیادہ نظر نہیں آتا ۔ قلم درماندہ و تذکرہ و نگارش سے عاجز اور فکر گم گشتہ حیران اظہار و تعبیر ۔ اپنی سرگذشت اور روئیداد عمر لکھوں تو کیا لکھوں ؟ ایک نمودِ غبار و جلوۂ سراب کی تاریخ قلمبند ہو تو کیونکر ہو۔ دریا میں حباب تیرتے ہیں، ہوا میں غبار اڑتا ہے ، طوفان نے درخت گرائے ، سیلاب نے عمارتیں بہا دیں ، عنکبوت نے اپنی پوری زندگی تعمیر میں بسر کر دی ، مرغ آشیاں پرست نے کونے کونے سے چُن کر تنکے جمع کئے ، خرمن و برق کا معاملہ ، آتش و خس کا افسانہ ، ان سب کی سرگذشتیں لکھی جا سکتی ہیں تو لکھ لیجئے ۔ میری سوانح عمری بھی ان ہی میں مل جائے گی ۔ نصف افسانۂ امید اور نصف ماتمِ یاس ۔

کس پیشِ تو غم نامۂ ہجراں چہ کشاید ۔ عاشق نہ شدی ، محنتِ الفت نہ کشیدی

پہلے مجسم امید تھا ۔ اب سر تا سر حسرت ہوں ۔

اس کو آرام ، اس کو خواب نہیں ۔ مختصر حالِ چشم و دل یہ ہے

اس پر بھی اگر داستاں سرائی کا شوق ہو تو ان پورے تیس برسوں کی سرگذشت سن لیجئے ۔ حکایت برق و خرمن کوئی افسانۂ دراز نہیں جس کے لئے پوری رات آنکھوں میں کاٹنی پڑے صرف ایک نالۂ گرم اور آہِ سرد میں پوری حکایت ختم ہے ۔

قاآنی را دگر شب آمد ۔ ہمسایہ شنید نالہ ام ، گفت

ایک صبح امید تھی کہ دیکھتے ہی دیکھتے گزر گئی ۔ ہمچو عیدے کہ در ایام بہار آمد و رفت ۔

ایک شامِ مایوسی تھی جس کی تاریکی کو امید کا کوئی چراغ روشن نہ کر سکا ۔

چراغ جلتا نہیں کہیں کا ۔ بجھا ہے دل جب سے مجھ حزیں کا

یا امید و حسرت کے دو دن ، ایک ہوسِ تعمیر میں بسر ہوا ایک ماتمِ تخریب میں ۔ ایک دن تنکے

"البتہ ساری ہلاکت اس میں ہے کہ ہنگامۂ غفلت و خود فراموشی میں نفسِ لوامہ کی صدائے شہادت بہت کم کانوں تک پہنچتی ہے اور پہنچتی ہے تو خود ہمارے ہی ہاتھ سرشاری و بدمستی کے نقاروں پر اس زور سے پڑ رہے ہیں کہ ان کے شور وغل میں یہ سرگوشیٔ ملامت کب کام دے سکتی ہے....

" لیکن دنیا کی ساری سچائیوں اور یقینیوں سے بڑھ کر یہ حقیقت ہے کہ

کارسازِ ما بفکرِ کارِ ما — فکرِ ما در کارِ ما آزارِ ما

اور اس راہ کی نیرنگیوں کا عجب حال ہے کہ علم بے خبر، دانا دو عقل بے حس شد۔ ہرچند راہ ایک ہی ہے لیکن کرشمے بے شمار ہیں اور گو ہوش سب کھوتے ہیں مگر ایک ہی جلوہ سے نہیں۔

اے ترا با ہر دلے رازے دگر — ہر گدا را بر درت نازے دگر

کوئی پکارتا ہے اور دروازہ نہیں کھلتا۔ کوئی بھاگتا ہے اور کمند پھینکے جاتے ہیں۔ قانونِ طلب و سعی سے انکار نہیں۔ لیکن اگر وہ بے طلب دینا چاہے تو اس کا ہاتھ پکڑنے والا کون ہے....

" ناگہاں جاذبۂ توفیقِ الٰہی پردۂ عشقِ مجازی میں نمودار ہوا اور ہوس پرستی کی آوارگیوں نے خود بخود شاہراہِ عشق و محبت تک پہنچا دیا۔ آگ لگتی ہے تو رفتہ رفتہ شعلے بھڑکتے ہیں۔ سیلاب آتا ہے تو بتدریج پھیلتا ہے۔ یہ تو ایک بجلی تھی جو آناً فاناً نمودار ہوئی۔ چمکی اور دیکھا تو خاک کا ڈھیر تھا....

اصل میں تین منزلیں ہیں۔ ہوس، عشق، حقیقت

حاصلِ عمرم سہ سخن بیش نیست — خام بدم، پختہ شدم، سوختم

اور یہاں عشق سے مراد عشقِ محدود و ناقص یعنی مجاز ہے نہ کہ علی الاطلاق، کیونکہ اس اعتبار سے تو اول و آخر جو کچھ ہے عشق ہی ہے۔ تمام کائناتِ ہستی میں بجز اس کے اور ہے کون؟ آسمانوں کا ستون ہے تو یہی ہے، زمین کا مدار و محور قائم ہے تو اسی کے دم سے، دنیا میں جس قدر ظاہر ہے یہی ہے، جس قدر باطن ہے اس کے سوا کچھ نہیں۔ یہ دوسری بات ہے کہ ہماری نگاہِ وحدت ناآشنا نے ایک ہی حقیقت کو طرح طرح کے ناموں سے موسوم کر دیا

میں قدم اٹھایا نہ زنجیروں اور کمندوں نے استقبال کیا۔ جس گوشہ میں پناہ لی وہی زندانِ ہوش و آگہی نکلا۔ ایک قید ہو تو ذکر کیجئے، ایک زنجیر ہو تو اس کی کڑیاں گنئے۔ دل ایک تھا مگر تیر ہزاروں ہاتھوں میں تھے۔ نظر ایک تھی مگر جلووں سے تمام عالم معمور تھا۔ ہر کشش نے اپنا تیر چلایا، ہر راہزن نے اپنی کمند پھینکی، ہر فسوں ساز نے اپنا افسونِ محبت پھونکا، ہر جلوۂ ہوش ربا نے صرف اپنے ہی دامِ الفت میں اسیر اور اپنی ہی فتراک اسیری کا نخچیر رکھنا چاہا۔

وائے بر صیدے کہ یک باشد و صیادے چند

یہ بات نہ تھی کہ امتیاز نے بالکل ساتھ چھوڑ دیا ہو اور دیدۂ اعتبار یک لخت کور ہو۔ برق نے بارہا چشمک کی، ستاروں نے کبھی کبھی پردۂ شب کی اوٹ سے جھانکا لیکن رات کی تاریکی اور طوفان کی تیرگی ایسی نہ تھی جو ان چنگاریوں سے روشن ہو جاتی۔ وہ برابر بڑھتی ہی گئی۔

فرصت ز دست رفتہ و حسرت فشردہ پائے   کارساز دو اگذشتہ دانسوں نہ کردہ کس

کبھی سرو کی بلند قامتی پر رشک آیا تو سربلندی اور سرفرازی کے لئے دل خون ہوا۔ کبھی سبزۂ پامال کی خاکساری و افتادگی پر نظر پڑ گئی تو اپنے پندار اور خود پرستی پر شرم آئی۔ کبھی بادِ صبا کی روش پسند آئی تو اقامت گزینی سے وحشت ہوئی، آوارگی و رہ نوردی کی دل میں ہوا سمائی۔ کبھی آبِ رواں کی بے قیدی و بے تعلقی اس طرح جی کو بھائی کہ پابندیوں گرفتاریوں پر آنکھوں نے آنسو اور دل نے زخموں کے ساتھ ماتم کیا۔ پھولوں کو جب مسکراتے دیکھا تو اپنی آنکھوں نے بھی رونے میں کمی نہیں کی۔ اور درختوں کو جب کبھی جنبش ہوئی شاخوں نے جھوم جھوم کے وجد کیا تو اپنی سنگینی و بے حسی بھی ضرور یاد آ گئی۔ غرض کہ نہ تو اسباب میں کمی تھی اور نہ استعداد بالکل مفقود تھی۔ بجلیاں کوندتی رہیں، بادل گرجتے رہے لیکن افسوس کہ نیند بھی بڑی ہی سخت تھی اور پشتِ غفلت کسی بڑے ہی سخت تازیانے کا انتظار کر رہی تھی۔

نہ پہنچی ضعف سے لب تک دعا ہی ورنہ صدا۔ درِ قبول تو اس آرزو میں رہا

بہتر یہ ہے کہ صاف صاف ہی کہہ دیا جائے . . . . .

"ہوس و عشق پر کیا موقوف ہے؟ کوئی درمیانی منزل ہو اگر قدم آگے بڑھنے سے رک گئے تو وہی منزل بُت ہے اور رہرو اُس کا پرستار۔ تسبیح آرائی و دلق پوشی ہی کی منزل کیوں نہ ہو......

"چناں چہ الحمدللہ کہ اس منزل کے وقفہ نے بھی زیادہ طول نہ کھینچا۔ ایک سال یا پانچ ماہ کے اندر اس کوچہ کے بھی تمام رسم و راہ ایک ایک کر کے دیکھ ڈالے، کوئی گوشہ کوئی مقام نہ چھوٹا.......

"اس راہ کے رسم و آئین اگرچہ بے شمار ہیں لیکن ہر رہرو کو دو مسلکوں میں سے ایک مسلک ضرور اختیار کرنا پڑتا ہے۔ یا قمری و بلبل کی آوارگی و شورش یا شمع کی خاموشی اور سوزش.......

"اور معلوم ہوتا ہے کہ شعلوں کی طرح بھڑکنا آسان ہے مگر تنور کی طرح اندر ہی اندر سُلگنا اور حفظ و ضبط کے سارے آداب و شرائط سے عہدہ برآ ہونا مشکل ہے

عریانی تنی خوش است، ولے زیب دیگر است   دامان چاک چاک و گریباں دریدہ را

....

"اگر کسی نے عمر بھر دشت و صحرا میں نالہ زاری کی ہو تو کی ہو یہاں ایک ایک گھڑی کا ایک ایک لمحہ ایسا گذر چکا ہے کہ سینکڑوں آہیں اندر ہی اندر ٹھنکی ہیں۔ ہزاروں شورشیں سینہ کے اندر چلی ہیں، آنسوؤں کو آنکھوں کی وسعت نہ ملی تو دل کے گوشہ ہی میں طوفان اُٹھاتے رہے.......

"اگرچہ اس معاملہ کا خاتمہ بظاہر ناکامی و مایوسی پر ہوا لیکن فی الحقیقت فتح و مراد کی ساری شادمانی اسی کامیابی میں پوشیدہ تھی.....

"وہی دنیا جس کے میکدۂ خود فراموشی نے غفلت کے جام لنڈھائے تھے اپنے ہر جلوہ سے آنکھوں کو، اپنے ہر نغمہ سے کانوں کو سرمستی و سرشاری کی پیہم دعوتیں دی تھیں اب اس کا کونہ کونہ، چپّہ چپّہ ہوشیاری و بینش کا مُرقع تھا، بصیرت و معرفت کا درس تھا۔

ہو۔ کتنے ہی پردے ہیں جو اسی کج نظری وکثرت بینی نے جمال حقیقت یگانہ و یک رنگ پر ڈال رکھے ہیں ورنہ

یک چراغ ست دریں خانہ کہ از پرتو آں ہر کجا می نگری ، انجمنے ساختہ اند

بلاشبہ یہ بھی لغزش تھی لیکن اس لغزش کو کیا کہو گے جو محبوب کے قدموں پر گرا دے ؟ مقصود تو ساری باتوں سے اس تک پہنچنا ہے اگر لغزش دستی ہی رہنما بن جائے تو پھر کیوں نہ ہزار استغنائیں اس پہ قربان ہوں، لاکھوں خوشیاں اس پر نچھاور

گر طمع خواہد ز من سلطانِ دیں خاک بر فرقِ قناعت بعد ازیں

اصل یہ ہے کہ اس راہ کا سارا دارومدار قطع و وصل اور شکستگی و پیوستگی پر ہے اور قرب ایک منزل ہے جس تک پہنچنے کی راہ بُعد ہی میں سے ہو کر نکلی ہے۔ یعنی ایک سے ملنے کے لئے سب کو چھوڑنا اور ایک سے جُڑنے کے لئے سب سے کٹنا، اس دروازہ کا کھلنا اس پر موقوف ہے کہ وہ تمام دروازے بند کر دئے جائیں جو پہلے کھول لئے تھے۔

در قبولِ منظرِ عشق ہزاراں شرط ست اوّل از عافیتِ رفتہ ندامت باشد

. . . .

" تو اب اصلی کام یہ تھا کہ یہ ساری بندشیں کٹیں اور پرستش ماسوائے اللہ کی ساری زنجیریں ٹوٹیں۔ اس کے لئے دو ہی صورتیں ہیں، یا تو کوئی ایسا طاقت ور ہاتھ آمادۂ عقدہ کشائی ہو کہ گن گن کر ایک ایک گرہ کھول دے۔ ایک کے بعد ایک ساری زنجیریں کھلتی جائیں۔ یا پھر ایک تلوار چمکے جس کا ایک ہی بھرپور ہاتھ چشم زدن میں ساری بندشوں اور زنجیروں کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے رکھ دے، نہ ناخن گرہ کشائی کی منّت پذیری، نہ زنجیروں کی حلقہ شماری کا انتظار ایک سوکھی لکڑی کو جلانے کے لئے ہزاروں تدبیریں کیجئے جب کہیں آگ سے دھواں اُٹھے۔ لیکن معلوم ہے کہ ہزاروں آشیانوں اور خرمنوں کے لئے بجلی کی ایک ہی نظرِ شعلہ بار کافی ہوتی ہے۔

گفتم چہ گونہ می کشی و زندہ می کنی از یک نگاہ کشت، جوابے دگر نداد

. . . .

یہ اس کی خوش نصیبی سہی لیکن ہم بھی اس کو بدنصیبی نہیں سمجھ سکتے کہ کتنی ہی دلدلوں سے پاؤں نکالے، کتنی ہی جھاڑیوں میں دامن سنبھالا، کتنی ہی زنجیریں توڑنی پڑیں، ولولوں، امنگوں امیدوں، تمناؤں کے کتنے ہی دفتر خود اپنے ہاتھوں سے جلانے پڑے جب کہیں جاکر اس کوچہ میں دم لے سکے جہاں آج اپنے آپ کو پا رہے ہیں ....

یہ مسلمانوں کے مذہبی فکر کا ایک کارنمایاں ہے کہ پابندیٔ مذہب اور تصوف میں مطابقت کردی اور مذہبی غلو جو شرعی پابندیوں کے اظہار میں بطور ریا داخل ہوگیا تھا اس کی اصلاح جوشِ ایمانی کی قدر و منزلت بڑھا کر کردی۔ خدا کی نگاہ میں منفعل گنہ گار کو اس محتاط متبع شریعت سے جس کی طاعت رسمی و رواجی ہو لیکن دل سرد ہو، اکثر زیادہ بلند مرتبہ مرحمت ہوا ہے۔ لیکن تذکرہ محض آزادی کی حمایت نہیں تھا۔ اس کے برخلاف مولانا آزاد پابندیٔ مذہب کی، اُن لوگوں کی پابندیٔ مذہب کی جنھوں نے حق اور کلمۃ الحق کی زمانہ ساز فقیہوں اور غیر محتاط صوفیوں اور بے دین حکمرانوں کے مقابلہ میں حمایت کی، اپنے مخصوص زورِ بیان سے تصدیق کرتے ہیں۔ وہ کسی طریقۂ خیال کے پیرو نہیں ہیں۔ وہ قرآن کی یا شریعت کی کوئی خاص تفسیر پیش نہیں کرتے ان کا خاص تعلق رحمت سے معلوم ہوتا ہے۔ اور ایسا خاص تعلق ظاہر ہوتا ہے کہ جس سے یہ مفہوم ہوتا ہے کہ صحیح پابندیٔ مذہب رحمت سے راسخ العقیدگی ہے۔

تذکرہ مولانا آزاد کے خاندان کے مختصر حال سے شروع ہوتا ہے:

"میرے خاندان میں تین مختلف خاندان جمع ہوئے ہیں اور تینوں خاندان ہندوستان و حجاز کے ممتاز بیوت علم و فضل اور اصحاب ارشاد و ہدایت میں سے ہیں۔ دنیوی عزت و جاہ کی اگرچہ اُن میں سے کسی نے خواہش نہیں کی لیکن دنیا نے اپنی عزتوں اور شوکتوں کو ہمیشہ ان کے سامنے پیش کیا اور کبھی انھوں نے قبول کیا، کبھی رد کردیا۔"

مولانا آزاد یہ تذکرہ، یہ ظاہر کرنے کے لئے کرتے ہیں کہ ان کا یہ خیال نہیں ہے کہ کسی خاندان سے متعلق ہونا کوئی اعزاز اور مباہات کی بات ہے۔ اس کے بعد وہ شیخ جمال الدین (د۔ ۱۵۸۱) کا ذکر کرتے ہیں جو ان کے مادری اجداد میں سے تھے۔ اس کے بعد وہ اس زمانہ

ذرّے ذرّے کو گرم گفتار پایا، پتہ پتہ کو مکتوب دستور دیکھا، مچھلیوں نے زبان کھولی، پتھروں نے اُٹھ اُٹھ کر اشارے کئے، خاکِ پامال نے اُڑ اُڑ کر گہر افشانیاں کیں، آسمانوں کو بار بار اُترنا پڑا تاکہ سوالوں کا جواب دیں، زمین کو کتنی بار اُچھالنا پڑا تاکہ فضاءِ آسمانی کے تارے توڑ لائیں، فرشتوں نے بازو تھامے کہ کہیں لغزش نہ ہو جائے۔ سورج چراغ لے کر آیا کہ کہیں ٹھوکر نہ لگ جائے۔ سب نے نقاب اُتار دیئے، سارے پردے چاک ہو گئے، سب کی ابروؤں میں اشارے تھے، سب کی آنکھوں میں حکایتیں بھری تھیں ......

" حالات ابتداء سے جیسے اور جتنے رہے، سب کے سب اس حالت سے یکسر متضاد تھے جن کی بتدریج رسائی میسر آئی، قطع نظر اس معاملۂ خاص کے عقائد، اعمال، عادات خصائل، فکر و نظر، طرز و روش، کوئی بات تو ایسی نہیں ہے جس کو اپنے قدرتی حالات کے مطابق پاتا ہوں۔ پس اپنی شکستگی و خستگی نہ تو کسی ہاتھ کی ممنون ہے نہ کسی زبان کی، نہ کسی خاندان کی، نہ تعلیم و تربیتِ ظاہری کی۔ جو کچھ پایا ہے صرف بارگاہِ عشق سے پایا ہے جتنی رہنمائیاں ملیں صرف اسی مُرشد فیض و ہادی طریق سے ملیں ....

" علم کا دروازہ اسی نے کھولا، عمل کی حقیقت اسی نے بتلائی، معرفت کے صحیفے اس کی زبان پر تھے، حقیقت کے خزانے اس کے دستِ کرم میں تھے۔ شریعت کے حقائق کا وہی معلّم تھا، طریقت کے نشیب و فراز میں وہی رہبر تھا، قرآن کے بھید اُسی نے بتلائے۔ سنۃ کے اسرار اُسی نے کھولے، نظر اُسی نے دی، دل اُس نے بخشا، کون سی مشکل تھی جو اس سے حل نہ ہوئی۔ کون سا اُلجھاؤ تھا جو اس کی سُلجھی ہوئی نظر سے نہ سلجھ گیا؟ کون سی بیماری تھی جس کی دوا اُس کے دارالشفا سے نہ مل سکی؟ ......

" ہاں یہ ضرور ہے کہ اگر کسی کو اوّل روز سے اپنے زہد و پاکی کی خشک دامنی پر ناز ہو تو ہم کو بھی اپنی اُس رندی اور ہوسناکی کی تر دامنی کا کوئی شکوہ نہیں جس کو عینِ اکیس بائیس برس کی عمر میں (کہ جنونِ شباب کی سرمستیوں کا اصلی موسم ہوتا ہے) دونوں ہاتھوں سے اس طرح نچوڑا کہ ایک قطرہ بھی باقی نہ چھوڑا۔ کوئی صاف راہ پر دوڑتا ہوا گیا ہے تو

اُن کے بیانات کو فقہی تنقیحات کا موضوع نہ بنائیں بلکہ اُن کے بیانات میں جو کچھ حق ہو اس کو اخذ کریں۔

مولانا آزاد کے نزدیک پابندیٔ مذہب پر فخر و مباہات اور اعمال سے غفلت قابلِ نفرت ہے۔ وہ اپنی تمام انشاء پردازی کی قوت کو ایسے لوگوں کی بزرگی اور علوِ مرتبت بیان کرنے میں صرف کرتے ہیں، جیسے شیخ علائی (د۔ ۱۵۵۰) شیخ نیازی، شیخ جمال الدین، جنھوں نے کلمۂ حق کی حمایت کی اور زمانہ ساز علماء مثل مولانا عبداللہ سلطان پوری اور شیخ عبدالنبی کی فاسقانہ اور تباہ کن حکمتِ عملی کی مخالفت کی۔

یہ دونوں علماء اس طبقہ کے تھے جس نے شریعتِ اسلامی میں غیرواقعی تاویلات، غلط اجتہاد اور پاکیزہ اخلاق کے اصولوں سے عدم توجہی کو داخل کر دیا۔ مولانا آزاد اُن ہی حالات کا اعادہ اور تکرار اکبر کے زمانہ میں دیکھتے ہیں جو اس سے پہلے زمانوں میں اللہ والوں کو برداشت کرنا پڑے۔ جیسے امام حسین علیہ السلام، شیخ سعید ابن مصعب، امام مالک، امام حنبل، امام ابن تیمیہ، وہ اپنے زمانہ میں شک، تذبذب اور بے دینی کی لعنت دیکھتے ہیں اور اس کو ایسے شغف، سرجوشی اور کمال وثوق سے بیان کرتے ہیں کہ اس کی مثال اردو ادب میں نہیں ہے۔ وہ یہ محسوس کرتے ہیں کہ وہ اعلائے حق کرنے والے ہندوستان میں اکیلے نہیں ہیں بلکہ اُن شخصیتوں کے علاوہ جن کا ذکر آیا ہے شیخ سلامی (د۔ ۱۵۴۷) شیخ داؤد (د۔ ۱۵۷۴) شیخ احمد سرہندی اور شاہ ولی اللہ وغیرہ نے اس سے پہلے حمایتِ حق کی۔

ایقان کے لئے ولولہ کی، تمام زندگی عمل صالح کے لئے وقف کرنے کی، بدکاروں سے مقابلہ کرنے کے عزم کی اور اللہ کے فکر و غم میں شرکت کرنے کی ضرورت ہے۔ تذکرہ بہ خاص طور پر اسلامی روایات کا ذکر ہے اور یہ مولانا آزاد کے ارتقائے خیال کا نسبتاً ایک غیرپختہ منزلہ ہے جس میں ان کی بعد کی تصنیف ترجمان القرآن کی عالمگیریت کم ظاہر ہوتی ہے۔ ان دونوں تصانیف کے درمیان یقیناً پندرہ بیس برس کا تفاوت ہے۔ یہ دونوں قطعاً مختلف حالات میں لکھی گئی ہیں۔ یہ گفتگو ہو سکتی ہے کہ جس کیفیتِ مزاج میں تذکرہ لکھا گیا اس میں تبدیلی

کا ذکر کرتے ہیں جس میں شیخ جمال الدین تھے۔ وہ اکبر کا عہد تھا۔ اکبر نے مرتبۂ خلافت و امامت کا ادّعا کیا تھا۔ یہ زمانہ اختلاف ہی تھا۔ بلکہ اس وقت شدید ذہنی فساد برپا تھا۔ صوفی جو وحدت وجود کا عقیدہ رکھتے تھے، بھگت جو لاغیریت کو مٹا دینا چاہتے تھے، صاحبانِ تہذیب جو ہر چیز میں، ہر جگہ ذہنی غذا کے جویا تھے، سیاست پیشہ جو حکومت کی ضرورت سے اتحاد کے لیے کوشاں تھے، عورتیں، جو خانذانی زندگی میں تفریحات اور مراسم کے اضافہ سے تنوع پیدا کرنا چاہتی تھیں ان سب نے ایسی صورت حالات پیدا کر دی تھی جس سے معلوم ہوتا کہ گویا انسان اخلاقی احکام کی پابندی کے بغیر رہ سکتا ہے۔

لیکن اس صورت حالات میں بھی جو لوگ۔ ایقان کا آذرکار ہے اور مذہبی وجوہ سے ان علماء کے مقابلہ میں جو اس زمانہ کے حالات کو قائم رکھنا اپنا حق سمجھتے تھے اپنے آپ کو خطرہ میں ڈالا۔ مولانا آزاد جس خاص واقعہ کا تذکرہ میں ذکر کرتے ہیں اس میں حملہ کے بانی، زمانہ ساز علماء ہی تھے اور حامیٔ حق سیّد محمدؒ جونپوری تھے۔ سیّد محمدؒ کے اوپر الزام لگایا گیا تھا کہ انھوں نے اپنے مہدی ہونے کا اعلان کر دیا ہے۔ یہ مسلمانوں کا ایک عقیدہ ہے کہ آخر زمانہ میں قیامت سے پہلے امام مہدی ظاہر ہوں گے۔ مخالفت کرنے والے علماء نے سیّد محمدؒ کی تعلیمات کی مخالفت اور ان کی اخلاقی اور مذہبی حیثیت کو دباتے میں اپنی تمام طاقت اور اثر صرف کر دیا۔ ظاہری مخالفت سیّد محمدؒ کے مہدیت کے دعویٰ کی تھی۔ مولانا آزاد نہایت اہمیت سے بیان کرتے ہیں کہ اصل مقصد مخالفت سیّد محمدؒ کے تجدیدی رجحان، دعوتِ کلمۃ الحق اور اسوۂ حسنہ حضرت رسول کریم علیہ التحیۃ والتسلیم کی دعوت کو دبانا تھا۔

سیّد محمدؒ کے اوپر الزام لگایا گیا کہ وہ ایسی باتیں کہتے ہیں جو صریحاً کفر ہیں اور اس سے مولانا آزاد کو یہ گفتگو کرنے کا موقعہ ملتا ہے کہ جن لوگوں کو اللہ تعالیٰ نے مستقل کیفیت وجدان پر فائز کیا ہے وہ کس حد تک اپنے بیانات کے ذمہ دار ہیں اور جس آزادیٔ بیان کے وہ مستحق ہیں وہ ان کو ملنی چاہیئے۔ یہاں مولانا آزاد کی کیفیت بھی واضح ہو جاتی ہے۔ اللہ والے لوگ اس فضل سے پہچانے جاتے ہیں جو ان پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے۔ اس زمانہ کے مومنوں پر واجب ہے کہ

گوپی ناتھ امن لکھنوی

مولانا آزاد۔ غبارِ خاطر کے آئینے میں!

یوں تو پچھلی صدی سے اب تک اردو میں خطوں کے کئی مجموعے شائع ہوئے لیکن پچھلی صدی میں غالب کے خطوط (اردوئے معلیٰ اور عودِ ہندی) اور موجودہ صدی میں مولانا آزاد کے مجموعۂ خطوط (غبارِ خاطر) کو طرۂ امتیاز حاصل ہے۔ دونوں کا اندازِ نگارش جدا لیکن دونوں نے بات میں بات پیدا کی ہے۔ مولانا کی زندگی غالب سے کہیں زیادہ ہمہ گیر تھی اس لئے ان کے خطوط میں جو نکات اور مسائل پائے جاتے ہیں وہ غالب کے ہاں نہیں، پھر بھی غبارِ خاطر میں مولانا نے سیاسیات کے تذکرہ سے گریز کیا ہے اگر کہیں اشارے ہیں تو اس انداز میں کہ مکتوب الیہ سہہ جائے۔ غالب کے خطوط مختلف دوستوں، محسنوں، شاعروں اور شاگردوں کے نام ہیں۔ مولانا کے خطوط صرف ایک ہی ہستی کے نام یعنی صرف نواب صدر یار جنگ مکتوب الیہ ہیں۔ غالب نے گھر بیٹھے خطوط لکھے، مولانا کے بیشتر خطوط جن پر غبارِ خاطر مشتمل ہے، قلعہ احمد نگر کی نظر بندی کے زمانے کے لکھے ہوئے ہیں یہ بھی ایک بڑا فرق ہے۔ یہ خطوط مکتوب الیہ تک پہنچتے نہیں تھے لیکن مولانا کے دل کی تسلی ہو جاتی تھی۔ گویا ان کی نوعیت میگھ دوت سے ملتی ہے جہاں ایک گندھرپ بادلوں سے مخاطب ہو کر اپنے دل کے جذبات بیان کر دیتا ہے۔ مجھے خود بھی سزا یافتہ اور نظر بند کی حیثیت سے جیلوں میں رہنے کا اتفاق ہوا ہے اور میرا یہ تجربہ ہے کہ جیل کی زندگی جسے عام طور پر بے چارگی کی زندگی سمجھا جاتا ہے بڑی شدت کی زندگی ہوتی ہے یعنی سیاسی قیدیوں اور نظر بندوں

واقع ہو گئی ہو۔ مولانا آزاد کی سیاسی مصروفیات نے اس بات کو اُن پر واضح کیا کہ تصوّرِ حق و صداقت میں نیک کام کرنے کے فراخ تر میدان کا شامل ہونا روحانی ضرورت ہے۔ اور اس تخیل نے ان کا تصوّرِ حق و صداقت اور زیادہ وسیع کر دیا ہو۔

لیکن واقعات ایک دوسرے رُخ کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ مولانا آزاد میں تبدیلی نہیں ہوئی۔ وہ مسلم رہنما سے ہندوستان کے سیاسی لیڈر نہیں بنے۔ تذکرہ سے اس کیفیتِ مزاج کی تصویر نظر آ جاتی ہے جس کیفیت میں وہ قومی تحریک سے نہایت مؤثر ہو گئے تھے کہ حق کی حمایت کریں اور اپنے ساتھ زیادہ سے زیادہ ایسے لوگوں کو شامل کریں جو اُن کی روحانی زبان سمجھتے ہوں اور عظیم اخلاقی روایات کی حمایت کرنے کے لئے طلب کئے جا سکیں۔ ان کا تمام استدلال اپنے اندر وہ وعدہ مضمر رکھتا ہے جو ترجمان القرآن کے اندر پورا ہوا۔ کلمۃ الحق کی تشریح اور تفسیر کا وعدہ، تذکرہ اور ترجمان القرآن ایک دوسرے کے مُتمّم ہیں اور ترجمان القرآن کی روشنی میں تذکرہ نے تبلیغِ عقیدہ کو اپنے خطیبانہ طرزِ بیان میں پیش کر کے عالم گیر مقبولیت اور رفعت حاصل کی ہے۔

سکتا۔ میں نے دنیا کو ایسی جرأتوں کا شروع سے موقع ہی نہیں دیا۔ وہ جب
جاگتی ہے تو میں سو رہتا ہوں جب سو جاتی ہے تو اُٹھ بیٹھتا ہوں۔"

اس آخری جملے سے گیتا کے دوسرے ادھیائے کا یہ شلوک ذہن میں آ جاتا ہے جو مہاتما گاندھی کے وظیفۂ شام و سحر میں داخل تھا

یا نشا سرو بھوتا نام تسیام جاگرت سنیمی
لیسیام جاگرت بھوتانی سا نشا پشتو منہہ

(جو تمام مخلوق کے لئے رات ہوتی ہے اس میں جوگی جاگتا ہے
اور جس میں تمام مخلوق جاگتی ہے اُسے رات دکھائی دیتی ہے)

یعنی ان منتخبانِ روزگار کی سحر و شام عوام سے الگ بلکہ متضاد ہوتی ہے۔

اسی انفرادیت نے مولانا میں بے پناہ قوتِ برداشت پیدا کر دی تھی اسی کی طرف اشارہ کرتے ہیں :۔

"مرزا غالب نے رنجِ گراں نشیں کی حکائیتیں لکھی تھیں صبرِ گریز پا کی شکائیتیں کی تھیں

کبھی حکایتِ رنجِ گراں نشیں لکھئے   کبھی شکایتِ صبرِ گریز پا کہئے

لیکن یہاں نہ رنج کی گراں نشینیاں ہیں کہ لکھوں نہ صبر کی گریز پائیاں ہیں کہ سناؤں
رنج کی جگہ صبر کی گراں نشینیوں کا خوگر ہو چکا ہوں صبر کی جگہ رنج کی گریز پائیوں کا تماشائی رہتا ہوں۔"

سب سے سخت امتحان کا وقت مارچ۔ اپریل ۱۹۴۳ء کا تھا۔ مولانا کی گرفتاری کے وقت بھی ان کی اہلیہ بیمار تھیں۔ مارچ میں حالت زیادہ خراب ہو گئی اور اپریل میں رحلت فرما گئیں۔ اس درمیانی وقفہ میں جیل کے سپرنٹنڈنٹ اور مولانا کے جیل کے ساتھیوں نے چاہا کہ کوئی سبیل نکالی جائے کہ مولانا رفیقۂ حیات کا آخری دیدار کر لیں مگر مولانا کی طبعِ غیور نے اسے گوارا نہ کیا۔ مولانا لکھتے ہیں :۔

کی طبیعت کے پورے جوہر جیل میں کھلتے ہیں۔ مولانا اس نظربندی کی حالت میں اپنے اصل روپ میں نظر آتے ہیں۔ ورنہ وہ عام نظروں میں یا مولوی ہیں یا سیاسی رہنما پھر اس کے بعد وزیرِ تعلیم اور ان میں سے ہر حیثیت میں ان سے کہا جا سکتا ہے کہ

ع نرخ بالا کُن کہ ارزانی ہنوز

ان خطوں میں مولانا کی انفرادیت نظر آتی ہے۔ وہ آزاد جو زمانے کو للکارتا ہے کہ مجھے رُلا کر تو دیکھ۔ دل درد مند رکھتا ہے اور روتا نہیں۔ لذتِ غم کے مزے لیتا ہے اور چہرے پر شکن نہیں آنے دیتا (توبہ توبہ میں صیغۂ واحد غائب میں لکھنے لگا) ہاں تو مولانا فرماتے ہیں:۔

"جس قید خانے میں صبح ہر روز مسکراتی ہو جہاں شام ہر روز پردۂ شب میں چھپ جاتی ہو جس کی راتیں کبھی ستاروں کی قندیلوں سے جگمگانے لگتی ہوں کبھی چاندنی کی حسن افروزیوں سے جہاں تاب رہتی ہوں۔ جہاں دوپہر ہر روز چمکے، شفق ہر روز نکھرے، پرند ہر صبح و شام چہکیں اُسے قید خانہ ہونے پر بھی عیش و مسرت سے خالی کیوں سمجھ لیا جائے؟"

اسی طرح سونے جاگنے کے معاملے میں لکھتے ہیں:۔

"زندانیوں کے اس قافلہ میں کوئی نہیں جو سحر خیزی کے معاملہ میں میرا شریکِ حال ہو ...... زندگی کی بہت سی باتوں کی طرح اس معاملہ میں بھی ساری دنیا سے الٹی ہی چال میرے حصہ میں آئی۔ دنیا کے لئے سونے کا جو وقت سب سے بہتر ہُوا وہی میرے لئے بیداری کی اصل پونجی ہوئی، لوگ ان گھڑیوں کو اس لئے عزیز رکھتے ہیں کہ خوابِ شیریں کے مزے لیں۔ میں اس لئے عزیز رکھتا ہوں کہ بیداری کی تلخ کامیوں سے لذت یاب ہوتا ہوں

خلق را بیدار باید بود ز آبِ چشمِ من
ویں عجب کاندم کہ می گریم کسے بیدار نیست

ایک بڑا فائدہ اس عادت سے یہ ہُوا کہ میری تنہائی میں اب کوئی خلل نہیں ڈال

اٹھائی ہوئی تھی۔"

جہاں تک اثاثیتی ادبیات کا تعلق ہے مولانا نے ۹ جنوری ۱۹۳۱ء کے خط میں اس پر بحث کی اور اسے پڑھ کر یہ محسوس ہوتا ہے کہ تجائی ادب کتنا حقیر ہے۔ یہی نہیں بلکہ خطیبانہ ادب اور عوامی ادب کی حقیقت بھی کھل جاتی ہے۔ اس خط میں دنیا کی چند عظیم ہستیوں کے اندازِ فکر کا جو جائزہ لیا گیا ہے وہ دنیا کے ادب میں قابلِ قدر اضافہ ہے۔

مذہبی رواداری | مولانا مسلمان تھے، خاندانی عالم تھے، ترجمانِ قرآن فقہ و احادیث کے تمام رموز سے باخبر لیکن باایں ہمہ وہ کٹر ملّا نہیں تھے۔ چنانچہ اکتوبر ۱۹۴۲ء کے خط میں الٰہیات پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں :-

" دنیا میں وحدت الوجود کے عقیدہ کا سب سے قدیم سرچشمہ ہندوستان ہے غالباً یونان و اسکندریہ میں بھی یہیں سے یہ عقیدہ پہنچا اور مذہب افلاطون جدید نے جسے غلطی سے عربوں نے افلاطون کا مذہب خیال کیا تھا اس پر اپنی اشراقی عمارتیں استوار کیں۔ یہ عقیدہ حقیقت کے تصور کو ہر طرح کے تصوری تشخصات سے منزّہ کر کے ایک کامل مطلق تصوّر قائم کر دیتا ہے۔ اس تصوّر کے ساتھ صفات متشکل نہیں ہو سکتیں اور اگر ہوتی بھی ہیں تو تعینات و مظاہر کے اعتبار سے نہ کہ ذات مطلق کی ہستی کے اعتبار سے، اس عقیدہ کا روشناس اس کی ذات کے بارے میں یہ بجز اس کے کہ ہے اور کچھ نہیں کہہ سکتا۔ کیونکہ اگر ہم اپنے اشارات کی پرچھائیں بھی اس پر پڑنے دیتے ہیں تو وہ ذاتِ مطلق مطلق نہیں رہتی، تشخص اور خیال کے حدود سے آلودہ ہو جاتی ہے۔ بابا افغانی نے دو مصرعوں کے اندر سب کچھ کہہ دیا ہے۔

مشکل حکایتے ست کہ ہر ذرہ عین اوست
امانمی تواں کہ اشارت بہ او کنند

یہی وجہ ہے کہ ہندوستان کے اپنشدوں نے نفی ثبات کی راہ اختیار کی اور

"جس دن تار ملا اُس کے دوسرے دن سپرنٹنڈنٹ میرے پاس آیا اور یہ کہا کہ اگر میں اس بارے میں حکومت سے کچھ کہنا چاہتا ہوں تو وہ اسے فوراً بمبئی بھیج دے گا۔ درمیان کی پابندیوں اور مقررہ قاعدوں سے اس میں کوئی رکاوٹ نہیں پڑے گی۔ وہ صورتِ حال سے بہت متاثر تھا اور اپنی ہمدردی کا یقین دلانا چاہتا تھا لیکن میں نے اس سے صاف صاف کہہ دیا کہ میں حکومت سے کوئی درخواست کرنی نہیں چاہتا۔ پھر وہ جواہر لال کے پاس گیا اور ان سے اس بارے میں گفتگو کی۔ وہ سہ پہر کو میرے پاس آئے اور بہت دیر تک اس بارے میں گفت گو کرتے رہے۔ میں نے ان سے بھی وہی بات کہہ دی جو سپرنٹنڈنٹ سے کہہ چکا تھا۔ بعد کو معلوم ہوا کہ سپرنٹنڈنٹ نے یہ بات حکومتِ بمبئی کے ایماء سے کہی تھی۔"

غالب کا یہ شعر غالب سے زیادہ مولانا کے کیریکٹر پر صادق آتا تھا ؎

تشنہ لب بر ساحلِ دریا ز غیرت جاں دہم　　گر بہ موج افتد گمانِ چینِ پیشانی مرا

مولانا کے چند جملوں سے اُن کی اُس انفرادیت کا اندازہ کیجیے۔

"لوگ بازار میں دکان لگاتے ہیں تو ایسی جگہ ڈھونڈھ کر لگاتے ہیں جہاں خریداروں کی بھیڑ لگتی ہو۔ میں نے جس دن اپنی دکان لگائی تو ایسی جگہ ڈھونڈھ کر لگائی جہاں کم سے کم گاہکوں کا گذر ہو سکے

درکوئے ما شکستہ دلی مے خرند و بس　　بازارِ خود فروشی ازاں سوئے دیگر است

مذہب میں، ادب میں، سیاست میں فکر و نظر کی عام راہوں میں جس طرف بھی نکلنا پڑا کسی راہ میں بھی وقت کے قافلوں کا ساتھ نہ دے سکا۔

بازنیست ز خود رفتہ سفر دست نہ داد　　سیرِ صحرائے جنوں حیف کہ تنہا کردیم

جس راہ میں بھی قدم اُٹھایا وقت کی منزلوں سے اتنا دور ہو گیا کہ جب مڑ کے دیکھا تو گردِ راہ کے سوا کچھ دکھائی نہیں دیتا تھا اور یہ گرد بھی اپنی ہی تیز رفتاری کی۔

دیتا ہوا اور داہنے بائیں نظر ڈالتا ہوا فوراً موجود ہوتا ہے اور آتے ہی اُچک کر کسی بلند جگہ پر پہنچ جاتا ہے۔ پھر اپنے شیوۂ خاص میں اس تسلسل کے ساتھ چوں چاں چوں چاں چوں چاں شروع کر دیتا ہے کہ ٹھیک ٹھیک قاآنی کے واعظک جامع کا نقشہ آنکھوں میں پھر جاتا ہے ...... فرمایئے اگر اس کا نام ملاّ نہ رکھتا تو اور کیا رکھتا "

اور جس چڑے کا نام صوفی رکھا ہے اس کے صفات یوں بیان کرتے ہیں :

" ٹھیک اس کے برعکس ایک دوسرا چڑا ہے 'تعرف الاشیا بہ اضدادہم' اسے جب دیکھئے اپنی حالت میں گم اور خاموش ہے

کاں را کہ خبر شد خبرش باز نیامد

بہت کیا تو کبھی کبھار ایک ہلکی سی ناتمام چوں کی آواز نکال دی اور اس ناتمام چوں کا بھی انداز لفظ و سخن کا نہیں ہوتا بلکہ ایک ایسی آواز ہوتی ہے جیسے کوئی آدمی سر جھکا کے اپنی حالت میں گم پڑا رہتا ہو اور کبھی کبھی سر اُٹھا کے 'ہا' کر دیتا ہو۔

تا تو بیدار شوی نالہ کشیدم ورنہ   عشق کاریست کہ بے آہ و فغاں نیز کنند

دوسرے چڑے اس کا پیچھا کرتے رہتے ہیں گویا اس کی کم سخنی سے عاجز آ گئے ہیں۔ پھر اس کی زبان کھلتی نہیں البتہ نگاہوں پر کان لگائیے تو ان کی صدائے خاموش سنی جا سکتی ہے۔

تو نظر باز نۂ ورنہ تغافل نگہ ست   تو سخن فہم نۂ ورنہ خموشی سخن ست

میں نے یہ حال دیکھا تو اس کا نام صوفی رکھ دیا۔"

چاء سگریٹ کھانے پینے کے معاملے میں گاندھی جی اور مولانا آزاد کے نظریوں میں بڑا اختلاف نظر آتا ہے۔ گاندھی جی چاء کو زہر اور مل کی بنی ہوئی چینی کو سفید زہر کہا کرتے تھے۔ لیکن مولانا نے چاء کی تعریف میں بائیس صفحے لکھ دئے۔ گاندھی جی نے شکر کی جگہ گُڑ استعمال کرنے

تہذیب کی "نیتی نیتی" کو بہت دور تک لے گئے۔ لیکن پھر دیکھئے کہ اسی ہندوستان کو اپنی پیاس اس طرح بجھانی پڑی کہ نہ صرف برہما ذات مطلق کو ایشور (ذات متصف و متشخص) کی نمود میں دیکھنے لگے بلکہ پتھر کی مورتیاں بھی تراش کر سامنے رکھ لیں کہ دل کے اٹکاؤ کا کوئی ٹھکانا تو سامنے رہے۔

کرے کیا کعبہ میں جو سر بتخانہ سے آگہ ہے
یہاں تو کوئی صورت بھی ہے واں اللہ ہی اللہ ہے "

مولانا کی تفسیر قرآن میں ان کی مذہبی رواداری اپنے بھرپور روپ میں نظر آتی ہے۔ اس اعتبار سے 'ترجمان القرآن' کا مقابلہ لوکمانیہ تلک کے 'گیتا رہسیہ' سے کیا جا سکتا ہے۔ ان دونوں کتابوں کا گہرا مطالعہ کرنے والا حقیقی معنوں میں مذہبی آدمی ہو سکتا ہے فرقہ پرست کبھی نہیں ہو سکتا۔ اسی خط میں مولانا نے آگے چل کر لکھا ہے:۔

"ہندوستان کے اپنشدوں نے ذات مطلق کو ذات متصف میں اتارتے ہوئے جن تنزلات کا نقشہ کھینچا ہے مسلمان صوفیوں نے اس کی تعبیر احدیت اور واحدیت کے مراتب میں دیکھی۔"

اب ذرا ملاحظہ کیجئے کہ مولانا ایک کرّ ملا کو کس نظر سے دیکھتے ہیں۔ مولانا احمد نگر کے قلعہ میں جس کمرے میں نظر بند کئے گئے تھے اس میں چڑیاں بہت تھیں مولانا نے ان میں سے چند کے نام بھی رکھ لئے تھے۔ جس کا نام ملا رکھا تھا اس کے متعلق لکھا کہ:

"ایک چڑا بڑا ہی تنومند اور جھگڑالو ہے۔ جب دیکھو زبان فرفر چل رہی ہے اور سر اٹھا ہوا اور سینہ تنا ہوا رہتا ہے۔ جو بھی سامنے آجائے دو دو ہاتھ کئے بغیر نہیں رہے گا کیا مجال کہ ہمسایہ کا کوئی چڑا اس محلہ کے اندر قدم رکھ سکے۔ کئی شہ زوروں نے ہمت دکھائی مگر پہلے ہی مقابلہ میں چت ہو گئے۔ جب کبھی فرش پر یارانِ شہر کی مجلس آراستہ ہوتی ہے تو یہ سرو سینہ کو جنبش

نافرجام کا اضافہ کیوں کیا جائے۔ اس طرح کے معاملات میں امتزاج وترکیب کا طریقہ کام میں لانا علتوں پر علتیں بڑھانا گویا حکایتِ بادہ وتریاک کو تازہ کرنا ہے۔ میں تسلیم کروں گا کہ یہ تمام خود ساختہ عادتیں بلاشبہ زندگی کی غلطیوں میں داخل ہیں۔ لیکن کیا کہوں جب کبھی معاملہ کے اس پہلو پر غور کیا طبیعت اس پر مطمئن نہ ہو سکی کہ زندگی کو غلطیوں سے یکسر معصوم بنا دیا جائے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس روزگار خراب میں زندگی کو زندگی بنائے رکھنے کے لئے کچھ نہ کچھ غلطیاں بھی ضرور کرنی چاہئیں۔"

اس بے ساختہ برنارڈ شا کی وہ بات یاد آجاتی ہے جو انھوں نے گاندھی جی کی شہادت پر کہی تھی کہ "اس دنیا میں ضرورت سے زیادہ نیک ہونا بھی خطرناک ہے۔"

قوتِ حافظہ ۔ مولانا نے جس طرح ان خطوں میں عربی، فارسی، اردو کے اشعار اور فقروں کو جابجا نقل کیا ہے اس سے ان کے حافظہ کی داد دینی پڑتی ہے۔ ظاہر ہے کہ جیل میں تو ان کے پاس وہ کتابیں تھیں نہیں جن کے اشعار نقل کئے گئے ہیں۔ لیکن مولانا نے اپنی یادداشت کے بل پر حوالے دئے اور ٹھیک دیئے۔ لوکمانیہ تلک نے جب "گیتا رہسیہ" جیل میں لکھی تھی تو انھوں نے بھی بہت حوالے دئے مگر حوالوں کی جگہ اس لئے چھوڑ دی تھی کہ جیل سے باہر پڑھ کی جائے گی۔ اور ایسا ہی ہوا! یہ قوتِ حافظہ مولانا کی یکسوئی طبع کا نتیجہ سمجھنا چاہیئے۔ وہ طوفانوں میں بھی پُرسکون رہ سکتے تھے اور سیاسی ہنگاموں میں بھی اپنی ادبی شان قائم رکھ سکتے تھے۔ یہ بڑی بات ہے جو اس عالمِ آب وگل میں خاص خاص لوگوں کو حاصل ہوتی ہے اشعار اور فقروں کا برمحل حوالہ لاجواب ہے۔ اگر کوئی جواب ملتا ہے تو وکٹورین دور کے آخر ادیب لارڈ اونبری کے یہاں جو "پلیژرس آف لائف" اور "یوزس آف لائف" کے مصنف تھے۔

مولانا فرماتے ہیں:

"بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ کوئی بات برسوں تک حافظہ میں تازہ نہیں ہوتی گویا کسی کونے میں سو رہی ہے پھر کسی وقت اچانک اس طرح جاگ اٹھے گی

کو کھاتے ہیں۔ لیکن مولانا کو اس بات پر تاسف آمیز حیرت ہے کہ جواہر لال ایسا شخص گڑ کھانا پسند کرتا ہے۔ فرماتے ہیں:

"جواہر لال چوں کہ مٹھاس کے بہت شائق ہیں اس لئے گڑ کا بھی بہت شوق رکھتے ہیں۔ میں نے یہاں ہزار کوشش کی کہ شکر کی نوعیت کا یہ فرق جو میرے لئے اس درجہ نمایاں ہے انھیں بھی محسوس کراؤں لیکن نہ کرا سکا اور بالآخر تھک کر رہ گیا۔"

گاندھی جی سفید شکر کے اس لئے خلاف ہیں کہ اس کا غذائی جوہر نکل جاتا ہے۔ لیکن مولانا یہ چاہتے ہیں کہ چاء کے لئے جو شکر ہو وہ بلور کی طرح بے میل اور برف کی طرح شفاف ہو۔ یعنی وہ معمولی چینی سے بھی مطمئن نہیں کیونکہ اُن کے نزدیک یہ دوبارہ شکر اگرچہ صاف کئے ہوئے رس سے بنتی ہے مگر پوری طرح صاف نہیں ہوتی۔ اس غرض سے کہ مقدار کم نہ ہو جائے صفائی کے آخری مراتب چھوڑ دئے جاتے ہیں۔ گاندھی جی اور مولانا آزاد کا یہ اختلاف محض سطحی نہیں۔ بات یہ ہے کہ گاندھی جی کا نظریۂ حیات افادی ہے اور مولانا کا جمالیاتی۔ گاندھی جی سگریٹ کے بھی سخت خلاف ہیں لیکن مولانا فرماتے ہیں:

"میں نے چاء کی لطافت و شیرینی کو تمباکو کی تندی و تلخی سے ترکیب دے کر ایک کیف مرکب پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ میں چاء کے پہلے گھونٹ کے ساتھ ہی متصلاً ایک سگریٹ بھی سلگا لیا کرتا ہوں۔ پھر اس ترکیب خاص کا نسخۂ عمل یوں چلتا ہوں کہ تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد چاء کا ایک گھونٹ لوں گا اور متصلاً سگریٹ کا بھی ایک کش لیتا رہوں گا۔"

اس معاملے میں جب گاندھی جی اور مولانا کے نظریوں یا عمل کو سامنے رکھتے تو یہ نظر آتا ہے کہ پنڈت جواہر لال نہرو کی روش دونوں کے بیچ بیچ ہے۔ مولانا نے خود اس چاء اور سگریٹ کے بارے میں فرمایا ہے کہ:

"آپ نہیں کے چاء کی عادت بجائے خود ایک علت تھی، اس پر مزید علت ...

چھوڑ دئے۔ ہم نے کانٹے چن لئے اور پھول چھوڑ دئے۔"

۳۔"یکسانی بجائے خود زندگی کی سب سے بڑی بے لطفی ہے۔ تبدیلی اگرچہ سکون سے اضطراب کی ہو مگر پھر تبدیلی ہے اور تبدیلی بجائے خود زندگی کی ایک بڑی لذت ہوئی۔ عربی میں کہتے ہیں "حمضوا مجالسکم" اپنی مجلسوں کا ذائقہ بدلتے رہو۔ سو یہاں زندگی کا مزہ بھی انھیں کو مل سکتا ہے جو اس کی شیرینیوں کے ساتھ اس کی تلخیوں کے بھی گھونٹ پیتے رہتے ہیں۔"

ایک سوال اور اس کا جواب: مولانا کی انفرادیت، تنہائی پسندی، علمیت اور فلسفیانہ رُخ سے زندگی کو دیکھنے کی نظر کے ہوتے ہوئے تعجب ہوتا ہے کہ وہ اتنے بڑے لیڈر کیسے بن گئے۔ اس کا جواب ان کی مندرجہ ذیل عبارت کے آخری جملہ میں ہے:

"زمانے کے بہت سے حربے میرے لئے بے کار ہوگئے، لوگ اگر میری طرف سے رُخ پھیرتے ہیں تو بجائے اس کے کہ دل گلہ مند ہو اور زیادہ منت گزار ہونے لگتا ہے۔ کیونکہ ان کا جو ہجوم لوگوں کو خوش حال کرتا ہے میرے لئے بسا اوقات ناقابل برداشت ہو جاتا ہے۔ اگر عوام کا رجوع و ہجوم گوارا کرتا ہوں تو یہ میرے اختیار کی پسند نہیں ہوتی، اضطرار و تکلف کی مجبوری ہوتی ہے۔ میں نے سیاسی زندگی کے ہنگاموں کو نہیں ڈھونڈا تھا، سیاسی زندگی کے ہنگاموں نے مجھے ڈھونڈھ نکالا۔"

اسی وجہ سے مولانا میں خلوت در انجمن اور انجمن در خلوت کی کیفیت رہی بقول پنڈت جواہر لال نہرو کے "ایسا جامع کمالات شخص جس میں قدیم و جدید کی ایسی آمیزش ہو اور جس میں ماضی اور مستقبل کی اتنی صلاحیتیں ہوں اب پیدا ہونا مشکل ہے۔"

جیسے اسی وقت دماغ نے کواڑ کھول کر اندر لے لیا ہو۔ اشعار و مطالب کی یادداشت میں اس طرح کی واردات اکثر پیش آتی رہتی ہیں۔ تیس چالیس برس پیشتر کے واقعات کے نقوش کبھی اس طرح ابھر آئیں گے کہ معلوم ہوگا ابھی ابھی کتاب دیکھ کر اٹھا ہوں۔ مضمون کے ساتھ کتاب یاد آجاتی ہے، کتاب کے ساتھ جلد، جلد کے ساتھ صفحہ اور صفحہ کے ساتھ یہ تعین کہ مضمون ابتدائی سطروں میں تھا یا درمیانی سطروں میں نیز صفحہ کا رُخ کہ دہنی طرف کا تھا یا بائیں طرف کا۔"

محقق | محققوں کی دنیا میں بھی مولانا صفِ اول میں ہیں۔ قلعہ احمد نگر پہنچے تو چند صفحوں میں وہاں کی ساری تاریخ بیان کردی۔ چاء کا بیان کرنے پر آئے تو اس کی تاریخ، قسمیں، پینے کے طریقے سب اس انداز میں بیان کئے کہ چاء نہ پینے والا بھی پورا لطف لے سکتا ہے۔ ۱۷۔ اکتوبر کے خط میں الٰہیات کا ذکر کرتے ہیں تو قدیم عقیدوں سے لے کر جدید یہ تحقیقات تک کے حوالے دل کش اور ذہن کش انداز میں پائے جاتے ہیں۔ ویدوں کے زمانہ سے لے کر آئنسٹائن کی تھیوری تک ان کی طبعِ رسا کی جولانی نظر آتی ہے۔ تمام متمدن ملکوں اور قوموں کے عقیدوں کی کہانی چند صفحوں میں بیان کرکے گویا دریا کو کوزے میں بند کردیا ہے۔ یہی کیفیت ۴ دسمبر کے خط میں ہے جس میں پانچویں صلیبی حملہ کی سرگزشت اور اس کے سیاسی اور مجلسی نتیجوں کا تذکرہ ہے۔

صاحبِ داستان | چڑیا چڑے کی کہانی کے عنوان سے جو خط غبارِ خاطر میں درج ہے۔ اس سے مولانا کی قوتِ بیان کا اندازہ ہوتا ہے۔ الفاظ کی دلکشی، واقعات کا مشاہدہ، ذاتی تجربہ طبیعتوں کا جائزہ غرضیکہ ان داستانوں میں ایک صاحبِ دل کا دل اور ایک صاحبِ نظر کی نظر دکھائی دیتی ہے۔ ایک فلسفی کس طرح قدرتی مناظر کو دیکھتا اور ان کا لطف لیتا اور رنگینی کے ساتھ انھیں بیان کرتا ہے۔ اس کا نمونہ شاید ہی اس سے بہتر کہیں مل سکے۔

چند نشتر | ۔ ان خطوں میں چند در چند نشتر ہیں بہ خوفِ طوالت صرف دو پیش کئے جاتے ہیں۔

۱۔ "جب لوگ کام جوئیوں اور خوش وقتیوں کے پھول چن رہے تھے تو ہمارے حصے میں تمناؤں اور حسرتوں کے کانٹے آئے۔ انھوں نے پھول چن لئے اور کانٹے

دوپہر کا کھانا تو لازمی طور پر ساتھ ہی ہوتا تھا۔ ارہر کی اُبالی دال اور بیچ نکلے ہوئے چاول، یہ ہمارا دوپہر کا کھانا تھا۔ امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد کا کھانا تھا۔ اب روز یہ وقت وہ ہوتا تھا کہ مولانا کی پوری ذہانت اور خطابت ہاتھ جوڑ کر ان کے ذہن کے میدان میں کھڑی ہو جاتی تھی اور مولانا کی زبان بسم اللہ کہے بغیر چل پڑتی تھی، چل نہیں پڑتی تھی طوفان اُٹھاتی تھی اور طوفان بٹھاتی تھی۔ سننے والا اکیلا میں ہوتا تھا، دم بخود بیٹھا رہتا۔ ٹکر ٹکر دیکھا کرتا۔ بھوک کا تقاضا سخت ہوتا "کھانا" سامنے موجود ہوتا مگر ابوالکلام کی زبان آخر ابوالکلام کی زبان تھی رُکتی کیسے۔ مگر بے حد حساس بھی تھے، کہتے "مولوی صاحب! آپ کچھ نڈھال سے دکھائی دیتے ہیں۔ کہیں مرض عشق میں تو مبتلا نہیں ہوگئے۔ کہتے ہیں جس کو عشق خلل ہے دماغ کا"

میں عرض کرتا جناب مدت سے آیتیں قل ھو اللہ پڑھ رہی ہیں۔ اب تو کھانا بھی آچکا ہے اور پڑا ٹھنڈا ہو رہا ہے، کیوں نہ معاف کر دیا جائے۔

اس پر اور زیادہ جوش و خروش سے تقریر شروع ہو جاتی اور دیر پہ دیر کرتے چلے جاتے۔ میری بھوک اور بھوک سے میری بے تابی کا پتا لطف اُٹھاتے۔

آخر کھانے کو نپٹنا ہی پڑتا۔ اب مولانا کی فصاحت و بلاغت ارہر کی اُبالی دال اور بھات کے فضائل بیان کرنے پر ایسی رواں دواں ہوتی کہ اس کا کہیں جواب نہیں۔

میں تو حیرت میں ڈوب ڈوب جاتا۔ ارہر کی دال سب دالوں سے افضل کیوں ہے، اور بگھاری نہ جائے تو تندرستی ہی کے لئے نہیں زندگی کے لئے بھی گارنٹی ہے۔ لیکن بگھار دینے سے دال کے خواص کس طرح بدل جاتے ہیں اور وہ تندرستی کے لئے کیسی خطرناک بن جاتی ہے۔

یہ سب تقریریں اس جلیل القدر انسان کی اس لئے ہوتیں کہ مجھے بہلائے رکھے اور احساس نہ ہونے دے کہ فقر و فاقہ چھایا ہوا ہے۔ میں تو سب کچھ جانتا بوجھتا تھا مگر اَن جان بنا رہتا تھا کہ مولانا کو تکلیف نہ ہو۔ خود مولانا بھی جانتے تھے کہ صورت حال سے باخبر ہوں۔ مگر مجھ سے کچھ فرماتے نہیں تھے۔ میں مہمان تھا اور یہ امیزبان فاقوں پر تھا۔ عجب گو مگو کا معاملہ تھا۔ مگر میرے لئے کھانے سے کہیں زیادہ مولانا کی تقریریں لذیذ تھیں، اور ان دنوں میں دعائیں

عبدالرزاق ملیح آبادی

مولانا آزاد فقر و فاقہ میں!

(کچھ تاثرات)

سن ۱۹۲۳ یا ۱۹۲۴ کی بات ہے کہ مولانا انتہائی مالی مصائب میں مبتلا تھے۔ میں تو گھر ہی کا آدمی تھا۔ ہر وقت کا ساتھ تھا، دوپہر کا کھانا بھی ساتھ ہی ہوتا تھا اور مجھ سے گھر کی کوئی بات بھی چھپ نہیں سکتی تھی۔

دنیا جانتی ہے کہ مولانا انتہا نفاست پسند اور عالی دماغ تھے۔ جو کچھ ہو بہتر سے بہتر ہو، اعلیٰ سے اعلیٰ ہو۔ سگریٹ کے عادی تھے اور قیمتی سے قیمتی سگریٹ پیا کرتے تھے۔ لیکن اس زمانے میں سستے سے سستے، گھٹیا سے گھٹیا سگریٹ پر قانع تھے۔ یقیناً سخت ترین اذیت میں مبتلا ہوں گے۔ آدمی کے لئے ہر مشکل آسان ہے مگر ذہنی کوفت کا جھیلنا آسان نہیں۔ وہ بڑے انسان ہی ہیں جو ذہنی اذیتوں اور دماغی کلفتوں میں بھی اپنے اعصاب پر قابو رکھتے ہیں اور اپنی اندرونی ویرانی کو ظاہر نہیں ہونے دیتے۔

مولانا نے آنکھ کھولی تو سونے کا چمچہ ہاتھ میں تھا۔ بہت بڑے پیر کے نور نظر تھے۔ دولت ہی دولت برستی تھی۔ ایسے آدمیوں کے لئے فقر و فاقہ دوسروں سے کہیں زیادہ مصیبت اور ذہنی اذیت کا سبب بن جاتا ہے مگر میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ مولانا اس فقر و فاقہ میں بھی زیادہ سے زیادہ ہشاش بشاش رہتے تھے۔ کبھی ان کے ماتھے پر بل نہیں دیکھا، کبھی جھنجھلائے نہیں بلکہ ان خشک دنوں میں مولانا کی بشاشت اور ظرافت عروج پہ پہنچ گئی تھی۔

پچوڑیں چلیں ۔ آخر پلاؤ، زردہ، قورمہ اور نہ جانے کیا کیا کھانے طے پا گئے۔

پھر مولانا آزاد، سبحانی مرحوم سے مخاطب ہوئے ۔" مولانا آپ اپنی پسند کا کھانا تجویز کریں ۔" مرحوم نے کئی پہلو بدلنے کے بعد فرمایا ۔" مولانا میں تو دنیا ہی کو چھوڑ چکا ہوں ۔ اناج سے اور اناج کے ہر پکوان سے یک لخت اجتناب ہے ۔ ہما تما سے عہد ہو چکا ہے ۔"

میں نے دیکھا مولانا کا چہرہ تمتما اُٹھا ــــ مگر پھر سنبھل گئے اور ہنس کر فرمایا ۔" مگر مولانا آپ ہوا کھا کر تو زندہ نہیں رہتے ۔" اشارہ تھا کہ آپ اوسر سانڈے تو نہیں ہیں ۔ مولانا سبحانی خفیف ہوئے ۔ پھر فرمایا ۔" مولانا اس فقیر کی زندگی میں ممکن ہوتا ہے تو صرف دو ہی چیزیں کھاتا ہوں ــــ کباب اور رس گُلّے ۔"

اس پر علی بھائیوں کے جو قہقہے بلند ہوئے کاش ریکارڈ کر لئے جاتے ۔ مگر مولانا سبحانی ٹس سے مس نہ ہوئے اور کباب اور رس گلے اتنے کھائے کہ سیر ہو گئے ۔ ماشاءاللہ غذا اچھی خاصی تھی ۔ یاد پڑتا ہے کہ ایک بڑی پلیٹ شامی کبابوں سے بھری تھی اور رس گلے تو مجھے یاد ہیں خود میں نے منگائے تھے ۔ پورے دو سیر، بہترین بنگالی دوکان بھیم ناگ سے ۔

لیکن، اس فقر و فاقہ میں یہ آفت مولانا نے کیسے جھیلی!

روپیہ قرض منگایا گیا ۔ حاجی فقیر محمدؒ پشاوری مرحوم یا حاجی اللہ بخش پشاوری مرحوم سے میں ہی جا کر ۲۰۰ روپے لایا تھا ۔

فقر و فاقہ کے اس زمانے میں مولانا گھر سے باہر نہیں جاتے تھے ۔ مجبوراً جانا ہی پڑتا تو کلکتے میں ٹیکسی پر اور کلکتے کے باہر ریل کے فرسٹ یا سیکنڈ کلاس میں ۔ یہ سب کچھ بھی قرض سے ہی ہُوا کرتا تھا ۔

لیکن ایک دفعہ مولانا کو ٹریم گاڑی پر بھی بیٹھنا پڑا ۔

بات یہ ہوئی کہ مولانا کے اور میرے ایک عرب دوست سید محمد عمری مرحوم تھے ۔ لکھ پتی تھے ۔ سگریٹ کے کارخانے کے مالک تھے ۔ پھر ایسے حالات پیش آئے کہ تمام دولت غائب ہو گئی اور پیسے پیسے کے محتاج ہو گئے ۔ لیکن موٹر ابھی تک باقی تھی اور مولانا کی کوٹھی میں کھڑی ہوتی تھی

کیا کرتا تھا کہ فقرہ وفاقہ پھیلتا چلا جائے اور میں مولانا کی زبان سے بکھرے ہوئے پھول چنتا چلا جاؤں۔

مصیبت کے انھیں دنوں میں مولانا محمد علی، شوکت علی اور ان کے ساتھ آزاد سبحانی کلکتے آئے اور مولانا کے مہمان بن گئے۔ سبحانی صاحب کو مولانا پسند نہیں کرتے تھے۔ اکیلے مولانا ہی نہیں ہر آدمی مرحوم سے دور رہنا چاہتا تھا۔ لائق آدمی تھے، بہترین مقرر بھی تھے۔ مگر کوئی ایسی بات بھی تھی کہ تمام قابلیتوں کے باوجود مقبول نہ ہو سکے اور افسوس ناک طریقے پر زندگی بسر کی۔

ان دنوں مولانا سبحانی گاندھی جی کے "پکے چیلے" بنے ہوئے تھے۔ ننگے سر، ننگے پاؤں، ایک لنگوٹی سر پہ بندھی ہوئی، کھچڑی داڑھی، سر کے کھچڑی بال، بڑی مضحک صورت تھی۔

مولانا آزاد کی نفیس طبیعت دیکھتے ہی منقبض ہو گئی۔ ایک رنگ آتا تھا ایک رنگ جاتا تھا۔ بار بار میری طرف بے بسی سے نگاہیں اٹھاتے تھے۔ بے شک بے بس تھے۔ مہمان کو کہتے تو کیا کہتے۔ لیکن میں خوب سمجھ رہا تھا اور بعد میں مولانا نے خود بھی ظاہر کر دیا کہ مولانا سبحانی کے نازل ہو جانے سے ان کے دل و دماغ کو جو تکلیف پہنچی رانچی کی پوری نظر بندی میں بھی اس کے عشر عشیر سے بھی سابقہ نہ پڑا تھا۔

لیکن یہ شخص کوہِ وقار و حلم بھی تھا۔ فوراً سنبھل گیا اور بڑی خندہ پیشانی سے پہلے علی بھائیوں سے پوچھا "کیا کھاؤ گے؟" آپس میں سخت چشمک تھی، انتہائی رقابت تھی بلکہ دشمنی کہنا بھی شاید خلافِ واقعہ نہ ہو۔ لیکن جب مل جاتے تھے تو بڑی پُر لطف صحبتیں رہتی تھیں۔ ایسی بے تکلفیاں برتی جاتی تھیں کہ بیان میں نہیں آسکتیں۔ شوکت علی مرحوم تو بس "بڑے بھائی" تھے اور بے تکلفی کی صحبتوں میں کہا کرتے تھے۔ "سگ باش برادر خورد مباش" محمد علی محمد علی تھے۔ ان کی ذہانت، فطانت، حاضر دماغی، حاضر جوابی کا ملک بھر میں جواب نہ تھا لیکن ہاں ابوالکلام بھی ابوالکلام تھا اور محمد علی مرحوم پر آخر بھاری ہو ہی جایا کرتا تھا۔

بہر حال مولانا نے بے تکلفی سے ایسی بے تکلفی سے جیسی "لنگوٹیا یاروں" میں ہوتی ہے:۔ علی بھائیوں سے پوچھا۔ کیا کھاؤ گے بلکہ کیا زہر مار کرو گے؟ دونوں بھائی بہت ہنسے۔ خوب خوب

موقع پر کوئی تاریخی واقعہ سنانے لگتے یا پھر کلام اللہ کی کسی آیت پر موتی لٹانے لگتے۔

یہ واقعہ ہے کہ مصیبت کے اس زمانے میں مولانا کی زندہ دلی اور وقار دیکھ کر میں عش عش کیا کرتا تھا۔ حیرت ہوتی تھی کہ اس شخص میں کیسی قوت برداشت ہے۔ خدا پر کیسا بے حساب بھروسہ ہے۔ آدمی مصیبت میں ہی پہنچانا جاتا ہے اور مولانا ہر مصیبت میں خواہ کتنی ہی پڑی رہی ہو، سرفراز ہی رہے۔

لیکن ابھی ایک مضحکہ خیز واقعہ اس داستان کی تکمیل کے لئے باقی ہے۔ اُکتا ڈالنے والے کئی گھنٹوں کے بعد خدا خدا کر کے ریل گاڑی آئی اور ہم سوار ہو گئے۔ چیونٹی کی چال چل کر ریل نے ہمیں کلکتے کے مضافات خضر پور میں اُتار دیا۔ ہر چند تلاش کرتے رہے کوئی ٹیکسی نہ ملی اب شام ہو رہی تھی مجبوراً ٹریم گاڑی میں بیٹھنا پڑا۔ مولانا ٹریم کی بنچ کے بالکل کنارے اس طرح بیٹھے تھے گویا جست لگانے کے لئے بالکل تیار ہیں۔ بیٹھے نہیں بس یوں سمجھئے کہ بنچ پہ ٹکے ہوئے تھے اور گھبرا کر ہر طرف دیکھتے جاتے تھے کہ کسی کی نگاہیں تو نہیں پڑ رہی ہیں۔ بالکل گم سُم تھے۔ ایک اسٹینڈ آیا اور ٹریم ٹھہر گئی۔ ایک دو مسافر داخل ہوئے۔ ٹریم ابھی حرکت میں نہیں آئی تھی کہ ایک مسافر نے زور سے نعرہ مارا۔ "السلام علیکم مولانا!" ساتھ ہی ہاتھ پکڑ کے چومنا شروع کر دیا۔ اب مولانا کی حالت ایسی ہو گئی جیسے تپ دق کا کوئی بیمار آخری مرحلے میں ہو۔ چہرہ بالکل سفید، ہونٹ بھنچے ہوئے، آنکھیں نیچی، کسی قدر تلخ لہجے میں اس آفتِ ناگہانی معتقد سے فرمایا "بیٹھ جاؤ میرے بھائی!" پھر مجھے بڑی بے بسی کی نظروں سے دیکھا۔ میں تو مزاج آشنا تھا ہی اُٹھ کھڑا ہوا اور ٹریم کی رسی زور سے کھینچ کر پوری طاقت سے گھنٹی بجانا شروع کر دی۔ ایک آدھ منٹ کے اندر ٹریم رک گئی۔ ہم سب اُتر پڑے اور مولانا نے فرمایا "سخت کوفت اُٹھانا پڑی، ہم ٹیکسی کا انتظار کریں گے۔" ٹیکسی جلد مل گئی اور ہم گھر پہنچ گئے۔ مگر اس داستان کا چرچا مولانا نے مہینوں اپنی خاص وضع سے جاری رکھا۔ اتنا ہنسایا اتنا ہنسایا کہ اب کیوں کر بیان کروں۔

عمری مرحوم حیدر آباد گئے ہوئے تھے۔ نہ جانے کیوں مولانا کو خیال ہوا کہ ڈائمنٹڈ ہاربر چلا جائے اور سمندر کی سیر کی جائے۔ اسکیم طے پا گئی۔ موٹر میں پٹرول بھرا گیا اور مولانا کے ساتھ میں قاضی نورالاسلام اور ڈپٹی نجم الدین بیٹھ گئے۔ موٹر چل دی۔ ڈائمنڈ ہاربر کلکتے سے ۳۵-۴۰ میل کے فاصلے پر ہے۔ موٹر اڑی چلی جا رہی تھی، دفعتاً رک گئی۔ کوئی خرابی ہو گئی تھی۔ ڈرائیور نے پوری کوشش کی مگر بے سود۔ آخر اعلان کر دیا موٹر چل نہیں سکتی۔ ہم لوگ کلکتے سے بہت دور ایک اجاڑ جگہ پر تھے ۱۵-۲۰ منٹ چل کر ایک ریلوے اسٹیشن پر پہنچ سکتے تھے۔ آخر جانا ہی پڑا۔ مگر یہ اسٹیشن چھوٹی لائن کا تھا۔ بڑی کوفت ہوئی لیکن کرتے تو کیا کرتے۔ مجبوری کے ایسے موقعوں پر مولانا اپنے آپ کو سنبھال کے ایسے بن جاتے تھے جیسے کوئی پریشانی نہیں ہے اور لطائف و ظرائف کے نہ ختم ہونے والے خزانے کھل جاتے تھے۔

مگر ہم ایک کورده مقام میں تھے اور چھوٹی ریلوے کے اسٹیشن سے سابقہ تھا۔ طے یہ پایا تھا کہ سمندر پر پہنچ کر کھانے پینے کی فکر کریں گے۔ مگر اب ہم سمندر سے دور یہاں تھے۔

یوں تو بھوک نہیں لگتی لیکن معلوم ہو جائے کہ کھانے کا سامان ممکن نہیں تو بھوک ٹوٹ پڑتی ہے۔ اب ہم بہت بھوکے تھے۔ ڈپٹی نجم الدین کی عمر ۸۰-۸۹ سے کیا کم ہوگی سب سے زیادہ بھوک میں مبتلا وہی تھے۔ خود مولانا بھی بھوکے تھے مگر ظاہر کیسے کرتے۔ اسٹیشن پر کسی قسم کا کوئی کھانا نہ تھا۔ اب ہم کریں تو کیا کریں۔ بڑی مایوسی سے دوچار تھے۔ دفعتاً ایک لڑکا نمودار ہوا سر پر ٹوکری اٹھائے۔ ہم سب اس پر ٹوٹ ہی تو پڑے۔ صرف مولانا اپنی جگہ پر کھڑے مسکراتے رہے ٹوکری اتروائی تو بالکل کچے امرود نکلے۔ ڈپٹی صاحب خوشی سے چیخ اٹھے۔ پوری ٹوکری خرید لی گئی۔ میں نے عرض کیا لیکن یہ کچے امرود آپ کھائیں گے کیسے۔ دانت کہاں ہیں؟ ڈپٹی صاحب نے فرمایا۔ چبائے بغیر ہی نگلتے چلے جائیں گے۔ مولانا اس نظارے سے پورا لطف اٹھا رہے تھے۔ مگر آخر بھوکے تو تھے ہی، امرودوں پر وہ وہ ہاتھ مارے کہ آج تک یاد ہے۔ امرود چٹ کرنے سے کچھ تسلی ہو گئی۔ مگر ریل آنے کا نام ہی نہیں لیتی تھی۔ گرمی سخت تھی اور ہم پسینے سے شرابور۔ مگر مولانا پر اس آفت کا ذرا اثر نہ تھا۔ چہلوں پر چہلیں کرتے چلے جاتے تھے اور جب سنجیدہ ہوتے تو مناسب

ملتے رہے۔ ان میں ساری باتیں ہوتی تھیں لیکن اپنی بیماری کا کوئی ذکر نہیں ہوتا تھا۔ رہائی کے بعد ڈاکٹروں سے مشورہ کیا گیا تو ان سب کی رائے تبدیل آب و ہوا کی ہوئی اور وہ رانچی چلی گئی۔ رانچی کے قیام سے بظاہر فائدہ ہوا تھا۔ جولائی میں واپس آئی تو صحت کی رونق چہرہ پر واپس آ رہی تھی۔

اس تمام زمانے میں میں زیادہ تر سفر میں رہا۔ وقت کے حالات اس تیزی سے بدل رہے تھے کہ کسی ایک منزل میں دم لینے کی مہلت ہی نہیں ملتی تھی۔ ایک منزل میں ابھی قدم پہنچا نہیں کہ دوسری منزل سامنے نمودار ہو گئی۔

صد بیاباں بگزشت و دگرے در پیش است

جولائی کی آخری تاریخ تھی کہ میں ہفتہ کے بعد کلکتہ واپس آیا اور پھر چار دن بعد آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے اجلاس بمبئی کے لئے روانہ ہو گیا۔ یہ وہ وقت تھا کہ ابھی طوفان آیا نہیں تھا مگر طوفانی آثار ہر طرف امنڈنے لگے تھے۔ حکومت کے ارادوں کے بارے میں طرح طرح کی افواہیں مشہور ہو رہی تھیں۔ ایک افواہ جو خصوصیت کے ساتھ مشہور ہوئی یہ تھی کہ آل انڈیا کانگریس کے اجلاس کے بعد ورکنگ کمیٹی کے تمام ممبروں کو گرفتار کر لیا جائے گا اور ہندوستان سے باہر کسی غیر معلوم مقام میں بھیج دیا جائے گا[1]۔ یہ بات بھی کہی جاتی تھی کہ لڑائی کی غیر معمولی حالت نے حکومت کو غیر معمولی اختیارات دے دئے ہیں اور وہ ان سے ہر طرح کا کام لے سکتی ہے۔ اس طرح کے حالات پر مجھ سے زیادہ زلیخا کی نظر رہا کرتی تھی اور اس نے وقت کی صورت حال کا پوری طرح اندازہ کر لیا تھا۔ ان چار دنوں کے اندر جو میں نے دو سفروں کے درمیان بسر کئے، میں اس قدر کاموں میں مشغول رہا کہ ہمیں آپس میں بات چیت کرنے کا موقع بہت کم ملا۔ وہ میری

---

[1] گرفتاری کے بعد جو بیانات اخباروں میں آئے ان سے معلوم ہوتا تھا کہ یہ افواہیں بے اصل نہ تھیں سیکرٹری آف اسٹیٹس اور وائسرائے کی یہی رائے تھی کہ ہمیں گرفتار کر کے مشرقی افریقہ بھیج دیا جائے اور اس غرض سے بعض انتظامات کر بھی لئے گئے تھے۔ لیکن پھر رائے بدل گئی اور بالآخر طے پایا کہ قلعہ احمد نگر میں فوجی نگرانی کے ماتحت رکھا جائے اور ایسی سختیاں عمل میں لائی جائیں کہ ہندوستان سے باہر بھیجنے کا جو مقصد تھا وہ یہیں حاصل ہو جائے۔

مولانا آزاد کا ایک خط

قلعہ احمد نگر

۱۱-اپریل ۴۳ء

آنچہ دل از فکر آں می سوخت بیم ہجر بود
آخر از بے مہری گردوں بہ آں ہم ساختیم!

صدیقِ مکرم

اس وقت صبح کے چار نہیں بجے ہیں بلکہ رات کا پچھلا حصہ شروع ہو رہا ہے۔ دس بجے حسب معمول بستر پر لیٹ گیا تھا لیکن آنکھیں نیند سے آشنا نہیں ہوئیں۔ ناچار اُٹھ بیٹھا، کمرے میں آیا، روشنی کی اور اپنے اشغال میں ڈوب گیا۔ پھر خیال ہوا قلم اُٹھاؤں اور کچھ دیر آپ سے باتیں کرکے جی کا بوجھ ہلکا کروں۔ ان آٹھ مہینوں میں جو یہاں گزر چکے ہیں یہ چھٹی رات ہے جو اس طرح گزر رہی ہے اور نہیں معلوم ابھی اور کتنی راتیں اس طرح گذریں گی۔

دماغ بر فلک و دل بپائے مہر بتاں　　　چگونہ حرف زنم دل کجا و ماغ کجا

میری بیوی کی طبیعت کئی سال سے علیل تھی۔ ۴۱ء میں جب میں نینی جیل میں تھا تو اس خیال سے کہ میرے لئے تشویش خاطر کا موجب ہوگا۔ مجھے اطلاع نہیں دی گئی۔ لیکن رہائی کے بعد معلوم ہوا کہ یہ تمام زمانہ کم و بیش علالت کی حالت میں گزر رہا تھا۔ مجھے قیدخانہ میں اس کے خطوط

اور استقامت کے ساتھ ہر طرح کے ناخوش گوار حالات برداشت کئے۔ وہ دماغی حیثیت سے میرے افکار و عقائد میں شریک تھی اور عملی زندگی میں رفیق و مددگار۔ پھر کیا بات تھی کہ اس موقعہ پر وہ اپنی طبیعت کے اضطراب پر غالب نہ آسکی؟ غالباً یہی بات تھی کہ اس کے اندرونی احساسات پر مستقبل کی پرچھائیں پڑنا شروع ہو گئی تھی۔

گرفتاری کے بعد کچھ عرصہ تک ہمیں عزیزوں سے خط و کتابت کا موقعہ نہیں دیا گیا تھا۔ جب یہ روک ہٹالی گئی تو ۱۷ ستمبر کو مجھے اس کا پہلا خط ملا اور اس کے بعد برابر خطوط ملتے رہے۔ چونکہ مجھے معلوم تھا کہ وہ اپنی بیماری کا حال لکھ کر مجھے پریشان خاطر کرنا پسند نہیں کرے گی۔ اس لئے گھر کے بعض دوسرے عزیزوں سے حالت دریافت کرتا رہتا تھا۔ خطوط یہاں عموماً تاریخ کتابت سے دس بارہ دن بعد ملتے ہیں۔ اس لئے کوئی بات جلد معلوم نہیں ہو سکتی۔ ۱۵۔ فروری کو مجھے ایک خط ۲ فروری کا بھیجا ہوا ملا۔ جس میں لکھا تھا کہ اس کی طبیعت اچھی نہیں ہے۔ میں نے تار کے ذریعہ مزید صورتِ حال دریافت کی تو ایک ہفتہ کے بعد جواب ملا کہ کوئی تشویش کی بات نہیں۔

۲۳ مارچ کو مجھے پہلی اطلاع اس کی خطرناک علالت کی ملی۔ گورنمنٹ بمبئی نے ایک ٹیلی گرام کے ذریعہ سپرنٹنڈنٹ کو اطلاع دی کہ اس مضمون کا ایک ٹیلی گرام اُسے کلکتہ سے ملا ہے نہیں معلوم جو ٹیلی گرام گورنمنٹ بمبئی کو ملا وہ کس تاریخ کا تھا اور کتنے دنوں کے بعد یہ فیصلہ کیا گیا کہ مجھے یہ خبر پہنچا دینی چاہیئے۔

چونکہ حکومت نے ہماری قید کا محل اپنی دانست میں پوشیدہ رکھا ہے اس لئے ابتداً سے یہ طریقِ عمل اختیار کیا گیا ہے کہ نہ تو یہاں سے کوئی ٹیلی گرام باہر بھیجا جا سکتا ہے نہ باہر سے کوئی آسکتا ہے۔ کیونکہ اگر آئے گا تو ٹیلیگراف آفس ہی کے ذریعہ آئے گا اور اس صورت میں آفس کے لوگوں پر راز کُھل جائے گا۔ اس پابندی کا نتیجہ یہ ہے کہ کوئی بات کتنی ہی جلدی کی ہو لیکن تار کے ذریعہ نہیں بھیجی جا سکتی۔ اگر تار بھیجنا ہو تو اسے لکھ کر سپرنٹنڈنٹ کو دے دینا چاہیئے۔ وہ اسے خط کے ذریعے بمبئی بھیجے گا وہاں سے احتساب کے بعد اسے آگے روانہ کیا جا سکتا ہے۔ خط و کتابت کی نگرانی کے لحاظ سے یہاں قیدیوں کی دو قسمیں کر دی گئی ہیں۔ بعض

طبیعت کی اُفتاد سے واقف تھی۔ وہ جانتی تھی کہ اس طرح کے حالات میں ہمیشہ میری خاموشی بڑھ جاتی ہے اور میں پسند نہیں کرتا کہ اس خاموشی میں خلل پڑے۔ اس لئے وہ بھی خاموش تھی۔ لیکن ہم دونوں کی یہ خاموشی بھی گویائی سے خالی نہ تھی۔ ہم دونوں خاموش رہ کر بھی ایک دوسرے کی باتیں سن رہے تھے اور ان کا مطلب اچھی طرح سمجھ رہے تھے۔ ۳۔ اگست کو جب میں بمبئی کے لئے روانہ ہونے لگا تو وہ حسب معمول دروازہ تک خدا حافظ کہنے کے لئے آئی۔ میں نے کہا اگر کوئی نیا واقعہ پیش نہیں آگیا تو ۳۱۔ اگست تک واپسی کا قصد ہے۔ اس نے ُخدا حافظ ُ کے سوا اور کچھ نہیں کہا۔ لیکن اگر وہ کہنا بھی چاہتی تو اس سے زیادہ کچھ نہیں کہہ سکتی تھی جو اس کے چہرہ کا خاموش اضطراب کہہ رہا تھا۔ اس کی آنکھیں خشک تھیں مگر چہرہ اشک بار تھا۔

خود را بحیلہ پیش تو خاموش کردہ ایم

گذشتہ پچیس برس کے اندر کتنے ہی سفر پیش آئے اور کتنی ہی مرتبہ گرفتاریاں ہوئیں لیکن میں نے اس درجہ افسردہ خاطر اسے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ کیا یہ جذبات کی وقتی کمزوری تھی جو اس کی طبیعت پر غالب آگئی تھی؟ میں نے اس وقت ایسا ہی خیال کیا تھا۔ لیکن اب سوچتا ہوں تو خیال ہوتا ہے کہ شاید اسے صورتِ حال کا ایک مجہول احساس ہونے لگا تھا۔ شاید وہ محسوس کر رہی تھی کہ اس زندگی میں یہ ہماری آخری ملاقات ہے۔ وہ خدا حافظ اس لئے نہیں کہہ رہی تھی کہ میں سفر کر رہا تھا۔ وہ اس لئے کہہ رہی تھی کہ خود سفر کرنے والی تھی۔

وہ میری طبیعت کی افتاد سے اچھی طرح واقف تھی۔ وہ جانتی تھی کہ اس طرح کے موقعوں پر اگر اس کی طرف سے ذرا بھی اضطراب طبع کا اظہار ہوگا تو مجھے سخت ناگوار گزرے گا اور عرصہ تک اس کی تلخی ہمارے تعلقات میں باقی رہے گی۔ ۱۶ء میں جب پہلی مرتبہ گرفتاری پیش آئی تھی تو وہ اضطراب خاطر نہیں روک سکی تھی اور میں عرصہ تک اس سے ناخوش رہا تھا۔ اس واقعہ نے ہمیشہ کے لئے اس کی زندگی کا ڈھنگ پلٹ دیا اور اس نے پوری کوشش کی کہ میری زندگی کے حالات کا ساتھ دے۔ اس نے صرف ساتھ ہی نہیں دیا بلکہ پوری ہمت

یہ معمہ حل نہیں ہوتا۔ میری زندگی ابتداء سے ایسے حالات میں گزری کہ طبیعت کو ضبط وانقیاد میں لانے کے متواتر موقعے پیش آتے رہے اور جہاں تک ممکن تھا ان سے کام لینے میں کوتاہی نہیں کی۔

تا دستم بود زدم چاک گریباں   شرمندگی از خرقۂ پشمینہ ندارم

تاہم میں نے محسوس کیا کہ طبیعت کا سکون ہل گیا ہے اور اسے قابو میں رکھنے کے لئے جدوجہد کرنی پڑے گی۔ یہ جدوجہد دماغ کو نہیں مگر جسم کو تھکا دیتی ہے۔ وہ اندر ہی اندر گھلنے لگتا ہے۔

اس زمانے میں میرے دل و دماغ کا جو حال رہا میں اسے چھپانا نہیں چاہتا۔ میری کوشش تھی کہ اس صورت حال کو پورے صبر و سکون کے ساتھ برداشت کروں۔ اس میں میرا ظاہر کامیاب ہوا لیکن شاید باطن نہ ہو سکا۔ میں نے محسوس کیا کہ اب دماغ بناوٹ اور نمائش کا وہی پارٹ کھیلنے لگا ہے جو احساسات اور انفعالات کے ہر گوشہ میں ہم ہمیشہ کھیلا کرتے ہیں اور اپنے ظاہر کو باطن کی طرح نہیں بننے دیتے۔

سب سے پہلی کوشش یہ کرنی پڑی کہ یہاں زندگی کی جو روزانہ معمولات ٹھہرائی جا چکی ہیں ان میں فرق آنے نہ پائے۔ چائے اور کھانے کے چار وقت ہیں جن میں مجھے اپنے کمرہ سے نکلنا اور کمروں کی قطار کے آخری کمرہ میں جانا پڑتا ہے۔ چونکہ زندگی کی معمولات میں وقت کی پابندی کا منٹوں کے حساب سے عادی ہو گیا ہوں اس لئے یہاں بھی اوقات کی پابندی کی رسم قائم ہو گئی اور تمام ساتھیوں کو بھی اس کا ساتھ دینا پڑا۔ میں نے ان دنوں میں بھی اپنا معمول بدستور رکھا۔ ٹھیک وقت پر کمرہ سے نکلتا رہا اور کھانے کی میز پر بیٹھتا رہا۔ بھوک یک قلم بند ہو چکی ہے لیکن میں چند لقمے حلق سے اتارتا رہا۔ رات کو کھانے کے بعد کچھ دیر تک صحن میں چند ساتھیوں کے ساتھ نشست رہا کرتی تھی اس میں بھی کوئی فرق نہیں آیا۔ جتنی دیر تک وہاں بیٹھتا تھا جس طرح باتیں کرتا تھا اور جس قسم کی باتیں کرتا تھا وہ سب کچھ بدستور ہوتا رہا۔

اخبارات یہاں بارہ سے ایک بجے کے اندر آیا کرتے ہیں۔ میرے کمرے کے سامنے دوسری طرف سپرنٹنڈنٹ کا دفتر ہے۔ جیلر وہاں سے اخبار لے کر سیدھا میرے کمرہ میں آتا ہے۔ جونہی اس کے دفتر سے نکلنے اور چلنے کی آہٹ آنا شروع ہوتی تھی دل دھڑکنے لگتا تھا کہ نہیں معلوم آج کیسی

کے لئے صرف بمبئی کی نگرانی کافی سمجھی گئی ہے۔ بعض کے لئے ضروری ہے کہ ان کی تمام ڈاک دہلی جائے اور جب تک وہاں سے منظوری نہ مل جائے آگے نہ بڑھائی جائے۔ چونکہ میری ڈاک دوسری قسم میں داخل ہے اس لئے مجھے کوئی تار ایک ہفتہ سے پہلے نہیں مل سکتا اور نہ میرا کوئی تار ایک ہفتہ سے پہلے کلکتہ پہنچ سکتا ہے۔

یہ تار جو ۲۳-مارچ کو یہاں پہنچا۔ فوجی خط رمز (Code) میں لکھا گیا تھا۔ سپرنٹنڈنٹ اسے حل نہیں کر سکتا تھا۔ وہ اسے فوجی ہیڈکوارٹر میں لے گیا۔ وہاں اتفاقاً کوئی موجود نہ تھا۔ اس لئے پورا دن اس کے حل کرنے کی کوشش میں نکل گیا۔ رات کو اس کی حل شدہ کاپی مجھے مل سکی۔

دوسرے دن اخبارات آئے تو ان میں بھی یہ معاملہ آچکا تھا۔ معلوم ہوا ڈاکٹروں نے صورت حال کی حکومت کو اطلاع دے دی ہے اور جواب کے منتظر ہیں۔ پھر بیماری کے متعلق معالجوں کی روزانہ اطلاعات نکلنے لگیں۔ سپرنٹنڈنٹ روز ریڈیو میں سنتا تھا اور یہاں بعض رفقاء سے اس کا ذکر کر دیتا تھا۔

جس دن تار ملا۔ اس کے دوسرے دن سپرنٹنڈنٹ میرے پاس آیا اور یہ کہا کہ اگر میں اس بارے میں حکومت سے کچھ کہنا چاہتا ہوں تو وہ اسے فوراً بمبئی بھیج دے گا اور یہاں کی پابندیوں اور مقررہ قاعدوں سے اس میں کوئی رکاوٹ نہیں پڑے گی۔ وہ صورت حال سے بہت متاثر تھا اور اپنی ہمدردی کا یقین دلانا چاہتا تھا۔ لیکن میں نے اس سے صاف صاف کہہ دیا کہ میں حکومت سے کوئی درخواست کرنی نہیں چاہتا۔ پھر وہ جواہرلال کے پاس گیا اور ان سے اس بارے میں گفتگو کی۔ وہ سہ پہر کو میرے پاس آئے اور بہت دیر تک اس بارے میں گفتگو کرتے رہے۔ میں نے ان سے بھی وہی بات کہہ دی جو سپرنٹنڈنٹ سے کہہ چکا تھا۔ بعد کو معلوم ہوا کہ سپرنٹنڈنٹ نے یہ بات حکومت بمبئی کے ایما سے کہی تھی۔

جونہی خطرناک صورتِ حال کی پہلی خبر ملی۔ میں نے اپنے دل کو ٹٹولنا شروع کر دیا۔ انسان کے نفس کا بھی کچھ عجیب حال ہے۔ ساری عمر ہم اس کی دیکھ بھال میں بسر کر دیتے ہیں پھر بھی

غافل نیم ز راہ و لے آہ چارہ نیست
زیں رہزناں کہ بر دلِ آگاہ می زنند

یہاں احاطہ کے اندر ایک پرانی قبر ہے۔ نہیں معلوم کس کی ہے؟ جب سے آیا ہوں سینکڑوں مرتبہ اس پر نظر پڑ چکی ہے۔ لیکن اب اسے دیکھتا ہوں تو ایسا محسوس ہونے لگتا ہے جیسے ایک نئے طرح کا اُنس اس سے طبیعت کو پیدا ہو گیا ہو۔ کل شام کو دیر تک اسے دیکھتا رہا اور متمم بن نویرہ کا مرثیہ جو اس نے اپنے بھائی مالک کی موت پر لکھا تھا بے اختیار یاد آ گیا۔

لقد لامني عند القبور على البكا
رفيقي لتذراف الدموع السوافك

فقال أتبكي كل قبر رأيته
لقبرٍ ثوى بين اللوى فالدكادك

فقلت له ان الشجا يبعث الشجا
فدعني فهذا كله قبر مالك

اب قلم روکتا ہوں۔ اگر آپ سنتے ہوتے تو بول اُٹھتے۔

سودا خدا کے واسطے کر قصہ مختصر
اپنی تو نیند اڑ گئی تیرے فسانہ میں

(غبارِ خاطر سے)

خبر اخبار میں ملے گی لیکن بعد میں فوراً چونک اُٹھتا۔ میرے صوفے کی پیٹھ دروازہ کی طرف ہے۔ اس لئے جب تک ایک آدمی اندر آ کے سامنے کھڑا نہ ہو جائے میرا چہرہ دیکھ نہیں سکتا۔ جب جیلر آتا تھا تو میں حسب معمول مسکراتے ہوئے اشارہ کرتا کہ اخبار ٹیبل پر رکھ دے۔ اور پھر لکھنے میں مشغول ہو جاتا گویا اخبار دیکھنے کی کوئی جلدی نہیں۔ میں اعتراف کرتا ہوں کہ یہ تمام ظاہرداریاں دکھاوے کا ایک پارٹ تھیں جسے دماغ کا مغرورانہ احساس کھیلتا رہتا تھا اور اس لئے کھیلتا تھا کہ کہیں اس کے دامنِ صبر و وفا پر بے حالی اور پریشان خاطری کا کوئی دھبہ نہ لگ جائے۔

بلعیارب دے کیں صورتِ بے جاں نمی خواہم

بالآخر ۹۔ اپریل کو زہرِ غم کا یہ پیالہ لبریز ہوگیا۔

فانْ مَا تَحْذَرِیْنَ، قَدْ وَقَعْ!

۳ بجے سپرنٹنڈنٹ نے گورنمنٹ بمبئی کا ایک تار حوالہ کیا جس میں حادثہ کی خبر دی گئی تھی بعد کو معلوم ہوا کہ سپرنٹنڈنٹ کو یہ خبر ریڈیو کے ذریعہ صبح ہی معلوم ہوگئی تھی اور اس نے یہاں بعض رفقاء سے اس کا ذکر بھی کر دیا تھا۔ لیکن مجھے اطلاع نہیں دی گئی۔

اس تمام عرصہ میں یہاں کے رفقاء کا جو طرزِ عمل رہا اس کے لئے میں اُن کا شکر گزار ہوں۔ ابتدا میں جب علالت کی خبریں آنا شروع ہوئیں تو قدرتی طور پر انھیں پریشانی ہوئی۔ وہ چاہتے تھے کہ اس بارے میں جو کچھ کر سکتے ہیں کریں۔ لیکن جونہی انھیں معلوم ہوگیا کہ میں نے اپنے طرزِ عمل کا ایک فیصلہ کر لیا ہے اور میں حکومت سے کوئی درخواست کرنا پسند نہیں کرتا تو پھر سب نے خاموشی اختیار کر لی اور اس طرح میرے طریقِ کار میں کسی طرح کی مداخلت نہیں ہوئی۔

اس طرح کی ہماری چھبیس برس کی ازدواجی زندگی ختم ہوگئی اور موت کی دیوار ہم دونوں میں حائل ہوگئی۔ ہم اب بھی ایک دوسرے کو دیکھ سکتے ہیں مگر اسی دیوار کی اوٹ سے۔ مجھے ان چند دنوں کے اندر برسوں کی راہ چلنی پڑی ہے۔ میرے عزم نے میرا ساتھ نہیں چھوڑا۔ مگر میں محسوس کرتا ہوں کہ میرے پاؤں شل ہوگئے ہیں۔

ایک حریمِ راز تھی اس کی کتابِ زندگی
فکر و نظر سے تھی بلند اس کی جنابِ زندگی
آج کہاں ہے دہر میں اس کا جوابِ زندگی
آہ برس کے تھم گیا اب وہ سحابِ زندگی

بکھرے ہوئے ہیں چار سو لعل و جواہرِ کمال
اس کے مآثرِ ہنر، اس کے مظاہرِ کمال

اس کا قلم جب اٹھ گیا لالہ و گل کھلا دیا
شعر و ادب کے پھول سے صحنِ ورق سجا دیا
شاہدِ فکر و راز کے رخ سے حجاب اٹھا دیا
جلوۂ رنگ رنگ سے گل کدہ جگمگا دیا

عقدہ کشائے فکر و راز چہرہ طرازِ علم و فن
فیض سے جس کے تازہ تھا دانش و فکر کا چمن

آہ وہ کلکِ خوش نگار، لالہ طراز و لالہ کار
جس کا نوشتہ جیسے ایک صحیفۂ بہار
جس کی نگارشِ جمیل شعر و ادب کا شاہ کار
ایک حدیقۂ کمال جس کا ہر اک خطِ غبار

اس کا "حبیب" سے کلام اس کا "صدیق" سے خطاب
نامۂ شوق کی زبور، نغمہ و شعر کی کتاب

علم و ہنر کا تاجدار، خسروِ کشورِ قلم
بدرِ معانی و علوم، صدرِ معارف و حکم
نوکِ قلم سے گل طراز، نغز نگار و خوش رقم
جس کا کمال معتبر جس کا کلام محترم

قوم کو جس پہ ناز تھا ہاں وہ زعیمِ ممتحن
ایک حکیمِ دیدہ ور ایک کلیمِ طورِ فن

سجنِ فرنگ کا اسیر، قائدِ صاحبِ ضمیر
جس کے ثباتِ عزم کی ملتی نہیں کوئی نظیر
لبیجِ بلند کا فقیر، فکر و دماغ کا امیر
تھا جو وطن میں کل تلک نظمِ امور کا مشیر

کنجِ لحد میں گوشہ گیر ہو گیا آہ اب وہی
اس کے الم میں سرنگوں کیوں نہ ہو پرچمِ شہی

یحییٰ اعظمی

آہ! مولانا ابوالکلام آزادؒ

جس کی زباں کا حرف حرف نغمۂ جاں نوائے راز — دفترِ علم و آگہی نوکِ قلم سے جس

شانِ حیات جس کی تھی اوجِ شرف سے سرفراز — عرشِ کمال و فضل تھا جس کا مقام

نشاۃِ تازہ جس نے دی قوم کو وہ ابوالکلام

بامِ حریمِ قدس تھا جس کی حیات کا مقام

پیکرِ عزّت و شرف، مظہرِ عظمت و جلال — پیشِ نظر نظر فروز ایک مرقعِ جمال

خازنِ فضل و علم و فن، خاتمِ دانش و کمال — قاسمِ بادۂ کہن، ساقیِ دورِ اہلال

اُٹھ گیا وہ تو بے فروغ مصطبۂ یقیں ہے آج

پیرِ مغاں کے ہجر میں بزمِ مغاں حزیں ہے آج

حیف خموش ہوگیا باغِ ادب کا عندلیب — اُٹھ گیا ہند کا امام سو گیا قوم کا خطیب

اب نہ اُٹھے گا حشر تک ایسا مفکّر و ادیب — حق کا مجاہدِ جلیل، دیں کا منادی و نقیب

فکرِ جدید و طرزِ نو کا وہ محققِ کتاب

جس کے صحیفۂ کلام کا نہیں دہر میں جواب

غلام رسول مہر

مولانا ابوالکلام آزاد

ایک نادر روزگار شخصیت

معاشراں گرہ از زلفِ یار باز کنید
شبے خوش است بہ ایں قصہ اش دراز کنید

مولانا کے متعلق بہت کچھ لکھا جا چکا ہے بلکہ کہا جا سکتا ہے بہت کم بڑے آدمی ہیں جن کے متعلق ان کی زندگی میں اتنی کتابیں شائع ہوئیں جتنی مولانا کے متعلق شائع ہوئیں۔ جب تک روز و شب کا سلسلۂ دور و سیر جاری ہے بہت کچھ لکھا جائے گا تاہم حقیقتِ حال پر نظر رکھی جائے تو یہی کہنا پڑتا ہے کہ ابھی تک کچھ بھی نہیں لکھا گیا۔

ترا، چنانکہ توئی، ہر کسے کجا داند
بہ قدرِ طاقتِ خود مے کند استدراک

انسانوں کے درجے | عظیم الشان انسانوں کے مقامات و مدارج ہیں جو اس بنا پر متعین ہوتے ہیں کہ زمانی اور مکانی اعتبار سے ان کے دائرۂ اثر و رسوخ کی کیا کیفیت رہی۔ بعض افراد خاص اسباب کی بنا پر شہرت پا لیتے ہیں اور ان میں مقامِ شہرت پر قائم رہنے کے جوہر موجود نہیں ہوتے بعض کو قدرت عزت و احترام کی اوج گاہوں پر پہنچا دیتی ہے لیکن وہ اپنے مخصوص ماحول سے باہر کوئی قابلِ ذکر حیثیت حاصل نہیں کر پاتے، نیز ان کی قدروں کو زمانی اعتبار سے چنداں

اسوۂ یوسفی کی مثل جس کی حیات تھی تمام — حق کے لئے غم و محن جس کا تھا منصبِ مقام
شکر و رضا کی سرخوشی جس کا شعار تھا مدام — دار و رسن سے سرفراز قیدِ محن سے شادکام
صبرِ جمیل کی ادا جس کی تھی شانِ امتیاز
عفو و کرم سے دل نواز جور و ستم سے بے نیاز

آہ کہاں ہے آج اس شانِ فخیم کی مثال — طبعِ کریم کی مثال خلقِ عظیم کی مثال
اب نہ اٹھے گی ہند میں ایسے زعیم کی مثال — ایسے فرسِ دیدہ ور ایسے حکیم کی مثال
آج ہے بے فروغ فیض بزمِ وطن ترے بغیر
بزمِ وطن ہے محفلِ حزن و محن ترے بغیر

اس کی حیات کو یہی ملتِ حق سے تھا گلہ — بے خبرِ مقام ہے ہند میں حق کا قافلہ
فکر و شعور سے تہی جس کا ہے عزم و حوصلہ — رزمِ حیات سے فرار آہ ہے جس کا مشغلہ
جہلِ خطاب سے دیا جس نے سلام کا جواب
سوءِ کلام سے دیا حسنِ کلام کا جواب

سنتیں جس نے تازہ کیں سرکشی و عناد کی — حق کے خلاف بے پناہ معرکۂ جہاد کی
آہ وہ گرم جوشیاں ملتِ کم سواد کی — آہ وہ شانِ صبر و شکر بندۂ حق نہاد کی
گالیاں سن کے بھی مدام لب پہ دعائے خیر تھی
عفو و کرم کی کل متاع یعنی نثارِ غیر تھی

اب نہ اٹھے گا عارفِ دینِ حجاز پھر کبھی — آہ ابوالکلام سا واقفِ راز پھر کبھی
ہوگا نہ عندلیبِ فن نغمہ طراز پھر کبھی — دفترِ علم و معرفت ہوگا نہ باز پھر کبھی
آہ نہ جانی اس کی قدر ملتِ کم شناس نے
مسلمِ کم سواد نے امتِ ناسپاس نے

مولانا آزاد مشرق قریب اور یورپی ممالک
خیر سگالی کے دورے پر روانگی کے وقت

مولانا آزاد کشمیر کے
مقام ڈاچی گام میں۔

پائیداری نصیب نہیں ہوتی ۔ بعض اوقات یہ خاک دانِ تیرہ و تار ایسی شخصیتوں کی جلوہ گری سے بھی زیب و زینت پاتا ہے جو زمان و مکاں کے لوحِ قلب پر اپنی عظمت کے گہرے نقوش ثبت کر جاتی ہیں ۔ لیل و نہار کے وہ نقوش مدھم نہیں ہوتے بلکہ زیادہ ابھرتے رہتے ہیں ۔ مولاناؒ کا تعلق عظیم المرتبت انسانوں کی اسی آخری صف سے تھا اور ایسے انسان زمانے کے دور گزر جانے کے بعد ہی عرصۂ شہود پر جلوہ آرا ہوتے ہیں ۔ خواجہ سنائیؒ نے اسی حقیقت کی طرف اشارہ کیا تھا جب کہا تھا کہ :

دورہا باید کہ تا یک مردِ حق پیدا شود بایزید اندر خراساں یا اویس اندر قرن

نادر روزگار شخصیت یقیناً مولاناؒ ایک نادر روزگار شخصیت کے مالک تھے اور ایسے گوناگوں اوصاف و محاسن کسی ایک وجود میں بہت ہی کم جمع ہوئے ہیں ۔ انھوں نے زندگی کے اتنے دائروں میں انتہائی بلند مقام حاصل کیا جن کا حصر مشکل ہے اور ان میں سے کسی ایک دائرے میں ویسی بلندی حاصل کر لینا بڑے سے بڑے انسان کے لئے بھی دائمی فخر کا سامان ہو سکتا ہے ۔ علم و فضل ، حقائقِ دین ، فلسفہ و حکمت ، شعر و ادب ، تصنیف و تالیف ، تقریر و خطابت ، اخبار نویسی و صحیفہ نگاری ، سیاست و ملک داری غرض کون سا دائرہ اور کون سا حلقہ ہے جس میں ان کی یگانگی ابتدا ہی سے سب کے نزدیک ثابت و مسلم نہ تھی اور آج تک اس کی تصدیق و توثیق نہ ہوتی رہی ؟ عربی ، فارسی ، انگریزی اور اردو میں علوم کا شاید ہی کوئی قابلِ توجہ مطبوعہ یا مخطوطہ و کمیاب ذخیرہ ہو ، جو ان کی نظر سے نہ گزر چکا تھا اور اس ذخیرے کی ہر مستحق اعتناء شے ان کے گنجینۂ حفظ و ضبط میں محفوظ نہ تھی ۔ لوگوں نے مختلف کتابیں پڑھیں اور ان کے وہ مطالب ذہن میں بٹھائے جو انھیں پسند آئے ۔ مولانا کے حافظے میں نہ محض تمام مطالب ہی محفوظ تھے بلکہ مشہور مصنفوں کے اسلوب پر بھی حد درجہ گہری نظر تھی ۔ جب اس موضوع پر گفتگو کرتے تو ایسے حقائق بیان فرماتے جو اس فن میں درجۂ اختصاص حاصل کرنے والوں کی زبان سے بھی بہت کم سُنے گئے ۔ حیرت اس بات پر ہوتی تھی کہ یہ کمال انھوں نے کیوں کر حاصل کر لیا ۔

عقیدت مند جنازے پر پھول چڑھا رہے ہیں۔

(۲۳ فروری ۱۹۵۸ء)

حیرت انگیز کمالات | عربی تو بہرحال ان کی مادری زبان تھی اور حیاتِ مستعار کے ابتدائی دس سال انھوں نے مکّہ معظمہ میں گزارے تھے لہٰذا اسے اہلِ زبان کی طرح بولنے پر تعجب نہ ہونا چاہیئے۔ عجیب بات یہ ہے کہ وہ فارسی بھی تازہ وارد ایرانیوں کے انداز میں بولتے تھے۔ مشہور ایرانی شاعر قاآنی کے متعلق بیان کیا جاتا ہے کہ وہ فرانسیسی زبان فرانسیسیوں کی طرح بولتا تھا۔ یہاں تک کہ اسے پردے میں بٹھا دیا جاتا تو کوئی پہچان نہ سکتا کہ فرانسیسی نہیں ایرانی بول رہا ہے۔ میں نے ایک مرتبہ مولاناؒ کو ایک ترک مہمان سے فارسی میں باتیں کرتے سُنا تو حیران رہ گیا۔ گفتگو میں اہلِ زبان کی سی روانی کے علاوہ تلفظ کی لطافت اور لب و لہجہ کی ملائمت کا وہی رنگ تھا جو خوش ذوق ایرانیوں کا خاصہ ہے۔

علوم میں ہمہ گیری | پھر مختلف انسانوں کی طبیعتوں کو مختلف علوم سے مناسبت ہوتی ہے اور انھیں میں وہ درجۂ کمال حاصل کر لیتے ہیں۔ مولانا کی طبیعت کو ہر علم سے مناسبت تھی۔ دینی مذہب، تاریخ و سیر، فلسفہ و حکمت، شعر و ادب، علم الالسنہ، آثارِ قدیمہ اور خدا جانے کس کس دائرۂ علم و فن میں وہ یگانگی کے درجے پر فائز تھے۔ یہاں تک کہ طب کی تعلیم بھی باقاعدہ پائی تھی اور دوسرے علوم کے علاوہ طب بھی پڑھاتے رہے۔ جو کتاب ایک مرتبہ نظر سے گذر جاتی تھی اس کے تمام مطالب ذہن میں محفوظ ہو جاتے تھے۔ عربی، فارسی اور اردو شعراء کے تذکرے اور دواوین انھوں نے بالکل ابتدائی دور میں دیکھے ہوں گے۔ شاید ہی کوئی اچھا اور قابلِ توجہ شعر ہو جو انھیں یاد نہ تھا۔ ہم لوگوں نے جن اُردو شعراء کے نام سُن رکھے تھے اور ان کا کلام کبھی نہیں دیکھا، اس لئے کہ اپنے خیال کے مطابق اسے دیکھنے کے قابل نہ سمجھا۔ مولاناؒ کی تصانیف میں ان کے اشعار بھی جابجا ملتے ہیں۔ کبھی سمجھ میں نہ آیا کہ انھیں یہ تمام ذخیرے دیکھ جانے کا وقت کب ملا اور ہزاروں گراں قدر کتابوں کے مطالعے سے اتنی فرصت کیوں کر میسّر آگئی کہ ان کتابوں کو بھی نظر سے گذار دیا جن کے وجود تک سے اہلِ علم بے خبر ہیں۔ پنجابی زبان میں ایک کتاب "یکی روٹی" ہے جس میں دینی مسائل سوال و جواب کے انداز میں جمع کئے گئے ہیں۔ قیامِ امرت سر کے دوران میں انھوں نے وہ کتاب بھی پڑھ لی تھی۔

آخری سفر

(۲۲۔ فروری سنہ ۱۹۵۸ء)

میں نے فارسی کا یہ فقرہ پڑھا تو احساس ہُوا کہ 'فتح آسمانی' اچھی فارسی معلوم نہیں ہوتی، ممکن ہے اصل میں 'فتح آساں نے' (فتح آسان نہیں) ہو۔ میری گذارش کے جواب میں مولانا نے کلکتہ سے لکھا:

"دولت خاں لودی کا مقولہ محض حافظے سے لکھا ہے۔ لیکن اس میں 'فتح آسمانی' ہی ہے۔ یعنی حالت ایسی ہے کہ بے صبر و سامان کی بنا پر فتح کی امید نہیں کی جا سکتی آسمان کی مدد ہی سے ہو تو ہو 'آساں نے' ہرگز نہیں ہو سکتا...... اگرچہ دماغ مطمئن تھا۔ خیال ہُوا برسوں کی بات ہے اصل مقام نکال کر دیکھ لوں۔ چنانچہ "مآثر الامرا" میں مقام مل گیا اور دولت خاں لودی کا مقولہ ٹھیک ٹھیک وہی نکلا جو حافظے میں محفوظ رہ گیا تھا۔ طبیعت خوش ہوئی کہ تیس برس تک دماغ نے اس مقولے کی پوری محافظت کی تھی اور ایک لفظ بھی اِدھر اُدھر نہیں ہُوا تھا۔"

کون اس حافظے کو خدا کی خاص نعمت تسلیم کرنے میں تامل کرے گا جس نے تیس برس میں ایک معمولی فقرے کا ایک لفظ بھی اِدھر اُدھر نہ ہونے دیا۔

ہر دائرے میں مستقل قدریں

اسے بھی چھوڑیئے اور یہ دیکھیے کہ ہر دائرے میں انھوں نے مستقل قدریں قائم کیں جن کا کوئی سراغ ان سے پیشتر کسی دائرے میں نہیں ملتا۔ اگر میں اس بارے میں تفصیلات پیش کروں تو ایک دفتر تیار ہو جائے تاہم ایک دو مثالیں پیش کئے بغیر مدعا واضح نہیں ہو سکتا۔

'الہلال' سے پیشتر تمام جرائد و رسائل (الا ماشاء اللہ) امراء و رؤساء سے اعانتی رقوم لینا غیر مناسب نہ سمجھتے تھے بلکہ قیمت کا اشتہار چھاپا جاتا تھا تو امراء و رؤساء کے لئے زیادہ رقم لکھی جاتی تھی۔ شاید اس لئے کہ ان کے درجۂ امتیاز میں کوئی خلل نہ آئے۔ 'الہلال' نکلا تو اس کا پہلا ہی نمبر دیکھ کر ایک مشہور صاحب ریاست نے خاص رقم کا چیک مولانا کے پاس بھیج دیا۔ ساتھ ہی لکھا کہ ہر مہینے اتنی رقم باقاعدہ پہنچتی رہے گی۔ سال بھر کے لئے تو

غیر معمولی حافظہ | صلاحیت حفظ و استحضار کے لحاظ سے وہ قدرت کا ایک عجیب و غریب نشان تھے۔ بے تکلف کہا جا سکتا ہے کہ جو کچھ پڑھتے تھے دماغ کے مختلف خانوں میں حسن ترتیب سے چنتے جاتے تھے۔ ہر خانہ، ضرورت کے وقت خود بخود کھل جاتا اور جو شئے چاہتے اُٹھا لیتے۔ "تذکرہ" انھوں نے صرف حافظے کی بنا پر مرتب فرما دیا تھا۔ بعد میں چند کتابیں منگوالیں تاکہ اطمینان فرمالیں جو کچھ لکھا ہے اس میں کہیں غلطی تو نہیں ہوئی۔ اس کتاب کی دو جلدیں تھیں۔ مرحوم فضل الدین احمد مرزا نے صرف ایک جلد چھاپی اور مولانا ابھی رانچی میں نظر بند ہی تھے کہ مرزا صاحب کلکتہ چھوڑ کر اپنے وطن پنجاب چلے آئے اور دوسری جلد بھی ساتھ لے آئے۔ پھر ان کا انتقال ہوگیا اور سعی و تلاش کے باوجود دوسری جلد کا کوئی سُراغ نہ مل سکا۔

اسی طرح ایک عزیز دوست نے بتایا کہ جس زمانے میں مولانا "وکیل" کے ایڈیٹر تھے طباطبائی مرحوم کی شرح دیوانِ غالب میں انھوں نے سادہ اوراق لگوالیے تھے اور ان پر مختلف شعروں کی شرح لکھتے جاتے تھے۔ ایک ندیم نے وہ نسخہ مولانا کے علم کے بغیر اُٹھالیا اور تقسیم ہند کے وقت تک وہ محفوظ تھا۔ تقسیم کے ہنگاموں میں وہ نذرِ آتش ہوگیا۔

خدا کی خاص نعمت | "غبارِ خاطر" پہلی مرتبہ لاہور میں چھپی تھی اور میں اس کی نگرانی پر مامور تھا۔ ایک مکتوب میں اپنے محبس احمد نگر کے حالات بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:-

"اسی احمد نگر کے معرکوں میں عبدالرحیم خانخاناں کی جوانمردی کا وہ واقعہ نمایاں ہوا جس کی سرگزشت عبدالباقی نہاوندی (صاحب "مآثرِ رحیمی") اور صمصام الدولہ (صاحب "مآثر الامرا") نے ہمیں سنائی ہے۔ جب احمد نگر کی مدد پر بیجاپور اور گولکنڈہ کی فوجیں بھی آگئیں اور خانخاناں کی قلیل التعداد فوج کو سہیل حبشی کی طاقت ور فوج سے ٹکرانا پڑا تو دولت خاں لودی نے پوچھا تھا: "چنیں انبوہے در پیش و فتح آسمانی، اگر حادثہ رو دہد، جائے نشان دہید کہ شمارا دریابم"۔ خان خاناں نے جواب دیا "زیر لاشہ"۔

کم از کم اردو اخبار نویسی میں میرے علم کے مطابق عظمت و خودداری کی یہ پہلی صدائے حق تھی جس نے اس اخبار نویسی کے معیار کو آسمان پہ پہنچا یا۔

'الہلال' کی ضمانت کا واقعہ | طلب ضمانت کا خیر مقدم 'الہلال' سے پیشتر کبھی کسی اخبار نے نہ کیا تھا۔ 'الہلال' سے ۱۹۱۳ء میں دو ہزار کی ضمانت مانگی گئی تو مولانا نے پہلے یہ خبر شائع کرنے میں تامل کیا۔ جب اطراف ملک سے پے در پے خطوط ان کی خدمت میں پہنچنے لگے تو ۲۴ ستمبر ۱۹۱۳ء کی اشاعت میں یہ خبر شائع کی اور اس کا عنوان رکھا 'ابتدائے عشق' ساتھ ہی فرماتے ہیں :

" انسان صرف کام کے لئے بنایا گیا ہے۔ پس اس کو چاہیئے کہ اپنے کام میں مصروف رہے۔ یہ بہت ہی ادنے درجے کی اور چھوٹی باتیں ہیں کہ لوگوں کا اس کے متعلق کیا خیال ہے اور حکام وقت اسے کیا سمجھتے ہیں۔"

اس ضمن میں یہ اصول پیش کر دیا کہ حق و صداقت کے لئے کامیاب و منصور ہونا لازم ہے۔ باطل کے ساتھ دنیوی طاقتوں کا کتنا ہی ساز و سامان ہو اور وقتی کامیابیاں اسے خواہ کتنا ہی مغرور کر دیں لیکن بالآخر وہ خاسر و نامراد رہے گا۔

آخر میں لکھتے ہیں کہ ۱۸ ستمبر کو دو ہزار کی ضمانت طلب کی گئی تھی جسے ۲۷ تک داخل کرنے کی مہلت تھی لیکن ۲۳ ہی کو داخل کر دی گئی۔

" ضمانت کا روپیہ تو اسی تاریخ سے بطور ایک سرکاری امانت کے علیحدہ رکھ دیا گیا تھا جس دن 'الہلال پریس' کا ابتدائی سامان خریدنے کے لئے روپیہ نکالا تھا۔ پس سچ یہ ہے کہ اس امانت کی حفاظت کرتے کرتے ہم اکتا گئے تھے اور اب تو وقت آ گیا تھا۔ اگر کوئی مانگنے کے لئے نہ آتا تو ہم خود ہی پیش کرنے کے لئے آگے بڑھتے ..... بڑی فکر یہ تھی کہ جب محرومیٔ قسمت سے ضمانت کی پہلی منزل ہی طے نہیں ہوئی تو آئندہ کی فکر کے لئے ہمیں وقت کیسے ملے گا؟"

قول فیصل | ایسی بے شمار قدریں مولاناؒ نے ہر دائرے میں قائم کیں اور ان سے پیشتر ہماری قومی زندگی میں ان کا کوئی نشان موجود نہ تھا۔ وہ دسمبر ۱۹۲۱ء میں بسلسلۂ ترکِ موالات گرفتار

وعدہ سمجھیے۔ اس کے بعد بھی اخبار اپنے پاؤں پہ کھڑا نہ ہو سکا تو یہ سلسلہ جاری رہے گا۔

سیر چشمی اور خودداری: مولانا نے شکریے کے ساتھ چک واپس کر دیا اور لکھا:

"ہم نے جس قدر کام اپنے ذمے لے لئے ہیں وہ روپے کے بل، پبلک کی قدردانی اور رؤسا قوم کے جود و سخا کے بھروسے پہ نہیں بلکہ صرف اس کے فضل اور توفیق کے اعتماد پر جو اپنے دروازے کے سائلوں کی فریادیں جب ایک مرتبہ سن لیتا ہے تو پھر دوسروں کی چوکھٹوں پہ کبھی نہیں بھیجتا۔"

پھر فرمایا:

"ہم اس بازار میں سودائے نفع کے لئے نہیں بلکہ تلاش زیان و نقصان میں آئے ہیں۔ صلہ و تحسین کے نہیں بلکہ نفرت و دشنام کے طلب گار ہیں۔ عیش کے پھول نہیں بلکہ خلش و اضطراب کے کانٹے ڈھونڈتے ہیں۔ دنیا کے زر و سیم کو قربان کرنے کے لئے نہیں بلکہ خود اپنے تئیں قربان کرنے کے لئے آئے ہیں۔ ایسوں کی اعانت کر کے آپ کا جی کیا خوش ہوگا۔"

آخر میں تحریر فرماتے ہیں:

"پھر یہ بھی معلوم نہیں کہ آپ کا یہ عطیہ کس مقصد سے ہے؟ اگر آپ مجھے خریدنا چاہتے ہیں تو یہ رقم ایک گراں قدر قیمت ہے۔ میں تو اپنی قیمت میں گھانس کی ایک ٹوکری کو بھی گراں سمجھتا ہوں۔ ... ہاں اگر اس سے میری رائے اور میرا ضمیر خریدنا مقصود ہو تو بہ ادب واجب عرض ہے کہ ان خزف ریزہ ہائے طلائی کی تو کیا حقیقت ہے، کوہِ نور اور تختِ طاؤس کی دولت بھی جمع کر لیجیے تو مع آپ کی پوری ریاست کے اس کی قیمت کے آگے ہیچ ہیں۔ یقین کیجئے کہ اسے تو سوائے شاہنشاہِ حقیقی کے اور کوئی نہیں خرید سکتا اور وہ ایک مرتبہ خرید چکا۔"

خواہ ان کا مسلک و مشرب راہِ حق سے کتنا ہی ہٹا ہوا تھا۔ مولانا کے لئے ایک داعیٔ حق کی حیثیت میں صورتِ حال کو منقلب کئے بغیر چارہ نہ تھا۔ اسی ضرورت نے انھیں ایک ایسے لب و لہجہ پر مجبور کیا جو درشت نہیں البتہ حد درجے کا بے باکانہ ضرور تھا۔ دعوتِ حق کو کامیاب بنانے کا احسن طریقہ یہی تھا کہ وہ نہایت ہراس انگیز اقدامات کو زیادہ سے زیادہ محبوب و دل پذیر بنا دیتے یہی وجہ ہے کہ انھوں نے نفع و سود کو ٹھکرایا اور نقصان و زیاں سے پیار کی دعوت دی۔ پھولوں کو پامال کیا اور کانٹوں سے محبت کرنے کی صدا بلند کی۔ اس وقت اہلِ ملک کو قربانی کے لئے تیار کرنا منظور تھا اور قربانی کی دعوت گل باریوں کے ذریعے سے کبھی پروان نہیں چڑھی۔

شانِ استقامت | مولانا کے ایمان و یقین کی طرح ان کی رائے کو بھی پختگی کا بلند ترین درجہ حاصل تھا۔ وثوق سے نہیں کہا جا سکتا کہ انھوں نے ملک کی آزادی کے لئے کب اپنے ذہن میں ایک مستقل نقشہ تیار کر لیا تھا۔ "الہلال" کے پہلے نمبر کے افتتاحیے میں ایک اشارہ کیا ہے کہ ۱۹۰۶ء کے موسم سرما میں ان کی چشمِ بیدار نے ایک خواب دیکھا تھا۔ دنیا کے سامنے ان کے نقشۂ عمل کے اجزا ۱۹۱۲ء میں آئے۔ یعنی جو پروگرام انھوں نے اٹھارہ سال کی عمر میں تیار کیا تھا اس پر چوبیس سال کی عمر میں عمل شروع کیا۔ اس وقت سے آزادی حاصل کرنے تک پینتیس سال گذر گئے۔ سینکڑوں اکابر کی رائیں بدلیں۔ ان کے مسالک و مشارب میں تغیر پیدا ہوا۔ لیکن مولانا نے جو راستہ ۱۹۱۲ء میں اختیار کیا تھا اس پر وہ برابر انتہائی دلجمعی سے قائم رہے۔ یہاں اس رائے پر بحث کا کوئی سوال نہیں، اصل سوال یہ ہے کہ وہ جہاں ایک مرتبہ چٹان کی طرح جم گئے وہاں سے ایک انچ بھی اِدھر اُدھر نہ ہوئے۔ زندگی کی عزیز ترین متاع ہر دل عزیزی ہے جسے قربان کرنے کے لئے انسان بہ آسانی تیار نہیں ہوتا۔ یہ متاعِ عزیز انھیں جوانی کے ابتدائی مراحل ہی میں اس پیمانے پر مل گئی تھی جس کا ایک حصہ بھی اکثر اصحاب کے نزدیک سرمایۂ فخر بن کر حاصل ہوتا ہے اور یہ ہر دل عزیزی ایسی نہ تھی جیسی سیاسی ہنگاموں کے دوران میں پھولوں کے ہاروں جلوسوں اور نعروں کی شکل اختیار کر کے لیڈروں کے روبرو پیش ہوتی رہی۔ مولانا کی ہر دل عزیزی دلوں کی تڑپ کا جزو بن گئی تھی۔ یہ گراں بہا متاع انھوں نے اپنی رائے کی پختگی اور اپنے

ہوئے تھے اور وقت کے قومی فیصلے کے مطابق انھوں نے بھی دورانِ مقدمہ میں عدالت سے تعاون نہ کیا تھا۔ البتہ آخر میں ایک بیان داخل کیا تھا جو قولِ فیصل کے نام سے مشہور ہوا۔ یہ آج بھی موجود ہے۔ ہندوستان میں چھوٹے بڑے ہزاروں افراد گرفتار ہوئے تھے اور بے شمار لوگوں نے تحریری بیانات دیئے تھے مگر کوئی بیان "قولِ فیصل" کا درجہ حاصل نہ کر سکا۔ مجاہدینِ آزادی کے خلاف مقدمے ہر ملک میں چلے اور اکثر نے بیانات بھی دیئے۔ میرے علم کے مطابق آئرلینڈ کے قائدِ آزادی رابرٹ ایمیٹ کا بیان بہت پُرزور اور پُرتاثیر مانا جاتا ہے لیکن 'قولِ فیصل' کے مقابلے میں وہ بھی بالکل بے کیف معلوم پڑتا ہے۔ مولانا نے اس میں حقیقتِ حال واضح کی، آزادی کے لئے ہر جدوجہد کا اقرار کیا بلکہ کہا میں اس جرم کا ارتکاب بہت پہلے سے کر رہا ہوں اور اسے اپنا پیدائشی حق قرار دیا۔ پھر اپنا یہ یقین بھی واضح کر دیا کہ حق کامیاب ہوگا اور باطل اپنی ظاہری قوت کے باوجود ٹھہر نہ سکے گا۔ دنیا جانتی ہے کہ حالات نے مولانا کے اسی یقین کا ساتھ دیا۔ خدا کی سنّت کبھی نہیں بدلی، قدرت کے مقرر کئے ہوئے اصول کی کارفرمائی میں کبھی تغیّر نہیں ہوا۔ لیکن یہ بول بول لینا ایک چیز ہے اور اس کارفرمائی پر چٹانوں سے بھی بدرجہا زیادہ مستحکم ایمان و یقین کی روح سے معمور ہونا بالکل دوسری چیز ہے۔

مقامِ دعوت کے تقاضے 'الہلال' کے ابتدائی دور میں بعض اصحاب کو یہ احساس پیدا ہوا کہ مولانا کا لب و لہجہ ذرا سخت اور درشت ہے۔ ممکن ہے 'الہلال' کی جلدوں کا مطالعہ کرتے وقت اب بھی بعض اصحاب کو یہ احساس پیدا ہو۔ اس غلط فہمی سے محفوظ رہنے کے لئے مولاناؒ کے مقامِ دعوت اور وقت کے عام حالات کو پیشِ نظر رکھ لینا ضروری ہے۔ وہ آزادی اور حق پرستی کی دعوت لے کر اٹھے تھے۔ 'الہلال' اس دعوت کا وسیلہ تھا۔ داعی کا مقام اس امر کا متقاضی ہوتا ہے کہ اپنی ہر بات کو عوام کے دلوں میں اُتار دے۔ وہ صرف دماغوں کو اپیل نہیں کرتا بلکہ دماغوں سے کہیں بڑھ کر اس کی اپیل دلوں سے متعلق ہوتی ہے۔ اس زمانے میں عام طور پر بے حسی پائی جاتی تھی۔ ہر طرف جمود نظر آتا تھا۔ حکومت کا رعب دلوں پر چھایا ہوا تھا۔ ذی وسائل اور ذی رتبہ افراد کے لئے ایک خاص احترام کی فضا موجود تھی،

یگانہ حلقہ قائم کر سکتے تھے اور یہ حلقہ ان کی نگرانی میں علمی کارناموں کے ایسے انبار لگا سکتا تھا جن کی کوئی مثال اس وقت تک سامنے نہیں آئی اور خود ان کے معارف بھی بہترین طریق پر اشاعت پا سکتے تھے مگر انھوں نے اپنی ذات کو ہمیشہ سب سے آخر میں رکھا۔ یہ استغناء یہ بے نیازی تمام نیازمندوں کے لئے ہمیشہ رنج و قلق کا سامان بنی رہی۔ معلوم ہوتا ہے وہ طے کئے بیٹھے تھے کہ اگر انھوں نے علم و عمل کی کوئی قابلِ ذکر متاع چھوڑی ہے تو زمانہ خود اسے محفوظ کر دے گا۔ اگرچہ اسے محفوظ کر دینے کا وقت کتنی صدیوں کے بعد آئے گا۔ اگر ایسی کوئی متاع نہیں چھوڑی تو پھر اس کی حفاظت میں چند لمحے بھی صرف کرنا قدرت کی عطا کی ہوئی مہلت کا ضیاع ہوگا

نذرِ حقیر میں اپنے علم و نظر کی بے مائگی کو سامنے رکھتے ہوئے اس بلند مرتبہ شخصیت کے متعلق کچھ لکھنے کا اہل نہ تھا۔ چند محسوسات و مشاہدات تھے جو بے اختیار زبانِ قلم پر آ گئے۔ یہ بے رنگ اور بے خوشبو پھول ہیں جنھیں دامن میں سمیٹ کر مولانا کی بارگاہِ عظمت و جلال میں حاضر ہوا ہوں۔ ایک بے نوا فقیر سلطانِ علم و عمل کی قدم گاہ میں اور کیا نذر پیش کر سکتا ہے؟ خدا کرے یہ نذرِ حقیر شرفِ قبول سے محروم نہ رہے۔ اس ذکر کو مرزا غالب کے ایک شعر پر ختم کرتا ہوں جس کی ردیف ضرورتاً بدل لی ہے۔

ہند را رندِ سخن پیشۂ گمنامے بود   اندریں دیر کہن مے کدہ آشامے بود

مرزا غالب ہندوستان کے یگانہ تاجدارِ سخن تھے۔ مولانا علم و عمل دونوں کے یگانہ تاجدار تھے۔ مرزا بھی گمنام نہ تھے اور مولانا کے بارے میں بھی کسی کو گمنامی کا وسوسہ نہیں ہو سکتا۔ لیکن مرزا نے اپنے مقام کی برتری اور اس کے شایانِ شان قدرشناسی سے محرومی کے باعث اپنے آپ کو گمنام کہنا پسند کیا تو اس پر تعجب نہ ہونا چاہیئے۔ بالکل یہی حالت مولانا کی سمجھیئے۔

زمانہ جس طرح غیر معلوم ماضی سے گردش میں ہے۔ اسی طرح غیر معلوم مستقبل میں بھی گردش کرتا رہے گا۔ عام لوگ بھی پیدا ہوتے رہیں گے اور بلند مرتبہ شخصیتوں کے ظہور کا دروازہ بھی بند نہ ہوگا۔ لیکن ہم تیرہ ذوقی کے جس عہد سے گزر رہے ہیں اسے مدِنظر رکھتے ہوئے کیا امید ہو سکتی ہے کہ مولانا کے پایہ کی یا ان سے ملتی جلتی شخصیت پھر پیدا ہوگی؟ اس کائنات کی کوئی بھی شے فنا کی دسترس سے باہر نہیں۔ بقا صرف اللہ کے لئے ہے۔

مسلک کی استقامت کے سلسلے میں بے دریغ لٹا دی ۔ اپنے علم و نظر کے مطابق حق کی خاطر
اس بے نظیر حوصلے، اس بے مثال ہمت اور اس بے دریغ قربانی کا نمونہ کہاں مل سکتا ہے؟

علم و عمل کا تاجدار | عام طور پر دیکھا گیا ہے کہ جن لوگوں کو علم و نظر میں تاجداری و سلطانی
کا مرتبہ مل جاتا ہے ۔ وہ عمل و عزیمت کے میدان میں کم تر ہی کوئی ممتاز درجہ حاصل کرتے ہیں۔ کتابوں
کے مطالعے اور غور و فکر میں انہماک عموماً قوتِ عمل پر ناخوشگوار اثر ڈالتا ہے ۔ مولاناؒ علم و عمل
دونوں کے تاجدار تھے ۔ انھیں دونوں دائروں میں سلطانی کا تاج نصیب ہوا اور آج فیصلہ
کرنا مشکل ہے کہ وہ علم میں بڑے تھے یا عمل میں ۔ انھوں نے مدت العمر قوم کو عزیمت کی دعوت
دی اور یہ دعوت خوش نما الفاظ، دل نشیں تحریرات یا پُرتاثیر خطابات تک محدود نہ تھی بلکہ
اپنے قلب کی گہرائیوں سے اُٹھی ہوئی دعوت تھی جس کے متحرک خون کا ہر قطرہ عزیمت کی
حرارت سے مخمور تھا ۔ انھوں نے جو اونچی سے اونچی بات کہی ۔ اس پر اونچے سے اونچے عمل کا
نمونہ پیش کیا ۔ ایسے یگانہ افراد ہر فضا میں تربیت نہیں پاتے اور ایسے گراں مایہ گوہر ہر خاک
سے نہیں اُٹھتے ۔ غالب کیا خوب کہہ گیا ہے:

عمرہا چرخ بگردد کہ جگر سوختۂ
چوں من از دودۂ آتش نفساں برخیزد

مضمون بے قصد و ارادہ بہت لمبا ہو گیا ۔ سچ ہے:

ہمیں عشق است برخود چیدہ چندیں داستاں ورنہ
کہ از معنیِ یک حرف صد دفتر نمے سازد

استغنا اور بے نیازی | تاہم مولانا کی ایک نادر خصوصیت کا ذکر کئے بغیر اسے ختم نہیں
کر سکتا ۔ یہ ان کی شانِ بے نیازی تھی ۔ الہلال کے دورِ اوّل ہی میں دنیا نے تسلیم کر لیا تھا کہ
علم و فضل میں ویسا آدمی صدیوں سے پیدا نہیں ہوا اور عقیدت مندوں کا ایک وسیع حلقہ
ان سے وابستہ ہو گیا تھا ۔ بارہا ان سے التجائیں کی گئیں کہ اپنے سوانح مرتب فرما دیجئے اور
اپنے علوم و معارف کی مستقل حفاظت کا بندوبست کر دیجئے ۔ انھوں نے ایک سے زیادہ مرتبہ
نیازمندوں کی التجاؤں کو شرفِ پذیرائی بھی بخشا ۔ پھر ہر سکیم، ہر منصوبہ اور ہر ارادہ ان کی بے نیازی
کی نذر ہو گیا ۔ وہ تھوڑی دیر کے لئے بھی ایک جگہ اطمینان سے بیٹھ جاتے تو علوم و معارف کا ایک

کی تفسیر میں تاویل و توجیہہ کا ایک ایسا باب کھل جاتا ہے کہ قرآن کی عمومیت ، اس کی جامعیت اور اس کی بے قید و بند تعلیمات محدود ہو کر رہ جاتی ہیں اور قرآن فقہی اور کلامی بحثوں کا میدان بن جاتا ہے ۔ مولانا نے اس عام روش کے خلاف بالکل ایک نیا طریقہ اور نیا اسلوب اختیار کیا ہے جو قرآن کی عمومیت کے ساتھ ہم آہنگ ہے ۔ مولانا عربی زبان اور اس کے اسالیب بیان ، صحابۂ کرام کے اقوال اور قدما مفسرین کی تشریحات و توضیحات کی روشنی میں کامل غور و خوض کے بعد قرآن کی آیت کا ایک مطلب متعین کر لیتے ہیں اور اس کو کمال قوت و بلاغت کے ساتھ بیان کر دیتے ہیں اس کا اثر یہ ہوتا ہے کہ قاری کے ذہن میں اضطراب و تشویش کی کوئی کیفیت پیدا نہیں ہوتی اور قرآن کے حقائق و مطالب دل میں اترتے چلے جاتے ہیں ۔

عام تفسیروں کی ایک دوسری خصوصیت یہ ہے کہ ان میں بقول مولانا کے "وضعیت" پائی جاتی ہے ۔ اس سے مراد یہ ہے کہ زمانے کی رفتار کے ساتھ ساتھ جو علوم و فنون پیدا ہوتے رہے اور عام انسانی افکار و خیالات پر ان کی گرفت مضبوط ہوتی رہی ۔ قرآن کی تفسیر میں بھی اس کے اثرات نمایاں ہوتے رہے ۔ چناں چہ امام فخر الدین رازی کی مشہور تفسیر کبیر کی نسبت کہنا پڑا کہ اس میں منطق ، فلسفہ و حکمت ، علم الکلام وغیرہ سب کچھ ہے مگر قرآن نہیں ہے ۔ ہمارے زمانے میں اس کی سب سے بڑی مثال مصر کے علامہ جوہر طنطاوی کی ضخیم تفسیر جواہر القرآن ہے جس نے قرآن کو سائنس کے علوم و فنون کا ایک ذخیرہ بنا دیا ہے ۔ ظاہر ہے یہ وضعیت یا صنعت قرآن کی اس سادگی اور فطریت کے بالکل خلاف ہے جو اس کی ہر ہر آیت میں نمایاں ہے ۔ قرآن اگرچہ عقل کو نظر انداز نہیں کرتا لیکن اس کا عام طریقۂ استدلال وجدانی ہوتا ہے جس کو ہر شخص خواہ عالم ہو یا جاہل محسوس کرتا ہے اور اسی وجدانیت کے ذریعہ ہدایت اور اصلاح کا وہ مقصد حاصل ہو سکتا ہے جس کے لئے دنیا میں پیغمبر آتے رہے اور جس کے لئے خود قرآن کا نزول ہوا ۔ اس سلسلے میں مولانا کا کمال یہ ہے کہ ایک طرف تو اس فطریت اور سادگی کا سر رشتہ ہاتھ سے نہیں جانے دیتے جو قرآن کے اسلوب بیان کی نمایاں خصوصیت ہے اور دوسری جانب جہاں کہیں قرآن کی کسی تاریخی حقیقت کو بیان کرنے کے لئے سائنٹیفک طریقۂ استدلال کی ضرورت ہوتی

سعید احمد اکبرآبادی

ترجمان القرآن

مولانا ابوالکلام آزاد نے اردو ادب کے چمن میں حسنِ انشا و بیان کے جو پھول کھلائے ہیں یوں تو وہ سب ہی سدا بہار ہیں لیکن مستقل تصنیف کی حیثیت سے قرآن مجید کی تفسیر "ترجمان القرآن" مولانا کی تمام علمی اور ادبی تحریروں میں شاہکار کی حیثیت رکھتی ہے۔ قلم کی توانائی، اجتہادِ فکر، وسعتِ نظر و مطالعہ اور جذبۂ تحقیق و تدقیق، مولانا کی یہ وہ خصوصیات ہیں جو اُن کی ہر علمی اور ادبی تحریر میں نظر آتی ہیں۔ لیکن مولانا کی یہ خصوصیات اس کتاب میں جا بجا نمایاں ہیں اور اس بنا پر اردو زبان کے علمی ذخیرے میں اس کو امتیازی مقام حاصل ہے۔

عربی، فارسی اور اردو میں سینکڑوں تفسیریں لکھی جا چکی ہیں لیکن ان کا عام رنگ یہ ہے کہ ایک آیت کی تشریح و توضیح میں یا اس سے استخراجِ احکام کے بارے میں متقدمین مفسرین کے جو مختلف اقوال منقول ہیں ان سب کو نقل کرتے چلے جاتے ہیں اور ساتھ ہی اُن اقوال میں سے ہر ایک کی دلیل بھی بیان کر دیتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اربابِ علم ان سے استفادہ کریں تو کریں۔ لیکن عام لوگوں کا دماغ ان میں اُلجھ کر رہ جاتا ہے۔ اور قرآن کا جو مقصد ہے یعنی کسی حقیقت کو ذہن نشین کر کے اس کا یقین پیدا کر دینا وہ حاصل نہیں ہوتا۔ علاوہ ازیں ہر مفسر کوشش کرتا ہے کہ وہ فقہ یا علم الکلام کے جس مسلک سے تعلق رکھتا ہے اس کو قرآن کی آیات سے ثابت کرے اور دوسرے مسلک کے لوگوں کی تردید میں ان سے استدلال کرے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ قرآن

اور اس سلسلے میں دین کی اصل حقیقت، عہد بعہد اس کا ارتقاء، شریعت و منہاج کا فرق، دین اور شریعت کا باہمی تعلق، دوسرے مذاہب، ان کے بانیوں اور ان کی آسمانی کتابوں کے متعلق قرآن کا نقطۂ نظر اور اس سلسلے میں پیغمبر اسلام کی عام دعوت اور انسانیت عامہ کی فلاح و بہبود کا اصل راز۔ ان تمام مباحث پر مولانا نے زور قلم کمال بلاغت اور وسعت فکر و نظر کا حق ادا کر دیا ہے۔ اس بحث کو پڑھ کر صاف محسوس ہوتا ہے کہ قرآن اس پروردگار عالم کا کلام ہے جس کی ربوبیت اور پروردگاری ہر انسان اور ہر شخص کے لئے ہے اور وہ کسی خاص ایک گروہ کے ساتھ مخصوص نہیں۔ قرآن فرقہ بندیوں اور گروہ سازیوں کو توڑنا چاہتا ہے نہ کہ ان میں اور اضافہ کرنا۔ وہ ایمان اور اعمال صالحہ کی طرف جو دعوت دیتا ہے وہ ایک ایسی ازلی اور ابدی حقیقت ہے جو ہر مذہب کی بنیاد ہے اس لئے اس کا کام وصل کردن ہے نہ کہ فصل کردن۔

چنانچہ مولانا اسلام کے لفظ کی تشریح بھی اسی وحدت ادیان کی روشنی میں اس طرح کرتے ہیں:۔

> "اس نے (قرآن نے) دین کے لئے الاسلام کا لفظ اسی لئے اختیار کیا ہے کہ "اسلام" کے معنی کسی بات کے مان لینے اور فرماں برداری کرنے کے ہیں وہ کہتا ہے، دین کی حقیقت یہی ہے کہ خدا نے جو قانون سعادت انسان کے لئے ٹھہرا دیا ہے اس کی ٹھیک ٹھیک اطاعت کی جائے۔ وہ کہتا ہے۔ یہ کچھ انسان ہی کے لئے نہیں ہے بلکہ تمام کائنات ہستی اسی اصل پر قائم ہے۔ سب کے بقاو قیام کے لئے خدا نے کوئی نہ کوئی قانون عمل ٹھہرا دیا ہے اور سب اس کی اطاعت کر رہے ہیں۔ اگر ایک لمحہ کے لئے بھی روگردانی کریں تو کارخانۂ ہستی درہم برہم ہو جائے...... وہ جب کہتا ہے "الاسلام" کے سوا کوئی دین اللہ کے نزدیک مقبول نہیں تو اس کا مطلب یہی ہوتا ہے کہ دین حقیقی کے سوا جو ایک ہی ہے اور تمام رسولوں کی مشترک تعلیم ہے انسانی ساخت

ہے وہاں تحقیق و تدقیق اور بحث و نظر کا حق ادا کر دیتے ہیں۔ چناں چہ قرآن میں ذوالقرنین نامی جس شخصیت کا ذکر آیا ہے اس کے بارے میں کافی اختلاف ہے کہ یہ کون شخص تھا؟ اکثر مفسرین کا رجحان یہ ہے کہ ذوالقرنین سے مراد سکندر مقدونی ہے۔ لیکن مولانا نے ان تمام آراء کے برخلاف بڑی تحقیق اور کاوش کے بعد آثار قدیمہ، انکشافات جدیدہ اور پھر خود قرآن کے بیان کی روشنی میں یہ ثابت کیا ہے کہ اس سے مراد ایران کا عظیم المرتبت بادشاہ کیخسرو ہے۔ مولانا نے اس بحث میں ایک بلند پایہ مؤرخ کا رول ادا کیا ہے۔ اسی طرح خدا کی ذات و صفات پر سورۂ فاتحہ کی تفسیر میں جو کلام کیا ہے وہ جس طرح انسانی فطرت و وجدان کو اپیل کرتا ہے فلسفہ کے طلباء اور علماء کو بھی متاثر کرتا ہے۔ مولانا قرآن کی اصل فطریت اور سادگی اور اس کی وجدانیت کے ساتھ فلسفے و سائنس کا پیوند اس خوش اسلوبی کے ساتھ لگاتے ہیں کہ وضعیت کا رنگ غالب نہیں ہونے پاتا اور وجدان کی بیداری کے ساتھ عقل کی تسکین کا بھی سامان ہوتا رہتا ہے۔

ان چیزوں سے قطع نظر عام تفسیروں میں ایک نقص یہ ہے کہ ان میں معمولی معمولی اور فروعی باتوں پر بہت زور دیا جاتا ہے۔ لیکن جہاں تک قرآن کی اہم اور بنیادی تعلیمات کا تعلق ہے جن کا رابطہ عام انسانی اجتماع و تمدن سے ہے ان پر یا تو کلام ہی نہیں کیا جاتا یا کلام کیا بھی تو محض سرسری اور ضمنی۔ جس سے قرآن کا بڑا مقصد فوت ہو جاتا ہے اور اس کا خطاب ایک قوم یا ایک جماعت کے ساتھ مختص ہو کر رہ جاتا ہے۔ مثلاً وحدت ادیان۔ اور دوسرے مذاہب اور ان کی الہامی کتابوں کی تصدیق۔ قرآن کی ایسی اہم اور بنیادی تعلیم ہے جس کو اس نے بار بار مختلف طریقوں سے بڑے شد و مد کے ساتھ بیان کیا ہے۔ لیکن عام مفسرین نے اس پر زیادہ اعتنا نہیں کیا اور جہاں کہیں ایسی آیات آتی ہیں ان پر سرسری طور سے گذر گئے ہیں۔ متاخرین میں غالباً حضرت حضرت شاہ ولی اللہ الدہلوی پہلے شخص ہیں جنھوں نے حجۃ اللہ البالغہ میں اور دوسری کتابوں میں اس حقیقت کو زیادہ اُبھارا اور اُجاگر کیا ہے اور ان کے بعد مولانا ابوالکلام آزاد دوسرے بزرگ ہیں جنھوں نے اس بحث پر نہایت مدلل، واضح اور پُر زور کلام کیا ہے

اور سرسید احمد خاں دونوں کی تحریروں سے کافی متاثر تھے اور ان کا بکثرت مطالعہ کرتے تھے چنانچہ اگر کوئی شخص سید رشید رضا کی تفسیر المنار اور مولانا کا ترجمان القرآن ایک ساتھ مطالعہ کرے تو اسے صاف نظر آئے گا کہ ایک ہی سانچے میں ڈھلے ہوئے دو ذہن ہیں جو دو مختلف زبانوں میں اظہارِ مطلب کر رہے ہیں۔

متوسطین میں مولانا حافظ ابنِ تیمیہ اور حافظ ابنِ قیم سے کافی متاثر ہیں۔ 'الہلال' اور 'البلاغ' کے زمانے میں مولانا کے قلم سے جو مذہبی تحریریں نکلیں ان میں یہ رنگ کافی نمایاں نظر آتا ہے۔ لیکن مولانا کے زورِ بیان و انشا اور قدرت و بلاغتِ کلام کا کمال یہ ہے کہ انھوں نے خواہ کوئی فکر یا خیال کہیں سے لیا ہو لیکن اس کو اس بسط و تفصیل سے اور مدلل و مبرہن بیان کریں گے کہ اس فکر کے بانی اور موجد وہی نظر آئیں گے۔

شروع شروع میں جب مولانا کی کتاب "ترجمان القرآن" چھپ کر آئی تو جیسا کہ پہلے سے توقع تھی جہاں عام طور پر اس کو ہاتھوں ہاتھ لیا گیا اور سراہا گیا مسلمانوں کے ایک طبقے میں اس پر سخت تنقید اور نکتہ چینی بھی ہوئی۔ جو لوگ چار پانچ صدیوں سے اجتہاد و فکر سے محروم ہو کر تقلیدِ محض اور جمودِ ذہنی کی زندگی بسر کر رہے ہوں ان میں مولانا ابوالکلام آزاد ایسے مجتہدِ فکر کا پیدا ہو جانا ان کے ہیجان کا باعث ہی ہو سکتا ہے۔ چناں چہ ترجمان القرآن پر تنقیدیں ہوئیں اور بہت دنوں تک اخبارات اور رسائل میں یہ سلسلہ چلتا رہا۔ اگر ان تمام تنقیدوں کا تجزیہ کیا جائے تو ان تنقیدوں کا ماحصل صرف یہ دو چیزیں ملیں گی:

۱۔ مولانا نے قرآنی حقائق کا بیان اور آیات کی تفاسیر میں بالکل قرآنی اسلوب کی پیروی کی ہے یعنی جہاں قرآن میں کوئی حقیقت مطلق ہے مولانا نے بھی اس کو اس طرح بیان کیا ہے اور جو حقیقت مقید بیان کی گئی ہے مولانا نے بھی اس کی رعایت رکھی ہے اس اسلوب سے ان لوگوں کی تشفی تو ہو جاتی ہے جو قرآن کو فقہ و کلام کی فرقہ بندیوں سے بلند و بالا ہو کر پڑھتے ہیں لیکن جن دماغوں پر فقہی مکاتب خیال کا اس قدر غلبہ ہے کہ وہ ان سے الگ ہو کر کسی بات کو سوچ ہی نہیں سکتے ان کو یقیناً مولانا کے اسلوب و زاویۂ نظر سے اختلاف ہونا چاہیے۔

کی کوئی گردہ بندی مقبول نہیں۔"

مولانا نے اس بحث کے آخر میں ایک بڑا نکتہ پیدا کیا ہے۔ مجھ کو یاد نہیں پڑتا کہ کہیں کسی اور جگہ میری نظر سے گزرا ہو۔ یہ سب کچھ لکھنے کے بعد خود سوال کرتے ہیں کہ :-

"جب قرآن کی دعوت کا یہ حال تھا تو پھر آخر اس میں اور اس کے مخالفوں میں وجہ نزاع کیا تھی؟ ایک شخص جو کسی کو برا نہیں کہتا سب کو مانتا اور سب کی تعظیم کرتا ہے اور ہمیشہ ان ہی باتوں کی تلقین کرتا ہے جو سب کے یہاں مانی ہوئی ہیں۔ کوئی اس سے لڑے تو کیوں لڑے؟ اور کیوں لوگوں کو اس کا ساتھ دینے سے انکار ہو؟"

اس سوال کو قائم کرنے کے بعد خود ہی اس کا جواب اس طرح دیتے ہیں :-

"اصل یہ ہے کہ پیروانِ مذاہب کی مخالفت اس لئے نہ تھی کہ وہ (قرآن) انھیں جھٹلاتا کیوں ہے، بلکہ اس لئے تھی کہ جھٹلاتا کیوں نہیں؟ ہر مذہب کا پیرو چاہتا تھا کہ قرآن صرف اسی کو سچا کہے باقی سب کو جھٹلائے۔ اور چونکہ وہ یکساں طور پر سب کی تصدیق کرتا تھا اس لئے کوئی بھی اس سے خوش نہیں ہو سکتا تھا۔"

یہ جو کچھ عرض کیا گیا اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ مولانا نے تفسیر میں جو کچھ لکھا ہے اس کا ذہنی پس منظر کیا ہے؟ اب سوال یہ ہے کہ یہ ذہنی پس منظر خود بخود بن گیا یا اس کی تعمیر میں چند خارجی مؤثرات و عوامل کا دخل ہے؟ اصل یہ ہے کہ انیسویں صدی کا نصف آخر اور بیسویں صدی کا شروع ایک ایسا دور ہے جس میں عالم اسلام نے فکری اور ذہنی طور پر ایک نئی کروٹ لی ہے۔ اس کے اسباب سیاسی بھی ہیں اور علمی بھی۔ دنیا کے عام تمدنی حالات بھی ہیں اور علوم جدیدہ کا ارتقا بھی! اسی نئی کروٹ کا نتیجہ تھا کہ مصر میں مفتی عبدہ اور سید رشید رضا پیدا ہوئے اور ہندوستان میں شبلی اور سر سید۔ مولانا ابوالکلام کی سوانح عمری سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ ایک طرف تو مولانا میں خود اجتہادِ فکر کی کمی نہیں تھی اور دوسری جانب وہ سید رشید رضا

رائے کیا چاہتی ہے اور کس طرح قرآن کو کھینچ تان کر اس کے مطابق کر دیا
جاسکتا ہے۔"

اس بنا پر مولانا کو متداول اور مروجہ تفسیروں سے جو شکایت ہے وہ یہ ہے کہ :۔

"جس مقام کی تفسیر میں متعدد اقوال موجود ہوں گے وہاں اکثر اسی قول کو
ترجیح دیں گے جو سب سے زیادہ کمزور اور بے محل ہو گا۔ جو اقوال نقل
کریں گے ان میں بہتر قول موجود ہو گا لیکن اس کو نظرانداز کر دیں گے۔"

مولانا کی مندرجہ بالا عبارتوں سے صاف معلوم ہو جاتا ہے کہ ان میں اور دوسرے مفسرین
میں جو راہوں کا اختلاف ہے اس کا مبنیٰ کیا ہے؟ اس بنا پر اگر بعض حلقوں میں مولانا کی تفسیر پر نکتہ چینی
ہوئی تو وہ ہرگز خلافِ توقع اور محلِ تعجب نہیں ہے۔

"ترجمان القرآن" قرآن مجید کی تفسیر بھی ہے اور ترجمہ بھی۔ اب تک آپ نے جو کچھ پڑھا وہ
تفسیر سے متعلق تھا۔ اب چند باتیں ترجمہ کی نسبت سن لیجئے:۔ یہ ظاہر ہے کہ ایک زبان سے کسی
دوسری زبان میں ترجمہ کرنے کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ جو لوگ اصل زبان سے واقف نہیں ہیں وہ
ترجمہ کے ذریعہ اس عبارت کا مفہوم و مطلب سمجھ جائیں مگر عام طور پر قرآن کے جو تراجم اردو میں
پائے جاتے ہیں اُن سے یہ مقصد حاصل نہیں ہوتا۔ کیونکہ یہ تراجم لفظی بلکہ تحت اللفظی ہیں اور ان
سے مقصد اخذ کرنا ہر شخص کے بس کی بات نہیں۔ اس قسم کے تراجم کے برخلاف مولوی نذیر احمد دہلوی
نے ترجمۂ قرآن میں دلّی کی بولی ٹھولی کو اس درجہ دخل دیا کہ بعض مقامات پر قرآن کی سنجیدگی اور
ثقافت مجروح ہو گئی۔ لیکن مولانا نے نہ وہ راہ اختیار کی اور نہ یہ۔ بلکہ ایک طرف تو قرآن کی عظمت
اور ثقافت کا پورا خیال رکھتے ہیں اور ایسا کوئی لفظ نہیں آنے دیتے جو قرآن کے مرتبۂ ثقافت
سے فروتر ہو اور دوسری جانب ترجمہ کی ترتیب اس طرح قائم کی ہے کہ وہ اپنی وضاحت میں
کسی کا محتاج نہیں۔ ایک عالم کی طرح ایک عام اردو خواں بھی اس سے پوری طرح استفادہ
کر سکتا ہے۔ پھر مولانا نے صرف ترجمہ پر اکتفا نہیں کیا ہے بلکہ جابجا نوٹوں کا بھی اضافہ ہے
جن میں مطالب قرآن کی تفسیر و توضیح کی گئی ہے۔ قرآن میں جو مطلب یا جو حکم مجمل تھا اس کی

۲۔ دوسرا اعتراض یہ تھا کہ مولانا نے تفسیر بالرائے سے کام لیا ہے جس کی حدیث میں مذمت آئی ہے لیکن یہ اعتراض بھی صحیح نہیں ہے کیونکہ جہاں تک مولانا کی تفسیر کے مآخذ کا سوال ہے ان کی نسبت مولانا نے خود لکھ دیا ہے کہ :

"پہلے اس کی تفسیر صحابہ و تابعین کی روایات میں ڈھونڈو۔ پھر بعد کے مفسروں کی طرف رُخ کرو اور دونوں کا مقابلہ کرو۔ صاف نظر آئے گا کہ صحابہ و سلف کی تفسیر میں معاملہ بالکل واضح تھا۔ بعد کی دقیقہ سنجیوں نے اسے کچھ سے کچھ بنا دیا اور اُلجھاؤ پیدا ہو گئے۔"

اس عبارت سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ مولانا نے جو کچھ لکھا ہے اس کی اصل صحابہ و سلف کے ہاں ضرور موجود ہے اور محض ایجاد بندہ نہیں ہے۔ جہاں تک تفسیر بالرائے کا تعلق ہے خود مولانا اس کے متعلق لکھتے ہیں :۔

" اشکال و موانع کا بڑا دروازہ تفسیر بالرائے سے کھل گیا جس کے اندیشے سے صحابہ و سلف کی روحیں لرزتی رہتی تھیں۔"

لیکن تفسیر بالرائے سے مولانا کی مراد کیا ہے؟ اس کو بھی مولانا کی زبان سے سن لیجئے تاکہ مولانا کا نقطۂ نظر سمجھنے میں کوئی گنجلک باقی نہ رہے۔ فرماتے ہیں :۔

" تفسیر بالرائے کا مطلب سمجھنے میں لوگوں کو لغزشیں ہوئی ہیں۔ تفسیر بالرائے کی ممانعت سے مقصود نہ تھا کہ قرآن کے مطالب میں عقل و بصیرت سے کام نہ لیا جائے۔ کیونکہ اگر یہ مطلب ہو تو پھر قرآن کا درس و مطالعہ ہی بے سود ہو جائے۔ حالانکہ خود قرآن کا حال یہ ہے کہ اول سے آخر تک تعقل و تفکر کی دعوت ہے اور ہر جگہ مطالبہ کرتا ہے کہ افلا یتدبرون القرآن ام علی قلوب اقفالها۔ دراصل تفسیر بالرائے میں رائے لغوی معنی میں نہیں ہے بلکہ رائے مصطلحہ شارع ہے اور اس سے مقصود ایسی تفسیر ہے جو اس لئے نہ کی جائے کہ خود قرآن کیا کہتا ہے بلکہ اس لئے کی جائے کہ ہماری کوئی ٹھہرائی ہوئی

روش صدیقی

امام الہند کی یاد میں

کون یہ آخرِ شب بزمِ سحر سے اُٹھا — نالۂ درد، دلِ اہلِ خبر سے اُٹھا

ہائے کس وقت بجھی شمعِ نہاں خانۂ عشق — شعلۂ غم نفسِ بادِ سحر سے اُٹھا

کون ہے محرمِ اسرارِ مشیت لیکن — اعتبار آج دعاؤں کا اثر سے اُٹھا

ہو گئے قافلۂ اشکِ رواں میں شامل — بارِ اندوہ نہ جب لعل و گہر سے اُٹھا

عظمتِ منبر و محراب جھکی جاتی ہے — کون خلوت کدۂ فکر و نظر سے اُٹھا

تا فلک سلسلۂ حزن و الم جاری ہے — جس طرف آنکھ اٹھی درد اُدھر سے اُٹھا

سن لیا جب کہ جدائی ہے یہاں شرطِ وصال — حشر خود اشکِ پشیماں تر و در سے اُٹھا

علم ہے شاہدِ پنہاں کا حجاب اکبر — ہاں یہ پردہ بھی ترے حسنِ نظر سے اُٹھا

مہ و خورشید نے آنکھوں سے لگایا اُس کو — کوئی ذرّہ جو تری راہ گذر سے اُٹھا

تو نے تمکینِ خرد، ذوقِ جنوں کو بخشی — ایک الزامِ کہن عشق کے سر سے اُٹھا

مرگ سے راز کھلا تیری دل آرائی کا
اک نیا دور ہے یہ تیری مسیحائی کا

تفصیل لکھی ہے تاکہ قرآن کا اصل مطلب سمجھنے میں کوئی دشواری نہ ہو اور جہاں جہاں قرآن کے کسی مطلب کو واضح کرنے کے لئے دلائل و شواہد کی ضرورت بھی وہاں دلائل و شواہد ہیں۔ اس طرح یہ ترجمہ بجائے خود مستقل افادیت کا حامل ہے۔ اگر کوئی شخص تفسیر کا مطالعہ نہ بھی کرے تو نفس ترجمہ اور اس پر جو نوٹس ہیں ان کی مدد سے قرآن کے مطالب کو سمجھ سکتا ہے۔

پھر ترجمہ اور تفسیر اور یہی نہیں بلکہ مولانا کے عام مذہبی مضامین کی ایک نمایاں خصوصیت جس پر شاید عام لوگوں کی نظر نہیں ہے یہ ہے کہ ان سب میں مولانا کا اسلوب بیان وہی ہے جو قرآن کا ہے یعنی حکیمانہ ہونے کے ساتھ ساتھ خطیبانہ بھی ہے اس میں وعد بھی ہے اور وعید بھی۔ تبشیر بھی ہے اور انذار بھی۔ کہیں وہ نسیم جاں فزا ہے اور کہیں برق صاعقہ فگن اس لئے قدرتی طور پر اس کا اثر ہوتا ہے اور قاری میں ہیجانی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ مولانا کا یہ طرز ادا یہ اسلوب بیان اُن کے ہر مذہبی مضمون میں نمایاں ہے لیکن جہاں تک ترجمان القرآن کا تعلق ہے تو یہ شراب دو آتشہ بلکہ سہ آتشہ ہو گئی ہے اور اس لئے غالب کا یہ شعر اس پر پوری طرح صادق آتا ہے ؎

ذکر اس پری وش کا اور پھر بیاں اپنا
بن گیا رقیب آخر جو تھا رازداں اپنا

سمجھ سکتے ہیں کہ وہ زندہ ہیں اور خدمتِ خلق کا رول ادا کر رہے ہیں۔

ایسے لوگوں کی تعداد کافی ہے جو مولانا ابوالکلام کے حالات بیان کرنے میں فصاحت اور بلاغت کے دریا بہا رہے ہیں اور فلسفیانہ انداز میں لطیف نکات پیش کر رہے ہیں لیکن اس مختصر مقالہ میں مجھے چند واقعات سادہ الفاظ میں بیان کرنے ہیں تاکہ خواص کے ساتھ عوام بھی ان سے سبق حاصل کر سکیں۔

'ہندوستان چھوڑ دو' والی تحریک سے کچھ دنوں قبل کا واقعہ ہے جب کہ جاپانی فوجیں ہندستان کا دروازہ کھٹکھٹا رہی تھیں اور یہ اندیشہ ہو رہا تھا کہ ان کی یلغار سے ہندوستان شاید ہی محفوظ رہ سکے۔ کانگریس ورکنگ کمیٹی کے ارکان مع صدر کانگریس مولانا ابوالکلام جیل میں تھے۔ ایسے وقت گاندھی جی نے ایک اخباری بیان میں یہ خیال ظاہر کیا کہ اگر جاپانیوں نے ہندوستان پر حملہ کیا تو ان کا مقابلہ بھی کانگریس عدم تشدد کے ساتھ کرے گی۔

اس وقت مولانا آزاد نینی سنٹرل جیل الہ آباد میں ایک مختصر سے یارڈ میں تھے جس میں صرف چار کوٹھریاں اور ایک ورانڈا تھا۔ ایک کوٹھری میں مولانا آزاد اور بقیہ تین میں ڈاکٹر کاٹجو کیشو دیو مالویہ اور راقم الحروف رکھے گئے تھے۔ جب گاندھی جی کا مذکورہ بالا انٹرویو اخبارات میں آیا تو مولانا آزاد کا اضطراب قابلِ دید تھا۔ وہ ہم سے بار بار کہتے تھے "میرے بھائی! یہ تو کانگریس کی پوزیشن ہے ہی نہیں۔ یہ گاندھی جی نے کیسے کہہ دیا۔" پھر فرماتے تھے کہ "کانگریس نے تو جاپانیوں کے مقابلہ کے لئے عدم تشدد کا کوئی فیصلہ نہیں کیا۔" مجھے مولانا کے وہ سب فقرے یاد نہیں جو رہ رہ کر زبان پر لاتے تھے۔ مگر مطلب یہ تھا کہ کانگریس کے لئے عدم تشدد کوئی مذہبی عقیدہ نہیں ہے بلکہ صرف ایک پالیسی ہے جو اس نے برطانیہ کے اقتدار سے آزاد ہونے کے لئے اختیار کر رکھی ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ جاپانیوں کے مقابلہ میں بھی عدم تشدد کا حربہ مؤثر سمجھا جائے۔

اتفاق سے میری اور مولانا کی کوٹھریوں کے درمیان ایک مستقل دروازہ کھلا تھا جس کے باعث ہر وقت ایک دوسرے کی حالت آنکھوں کے سامنے رہتی تھی۔ جب مولانا ورانڈے میں غم و غصہ کا اظہار کرنے کے بعد اپنی کوٹھری میں داخل ہوئے تو میں اپنی کوٹھری سے ان کے اضطراب

حافظ علی بہادر خاں

مولانا آزاد کے فکر و نظر کی چند جھلکیاں

تحریکِ خلافت کے دور میں مولانا ابوالکلام آزاد کی رفاقت حاصل ہوئی۔ جیل کی زندگی میں ایک عرصہ تک ان کے ساتھ ہم نوالہ وہم پیالہ رہنے کا موقع ملا اور بارہا اُن سے بحث و گفتگو کا بھی فخر حاصل رہا۔ ان ملاقاتوں اور مذاکروں میں یہ حقیقت مجھ پر ثابت ہو گئی کہ مولانا 'حیات بعد الممات' کے فلسفہ کے قائل تھے۔ ایک مقالہ میں خود انھوں نے یہ الفاظ لکھے:

"درحقیقت یہ ایک قانونِ حیات بعد الممات ہے جو کائنات کی ہر شے پر طاری ہے"۔ وہ اکثر قرآن کی یہ آیت پیش کیا کرتے تھے۔ یخرج الحی من المیت ویخرج المیت من الحی (وہ موت سے زیست اور زیست سے موت پیدا کرتا ہے)

اس فلسفہ کی روشنی میں یہ کہنا مشکل نہیں ہے کہ مولانا آزاد کی موت دراصل ایک نئی زندگی کا پیش خیمہ ہے ؎

ہرگز نمیرد آں کہ دلش زندہ شد بہ عشق	ثبت است بر جریدۂ عالم دوامِ ما

وہ عموماً یہ آیت بھی استعمال کیا کرتے تھے۔ الحمد للہ الذی احیانا بعد اماتنا (سب تعریف اس اللہ کے لئے ہے جس نے ہمیں زندگی دی بعد اس کے کہ ہم مر چکے تھے)

اس لحاظ سے مولانا کی وفات کے بعد اگر ان کی زندگی کے حالات تحریر و تقریر میں اس طرح پیش ہوتے رہیں جو قوم میں نئی روح پیدا کریں تو ان کی وفات کے بعد بھی ہم یہ

کہ ہاں میں نے ان کو توجہ دلائی تھی۔

اس واقعہ سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ مسٹر جناح کا یہ الزام کتنا غلط تھا کہ مولانا آزاد کانگریس کے یا ہندوؤں کے "شو بوائے" ہیں۔ ایک طرف تو گاندھی جی کی انصاف پسندی پر روشنی پڑتی ہے دوسری طرف ثابت ہوتا ہے کہ مولانا آزاد کو کانگریس میں خاص اقتدار حاصل تھا اور وہ کانگریس کے منصب، وقار اور روایات کے زبردست محافظ تھے۔

نینی جیل کی زندگی میں مولانا نے چند لکچر بھی ہماری درخواست پر دئے تھے۔ دوسرے یارڈ سے بھی سیاسی قیدی ان میں شریک ہونے کے لئے آ جاتے تھے۔ بعض رفیقوں کے مشورہ پر میں نے ان لکچروں کی بنیاد پر ایک طویل مقالہ بھی لکھا تھا جس پر خود مولانا نے جگہ جگہ ترمیم و اضافہ کیا تھا۔ ایک جگہ میں نے 'اسلامی کلچر' کا جملہ استعمال کیا۔ بین السطور میں مولانا نے اپنے قلم سے لکھ دیا۔ "بشرطیکہ اسلام جیسے عالمگیر مذہب کا کوئی کلچر ہو۔" اس پر میں نے جب مولانا سے گفتگو کی تو یہ پایا کہ ان کی رائے میں اسلام کا کوئی مخصوص کلچر نہیں ہے۔ مختلف ممالک کے لوگوں کے مختلف کلچر ہوتے ہیں اور مختلف زمانوں میں کلچر بدلتے رہتے ہیں مگر ان مختلف ممالک کے لوگوں اور مختلف زمانوں کے لئے اسلام ایک ہی رہتا ہے لہذا اسلام کا کوئی مخصوص کلچر نہیں ہو سکتا۔ وہ یہ بھی فرماتے تھے کہ کلچر ایسا نعرہ ہے جس کی کوئی تعریف نہیں کی جا سکتی اور مختلف ملکوں میں مختلف مفکّرین نے اس کا استعمال مختلف معنی میں کیا ہے۔

نینی جیل میں یہ عجب بات میں نے پائی کہ مولانا صبح سے شام تک صرف انگریزی کتابوں کا مطالعہ کرتے تھے۔ صرف صبح کے چار بجے ترجمان القرآن کا فائل لے کر بیٹھتے اور اس کے بعض مسائل پر غور کرتے تھے۔ اس کے بعد ان کے مطالعہ میں والٹیر، روسو، نٹشے، گوئٹے اور متعدد سیاسی لیڈروں کے سوانح حیات رہتے تھے۔ بعض کتابیں ایسی تھیں جن سے صرف بی اے، ایم اے کی قابلیت والے آدمی فائدہ اٹھا سکتے تھے۔ مجھے شک ہوا کہ مولانا کی انگریزی کی قابلیت اتنی ہے کہ ایسی ادق کتابیں سمجھ سکیں۔ اپنا شک رفع کرنے کے لئے ان کتابوں میں سے بعض کے مسائل پر میں نے مولانا سے سوالات کئے۔ مولانا نے جو جواب دیئے ان سے معلوم ہوا کہ نہ صرف انھوں نے وہ کتابیں پڑھی

کا دل چسپ نظارہ کرسکتا تھا۔ وہ کوٹھری میں نہایت بے قرار تھے اور بار بار یہی کہتے "کہ گاندھی جی نے یہ بالکل غلط بات کہہ دی۔" ایک بار اپنی کوٹھری میں مجھے مخاطب کرکے بولے۔ "گاندھی جی کی بھی عجب حالت ہے۔ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ وہ ہماری مشکلات کا باعث ہو جاتے ہیں اور پھر وہی ہماری مشکلات کا حل بھی ہوتے ہیں۔"

اس کے بعد مولانا کی سیاسی زندگی کا ایک اور پہلو نظر آیا۔ انھوں نے یہ کوشش کی کہ ایک تحریر جیل سے باہر بھجوائیں جو صرف خلافِ قانون طریقوں سے جاسکتی تھی۔ اسی زمانہ میں دو کانگریسی کارکن، ایک وکیل اور ایک اسکول ٹیچر اس لئے سزا پا چکے تھے کہ انھوں نے جیل میں سیاسی لیڈروں کو خفیہ خطوط پہنچانے کی کوشش کی تھی اور مشہور یہ تھا کہ یہ لیڈر بھی مولانا آزاد ہی تھے۔ یہ مسئلہ اُس زمانے کے کانگریسی کارکنوں میں مختلف فیہ تھا کہ جیل میں جانے کے بعد جیل کے قانون اور ڈسپلن کی پابندی کی جائے یا نہیں۔ مولانا آزاد اُس گروپ میں تھے جن کے نزدیک خفیہ خطوط کی آمد و رفت اگر وہ انقلاب کے لئے ہو تو جائز ہے۔ چنانچہ جب میں رہا ہونے لگا تو مجھے بھی ایک خط خفیہ طریقہ سے باہر لے جانے کا حکم ہُوا تھا۔ مگر پھر مولانا کو اور کوئی آسان ذریعہ مل گیا اور میں اس خطرناک خدمت سے محروم رہا۔

بہرکیف جب مولانا اس فکر میں تھے کہ گاندھی جی تک اپنا پیام پہنچائیں اور ان کی غلطی پر تنبیہ کریں خبر ملی کہ گاندھی جی الٰہ آباد تشریف لا رہے ہیں جہاں کملا میموریل اسپتال کا افتتاح فرمائیں گے نیز مولانا سے ملاقات کے لئے جیل میں بھی آئیں گے۔

گاندھی جی اور مولانا کی یہ ملاقات جیل سپرنٹنڈنٹ کے آفس میں ہوئی تھی جہاں ہم میں سے کوئی موجود نہ تھا۔ مگر گاندھی جی نے ملاقات کے بعد فوراً ہی ایک انٹرویو اخبارات کو دیا جس میں بتایا کہ پہلے انٹرویو میں جاپانیوں کے مقابلہ میں عدم تشدد کا حربہ استعمال کرنے کا جو خیال میں نے ظاہر کیا تھا وہ میرا ذاتی عقیدہ تھا کانگریس کا فیصلہ نہیں تھا۔ کانگریس ورکنگ کمیٹی کو اپنے فیصلہ کا اختیار ہے اور وہ کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ جب دوسرے روز گاندھی جی کا یہ بیان میں نے پڑھا تو مولانا سے دریافت کیا کہ کیا آپ نے گاندھی جی سے یہ نیا بیان دلایا ہے۔ مولانا نے فرمایا

اور مولانا کی ایکٹنگ کے لئے میں تماشائی تھا۔ مولانا کو جو ترنگ میں میر کی غزل پڑھتے دیکھا تو سوچا شاید مجھے دیکھ کر مولانا آزادی سے اپنے جذبات کا مظاہرہ نہ کر سکیں لہذا میں پلنگ پر لیٹ گیا گویا کہ سو رہا ہوں۔ مگر تقریباً ایک گھنٹہ تک نیم باز آنکھوں سے یہ تماشا دیکھتا رہا کہ مولانا لہرا لہرا کر غزل کے اشعار پڑھتے تھے اور جب مذکورہ بالا شعر پر آتے تو خوب اس کی رٹ لگاتے اور وجد میں آ جاتے۔ مقطع کو بھی بار بار دہراتے ؎

میر کے دین و مذہب کو کیا پوچھو ہو تم ان نے تو

قشقہ کھینچا دیر میں بیٹھا کب کا ترک اسلام کیا

مولانا کی آنکھیں کیا دکھنے آئیں کہ میرا نصیب جاگ اٹھا۔ کیونکہ صبح کا ملنا تو بند ہو گیا تھا مگر چائے کا دور ضرور اپنے وقت پر چلتا تھا۔ اس کے بعد اکثر مولانا کی گل افشانیاں صبح تک جاری رہتی تھیں۔ اگرچہ اردو زبان میں گل افشانی کا محاورہ کبھی برے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے مگر میں اصلی لغوی معنی میں استعمال کر رہا ہوں۔ بلا مبالغہ پھول جھڑتے تھے۔ کاش کہ اللہ تعالیٰ مجھے وسعت داماں بھی بخشتا۔ خیر جتنا بھی مل گیا اس کے لئے شکر ادا نہیں کر سکتا۔ اگر اس گفتگوئے صبح گاہی کے مختلف پہلو لکھنے لگوں تو سو ڈیڑھ سو صفحات لکھنے کے بعد بھی یہی کہتا رہوں گا ع

کچھ اور چاہیئے وسعت مرے بیاں کے لئے

جیل کی زندگی میں مولانا کے تبصرے، لطیفے اور پند و نصائح سننے کے متعدد مواقع ملتے تھے۔ دو وقت کھانے کی میز پر، ایک وقت ناشتہ کے ساتھ، اور ایک بار شام کو پانچ بجے کی چائے پر۔ علاوہ بریں جب اخبارات پڑھ چکتے تھے تو اس روز کی خبروں پر بھی رائے زنی ہوتی تھی۔ پھر شام کو ہم لوگ بیڈمنٹن کھیلتے اور مولانا کتاب لے کر ورانڈے میں بیٹھتے اور کھلاڑیوں کو داد دیتے۔ کبھی شطرنج جم جاتی تھی۔ دو ایک شاطر دوسرے یارڈوں سے بھی آ جاتے تھے۔ مگر عموماً میں ایک طرف ہوتا اور سب مل کر مجھے مات دینے کی کوشش کرتے۔ میرے مقابلہ پر ڈاکٹر کاٹجو یا کرشن کانت مالویہ بیٹھتے تھے مگر چالیں بتانے میں مولانا بھی شریک ہوتے تھے۔ میں سب کو مات دیا کرتا تھا۔ لیکن ایک روز مجھ سے ایسی غلطی چال میں ہو گئی کہ ڈاکٹر کاٹجو نے مات کر دیا۔ بس پھر کیا تھا مولانا نے

اور سمجھی ہیں بلکہ ان مسائل سے متعلق دوسری بھی بہت سی انگریزی کتابوں کا مطالعہ کر چکے ہیں۔
فہم مضامین کے اعتبار سے ان کی قابلیت ایم اے سے زیادہ تھی لیکن انگریزی میں گفتگو بالکل نہیں کر سکتے تھے۔ ایک بار جیل میں انگریز حاکم (غالباً ڈپٹی کمشنر تھا) آگیا تھا۔ وہ مولانا سے انگریزی میں بات کرتا تھا تو مولانا سمجھ تو لیتے تھے مگر جواب اُردو میں ہی دیتے تھے۔ بعد میں مولانا نے انگریزی بولنے کی بھی کچھ مہارت پیدا کی تھی مگر نہ اس قدر کہ بے تکان بات چیت کر سکیں۔ میرا خیال ہے کہ مولانا کو انگریزی بولنے میں صرف اس لئے تکلّف تھا کہ تحریر و تقریر میں جو بلند معیار ان کے پیشِ نظر رہتا تھا اُسے گفتگو میں قائم نہیں رکھ سکتے تھے اسی لئے مولانا نے شاعری ترک کر دی تھی وہ فی البدیہہ شعر کہتے تھے جو نہایت اچھے بھی ہوتے تھے لیکن مولانا کے اعلیٰ معیار پر پورے نہیں اُترتے تھے اس کا یہ مطلب نہیں کہ جو اعلیٰ معیار انھوں نے قائم کیا تھا اس کے مطابق وہ شعر نہیں کہہ سکتے تھے لیکن ایسے شعر کہنے کے لئے جتنی فرصت درکار تھی وہ انھیں کبھی حاصل نہیں ہوئی۔ مجبوراً انھوں نے شعر گوئی کا شوق ترک کر دیا۔

شعر و شاعری کا ذکر آگیا تو ایک واقعہ اور بھی لکھ دوں۔ مولانا کی آنکھیں آشوب کر آئیں جس کے باعث ان کا مطالعہ بند ہو گیا۔ معمول یہ تھا کہ میں اور وہ چار بجے صبح اُٹھتے۔ مولانا اپنے ہاتھ سے چائے تیار کرتے اور پینے کے لئے مجھے ضرور بلاتے۔ دو دو کپ پی کر ہم الگ ہو جاتے اور اپنا اپنا مطالعہ شروع کر دیتے۔ لیکن جب آنکھیں دُکھنے لگیں تو کبھی تو صبح تک باتوں میں گذر جاتی اور کبھی میں اپنی کوٹھری میں چلا آتا اور مولانا تنہا کچھ سوچتے یا اشعار پڑھتے رہتے۔ ایک روز چائے کے بعد جب میں اپنی کوٹھری میں آکر مطالعہ میں مشغول ہوا تو کیا دیکھتا ہوں کہ مولانا اپنی کوٹھری میں چہل قدمی کرتے جاتے ہیں، سگریٹ کے دھوئیں چھوڑتے جاتے ہیں اور میر کی غزل کا یہ شعر ہلکی آواز سے مزے لے لے کر گاتے جاتے ہیں ؎

عہدِ جوانی رو رو کاٹا پیری میں لیں آنکھیں موند
یعنی رات بہت تھے جاگے صبح ہوئی آرام کیا

اُوپر بتا چکا ہوں کہ دونوں کوٹھریوں کی پوزیشن ایسی تھی کہ درمیان میں مستقل در کھلا ہوا تھا

اسی احاطہ کے اندر بیڈمنٹن کا کورٹ تھا۔ ہم سب اے کلاس قیدی تھے اس لئے جو کھانا جیل سے ملتا تھا اس میں اپنے خرچ پر اضافہ بھی کر سکتے تھے۔ کبھی کبھی پنڈت نہرو کے گھر سے (غالباً وجے لکشمی پنڈت کی طرف سے) کوئی کھانے کی چیز آجاتی تھی۔ مگر زیادہ تر وہیں کھانا تیار ہوتا تھا۔ احمد نگر کی اسیری کے دوران نیز اپنی کوٹھی پر مولانا معمولی چائے کی بجائے یاسمین سے شوق کرتے تھے مگر نینی سنٹرل جیل میں لپٹن یا بروک بانڈ ہی استعمال ہوتی تھی۔ کبھی اتفاق سے صبح چار بجے کی بجائے کے وقت اگر رات کا دودھ خراب ہوگیا یا بلی پی گئی تو پھر مولانا بغیر دودھ کی چائے کا سیٹ نکالتے تھے۔

بمبئی میں آغا حشر کشمیری مشہور ڈراماٹسٹ سے جو مولانا کے ساتھ تھے مجملہ اور حالات کے مولانا آزاد کے اشعار بھی سنے تھے۔ ان میں سے دو ایک شعر مجھے یاد تھے۔ نینی جیل میں میں نے مولانا سے دریافت کیا کہ آیا یہ اشعار ان کے ہی ہیں اور آغا حشر کی سند پیش کی۔ مولانا یہ کہتے ہوئے اپنی کوٹھری میں چلے گئے "کہ عہد جاہلیت کی باتوں سے کیا فائدہ؟" ان میں سے دو شعر یہ ہیں ؎

وعدۂ وصل بھی اک طرفہ تماشہ کی ہے بات | میں تو بھولوں نہ کبھی ان کو کبھی یاد نہ ہو
آزاد بے خودی کے نشیب و فراز دیکھ | پوچھی زمین کی تو کہی آسمان کی

مولانا کبھی کبھی بمبئی میں بھی رہے ہیں مگر ان کی سرگرمیاں زیادہ تر کلکتہ ہی میں محدود رہیں۔ بمبئی میں پریل روڈ پر ان کے والد کے نام سے ابھی تک مسجد خیرالدین موجود ہے۔ ایک بار تحریکِ خلافت کے زمانہ میں منبر پر کھڑے ہوکر میں نے سیاسی تقریر کی تو مجھے سیٹھ عبدالرحمٰن فیت والا مرحوم نے بتایا کہ اسی منبر پر مولانا آزاد کے والد اپنا خطبہ اس مصرعہ سے شروع کیا کرتے تھے ع

سب کا خدا خدا ہے میرا خدا محمدؐ

اس مصرعہ میں مذہبی عقائد کا جو تصور ہے اس کے خلاف مولانا آزاد نے جس طرح بغاوت کی اس کا نقشہ مولانا ملیح آبادی کی کتاب "آزاد کی کہانی خود آزاد کی زبانی" میں نہایت دلچسپ پیش کیا گیا ہے۔ یہاں صرف اتنا اشارہ کافی ہے کہ باپ اور بیٹے کے عقائد میں یہ بعد المشرقین بہت ہی

بساط اُلٹ دی اور فرمایا کہ بس اب حافظ جی کو مات ہوگیا اب نہیں کھیلتے اور دوسرے یارڈوں میں بھی شاطروں کو خبر بھجوادی کہ "حافظ جی کو مات ہوگیا۔" جیل میں تاش بھی ہوتا تھا مگر مولانا اس میں کبھی دلچسپی نہیں لیتے تھے۔

مولانا ابوالکلام آزاد کی اس زندگی کا نقشہ پیش کرتے ہوئے چند الفاظ اس بارک کے متعلق لکھ دینا ضروری ہیں جس میں مولانا کو قید کیا گیا تھا اور جہاں حسنِ اتفاق سے مجھے مولانا کی دو رات کی معیت نصیب ہوگئی تھی۔ یعنی سنٹرل جیل الہ آباد کے مضافات میں بہت وسیع جیل ہے۔ اس کے اندرونی وسیع رقبہ کے ایک گوشہ میں چار کوٹھریوں کے گرد احاطہ کی دیوار بنا کر وہ بارک بنائی ہے جس میں مولانا آزاد کو رکھا گیا تھا۔ اسے جیل کے قیدی "کتا بارک" کہتے ہیں۔ اس لئے کہ اس میں ان قیدیوں کو رکھا جاتا تھا جن کو پیٹنے کا پروگرام ہوتا تھا۔ ان کوٹھریوں میں بند کرکے جب ان پر مار پڑتی تھی تو یہ کتنا ہی چیخیں اور چاہے کتوں کی طرح چلاتے مگر دوسری بارک تک آواز نہ پہنچتی تھی اس لئے بارک کا نام کتا بارک "پڑ گیا تھا۔ جب پنڈت جواہر لال نہرو کے والد پنڈت موتی لال نہرو کو گرفتار کیا گیا تو یہی چار کوٹھریاں رہنے کو دی گئیں تاکہ وہ عام قیدیوں سے بالکل الگ رہ سکیں اور ان پر سیاسی اثرات نہ پڑنے پائیں۔ پنڈت موتی لال نہرو کے لئے انگریزی حکومت نے ایک ورانڈا اور بنوا دیا۔ میں جب پہنچا ہوں تو اس میں تین سیاسی قیدی تھے۔ ایک مسٹر کیشو دیو مالویہ دوسرے بال کرشن شرما نوین اور تیسرے مسٹر پالیوال یہ تینوں اترپردیش کے مشہور سیاسی لیڈر تھے۔ میں اگرچہ بمبئی کا تھا مگر الہ آباد میں ایک تقریر کی تھی جس کے جرم میں وارنٹ بھیج کر حکومت نے بمبئی سے گرفتار کرا لیا تھا۔ اس کے بعد کوئی نہ کوئی رہا ہوتا گیا اور ڈاکٹر کاٹجو، آر ایس پنڈت رد جے لکشمی کے سوگباشی شوہر مولانا آزاد اور ڈاکٹر حسین ظہیر باری باری آتے گئے۔ مولانا کو پہلے تو ایک ہی کوٹھری ملی تھی لیکن بعد میں ہم لوگوں نے مولانا کی تکلیف کا خیال کرکے ان کو دو کوٹھریاں دے دیں اور دو آدمی ایک میں ہو گئے۔ مولانا ایک کوٹھری بطور غسل خانہ استعمال کرنے لگے۔ ان کوٹھریوں کے رقبہ کا اندازہ یوں کیجئے کہ جس کوٹھی میں مولانا کا انتقال ہوا اس کے ڈرائنگ روم میں نینی جیل والی چھ کوٹھریاں بن سکتی تھیں

وزیر قانون تھے تو انھوں نے مدح صحابہ کے حق میں رائے دی تھی۔ ڈاکٹر کاٹجو کو یہ موقع اس وقت ملا تھا جب کانگریس نے صوبائی خودمختاری کے دور میں وزارتیں بنائی تھیں۔ مولانا آزاد مدح صحابہ کی تحریک کے خلاف تھے۔ اور اس بارے میں جمیعۃ العلماء اور مجلس احرار دونوں سے ان کو اختلاف تھا۔ ڈاکٹر کاٹجو نے روزنامہ 'ہلال' کا وہ پرچہ مولانا کو دکھایا۔ مولانا مجھ پر خفا ہوئے کہ تمھارے اخبار میں ایسے مقالات کیوں چھپتے ہیں۔ ڈاکٹر حسین ظہیر بھی اس وقت جیل میں تھے۔ میں نے یہ کہہ کر معذرت کرلی کہ میں تو بمبئی سے اتنی دور آپ کے پاس ہوں مجھ پر "ہلال" کے مقالات کی کوئی ذمہ داری نہیں ہوسکتی پھر بھی مولانا نے مجھ سے ایک خط بمبئی لکھوا دیا جس میں ادارۂ 'ہلال' کو ایسے مقالات شائع کرنے کی ممانعت کردی گئی تھی۔

اس واقعہ سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ مولانا کے سامنے کسی وقت بھی کسی خاص فرقہ کی مخالفت یا موافقت کا سوال نہیں تھا۔ وہ ہر معاملہ پر اس کے حسن و قبح کے لحاظ سے نظر ڈالتے اور ایک نتیجہ پر پہنچ کر بلاخوف لومۃ لائم اس پر قائم رہتے تھے۔

میرے نزدیک مولانا آزاد کی شمولیت کانگریس سے پہلے کا سب سے اہم واقعہ ۱۹۱۲ء میں پیش آیا جب کہ وہ یونی ورسٹی فاؤنڈیشن کمیٹی کے جلسہ منعقدہ لکھنؤ میں مولانا محمد علی کے خلاف کھڑے ہوگئے۔ ذاتی تجربات کی بنا پر کہتا ہوں کہ اس اختلاف کے نتائج کا اثر مولانا کی تمام زندگی پر پڑا۔ 'الہلال' میں اس اختلاف پر مولانا نے نہایت رنگین سلسلۂ مضامین "حدیث الغاشیہ" کے عنوان سے لکھا۔ جواب میں علی برادران نے مولانا کے مقابلہ میں محاذ قائم کیا۔ بدقسمتی سے چار برس روزنامہ 'خلافت' کا ایڈیٹر رہنے کے باعث میرا دامن مولانا شوکت علی صاحب کے ساتھ وابستہ ہوگیا تھا۔ عقائد مولانا آزاد سے ملتے تھے مگر زندگی مخالف کیمپ میں گذرتی تھی۔ میں نے یہ پایا کہ گو مولانا آزاد نے محض قابلیت کے زور سے ہندوستان کے سیاسی حلقوں میں اپنا ایک بلند مقام بنا لیا مگر بڑی حد تک ان کو عام پلیٹ فارم چھوڑ دینا پڑا۔ بہت لوگوں کو یہ شکایت رہی کہ ہندوستان کے اعلیٰ ترین خطیب ہوتے ہوئے بھی مولانا بہت کم عوامی پلیٹ فارم پر آکر تقریر کرتے ہیں۔ لیکن اصلی سبب یہ تھا کہ پلیٹ فارم پر علی برادران کا قبضہ تھا جو مولانا کو پلیٹ فارم

دل چسپ ہے۔ لیکن اس سے یہ مطلب نہ سمجھنا چاہیئے کہ مولانا آزاد بالکل وہابی ہو گئے تھے۔ ان کی وسیع الخیالی کا تجربہ مجھے کئی اہم مواقع پر ہوا۔ ۱۹۲۳ء میں جب میں روزنامہ 'خلافت' کا ایڈیٹر تھا تو میں نے اس میں تصاویر کی اشاعت شروع کی۔ اس پر مولویوں نے بہت مخالفت کی کیونکہ ان کے نزدیک فوٹو کی اشاعت حرام تھی۔ مولانا یہ سلسلہ 'الہلال' میں شروع کر چکے تھے۔ میں نے ان سے اخلاقی امداد طلب کی۔ مولانا نے کوئی اعلان تو نہیں دیا مگر پرائیویٹ طریقہ سے بعض سرکردہ مخالفین کو سمجھا دیا اور مجھے چند ایسے مشورے دیئے جو تیر بہدف ثابت ہوئے۔ مثلاً یہ کہ مظلومین اور قائدینِ ترکی کے فوٹو شائع کرو جب لوگ عادی ہو جائیں تو آگے قدم بڑھانا۔ اس طرح روزنامہ 'خلافت' میں فوٹو چھپنے کا رواج ہو گیا۔

دوسرا واقعہ ان کی وسعت نظری کا یہ ہے کہ جب کمال اتاترک نے خلیفہ کو جلا وطن کر کے جمہوریت قائم کی تو مولانا نے اس خیال کی تائید کی کہ ایک جمہوری کونسل بھی خلیفہ کی قائم مقام ہو سکتی ہے۔ خلیفہ کی جلا وطنی پر اُن کے اور علی برادران کے درمیان نہایت ناخوش گوار مناقشہ بھی ہوا مگر مولانا نے ایک سلسلۂ مضامین میں کمال اتاترک کے طریق کار کی حمایت کی۔

مسلمانوں میں جس قسم کا پردہ رائج ہے مولانا اسے غلط سمجھتے تھے۔ جیل میں اس مسئلہ پر کافی گفتگو ہو چکی تھی لیکن جیل سے باہر بھی ایک بار جب میرے دوست خلیل شرف الدین مع اپنی ہمشیرہ کے مولانا کی ملاقات کو گئے تو ان کی ہمشیرہ کا صرف چہرہ اور ہاتھ کھلے تھے۔ مولانا نے فرمایا اسلام کا منشا اسی قسم کا پردہ ہے۔

مولانا کا تعلق اسلام کے کسی فرقہ سے نہیں تھا۔ وہ اجتہاد کا درجہ رکھتے تھے اور ہر مسئلہ پر اسلام کی تعلیمات کی روح و منشاء کی روشنی میں نظر ڈالتے تھے۔ حال میں کتاب "آزاد کی کہانی" کے بعض ابواب سے شیعہ فرقہ کو یہ غلط فہمی ہو رہی ہے کہ مولانا ان کے خلاف تھے لیکن نینی جیل میں ایک واقعہ پیش آیا جو اس غلط فہمی کو دور کر سکتا ہے۔ جب ہم جیل میں تھے تو لکھنؤ میں مدح صحابہ کا قضیہ چل رہا تھا۔ میرے اخبار روزنامہ 'ہلال' میں ایک مقالہ مدح صحابہ کی تائید میں شائع ہوا تھا۔ یہ پرچہ جب جیل میں آیا تو ڈاکٹر کاٹجو نے اس مقالہ میں دلچسپی لی کیونکہ جب وہ یو۔پی میں

کی تحریر ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ کانگریس میں شرکت سے بہت پہلے ان کے رجحانات کانگریسی تھے۔

جیل میں مذہبی مسائل پر مولانا سے اکثر گفتگو ہو جاتی تھی مگر یہاں اس کا تذکرہ مناسب نہیں ہوگا۔ لیکن ایک ادبی مسئلہ کی طرف اشارہ کر دینا دل چسپی سے خالی نہ ہوگا۔ گزشتہ عید کو جب میں ملاقات کے لئے گیا تو موقع پا کر ایک سوال کر بیٹھا جس کا جواب تو انھوں نے دیا مگر ادھورا کیونکہ دوسرے لوگ آ گئے۔ سوال اس بارے میں تھا کہ جناب غلام رسول مہر نے جو کتاب غالب پر لکھی ہے اس میں غالب کے گھر کو قمار خانہ اور غالب کا جواریوں سے نال وصول کرنا ثابت کرنے کے لئے مولانا آزاد کی سند پیش کی ہے۔ اور مولانا آزاد نے نواب لوہارو کی شہادت پر بھروسہ کر کے غلام رسول مہر کو اس بارے میں تحریر دی ہے۔ میں نے مولانا سے عرض کیا کہ نواب لوہارو کی شہادت قابلِ اعتبار نہیں بلکہ TAINTED (مجروح) ہے کیونکہ غالب کی گرفتاری کے بعد خاندان لوہارو نے ایک مہینہ جواری کے ساتھ اپنے ہر تعلق سے بے زاری کا اعلان کر دیا تھا۔ حالاں کہ خاندان لوہارو سے غالب کے تعلقات کا سب کو علم ہے۔ یہ ہو سکتا ہے کہ بس اعلانِ بیزاری کو حق بجانب ثابت کرنے کے لئے اس خاندان کے ایک فرد نے مولانا کے سامنے غالب کے متعلق ایسا بیان دیا ہو۔

مولانا نے جواب کا آغاز اس طرح کیا تھا کہ غالب کا خرچ بہت تھا اور آمدنی کم تھی اس لئے انھوں نے اپنے گھر شہر کے جواریوں کو جمع کرنا شروع کر دیا تھا تاکہ آمدنی کا سلسلہ قائم رہے۔ ایسے حالات میں خاندان لوہارو کے ایک ذمہ دار آدمی کی شہادت کافی ہے۔ خصوصاً جب کہ مجھے معلوم ہے کہ وہ مجھ سے جھوٹ نہ بولیں گے۔ ابھی مولانا سمجھا ہی رہے تھے کہ چند آدمی آ گئے اور تھوڑے انتظار کے بعد مجھے رخصت ہو جانا پڑا۔ مگر مولانا کے جواب سے مجھے ذرا بھی تشفی نہ ہوئی۔

میں نے مولانا کے سامنے ایک اور وقت مرزا ابوالفضل کی غیر مطبوعہ تصانیف کے مسودوں کے بارے میں بھی چند گزارشات پیش کی تھیں اور مولانا نے ضروری کارروائی کرنے

سے الگ رکھنے کی کوشش کرتے تھے۔

مولانا نے بھی اس کا احساس کیا اور اسی احساس کا نتیجہ تھا کہ مولانا نے "پنجاب پارٹی" بنائی درا صل مجلس احرار کی تنظیم میں بھی مولانا آزاد کا اشارہ شامل تھا۔ مگر مجلس احرار بہت جلد ایسی راہوں پر پڑ گئی جو مولانا کو پسند نہیں تھیں۔ نینی جیل میں پنجاب کے بعض لیڈر مولانا سے ملنے آئے اور اس جیل انٹرویو کے بعد انھوں نے مجلس احرار سے علحدگی کا اعلان کیا۔ مثلاً جناب داؤد غزنوی صاحب نے ہمیشہ کے لئے مجلس احرار کو نینی جیل کی انٹرویو کے بعد ہی چھوڑا ہے۔ پلان یہ تھا کہ مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری، محمد داؤد غزنوی، مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی اور دیگر بعض اکابر اجتماعی طور سے مجلس احرار سے الگ ہو کر صرف کانگریس میں شریک رہیں مگر پلان پوری طرح کامیاب نہیں ہوا۔

بہر کیف علی برادران اور اُن کے ساتھی علانیہ الزام لگاتے تھے کہ مولانا آزاد نے 'پنجابی ٹولی' کو ہم سے بھڑا دیا ہے۔ مولانا عبدالقادر قصوری مرحوم اس پنجابی ٹولی کے لیڈر قرار دیئے جاتے تھے۔

علی برادران اور مولانا آزاد کی کش مکش کا اثر یہ ہوا کہ مولانا آزاد کی اُن تقریروں سے دنیا محروم ہوگئی جو 'الہلال' والی اردو میں ہوتی تھیں اور جنھوں نے ان کو 'ابوالکلام' بنایا تھا۔ کانگریس کے مشترکہ پلیٹ فارم پر انھوں نے سادہ اردو بلکہ ہندوستانی میں اظہار خیالات شروع کر دیا جس میں مغز ضرور ہوتا تھا مگر وہ جادو کہاں جو سامعین کو دیوانہ بنا دیتا تھا۔

مولانا کی زندگی اور ان کی تحریروں پر ایک نظر ڈالنے سے مجھ پر یہ عقدہ بھی کھلا کہ کانگریس میں شامل ہونے سے تقریباً دس برس پہلے سے وہ کانگریس کے رجحانات کو پسند کرتے تھے۔ مثلاً ۲۶-فروری ۱۹۱۳ء کے 'الہلال' میں مسلمانوں کی نئی بیداری پر بحث کرتے ہوئے لکھا تھا:

> "مسلمانوں میں نئی حرکت کی تاریخ تقسیم بنگال کی منسوخی سے شروع ہوتی ہے۔ اس سے پہلے صرف خال خال اشخاص تھے جن کو کانگریسی، باغی، بے وفائے قوم، مفسد اور اسی طرح بعض بعض اصطلاحاتِ خاص سے یاد کیا جاتا تھا۔"

اس اقتباس میں غور کیجئے کہ "کانگریسی" کا استعمال کس پیرایہ میں کیا گیا ہے۔ یہ ۱۹۱۳ء

شمیم کرہانی

خضرِ حیات

ٹوٹا ہے آج خاکِ وطن پر وہ کوہِ غم
پربت کا دل اداس ہے گنگا کی آنکھ نم
یک جا ہیں سوگوار صنم خانہ و حرم
غم سے جبینِ پیچ پہ چشمِ ہندوستاں ہے خم
مشرق کی صبحِ نو کا اُجالا چلا گیا
فرزندِ ارجمندِ ہمالا چلا گیا

جس نے جنوں کو عام کیا وہ ابوالکلام
جس نے خرد کا کام کیا وہ ابوالکلام
مغرب کو جس نے رام کیا وہ ابوالکلام
مشرق کا جس نے نام کیا وہ ابوالکلام
ہر نا امید دل کو جو امید دے گیا
شامِ وطن کے ہاتھ میں خورشید دے گیا

وہ اُٹھ گیا، وطن کو ملا جس سے آب و رنگ
جس نے حیاتِ عصر کو بخشی نئی اُمنگ
دل جس کا کوہِ ہند تھا، خوں جس کا موجِ گنگ
دانش نے جس کی توڑ دئے جادوئے فرنگ
خضرِ حیات وہ رہبرِ بیدار چل دیا
ہندوستاں کا قافلہ سالار چل دیا

دانش میں طاق، فن میں یگانہ تھی جس کی ذات
اک روزگارِ نو کا ترانہ تھی جس کی ذات
عہد آفریں جنوں کا فسانہ تھی جس کی ذات
دنیا تھی جس کی ذات، زمانہ تھی جس کی ذات
بے تاب ایک دل میں جہاں کی حیات تھی
ذاتِ ابوالکلام تھی یا کائنات تھی

کا وعدہ بھی فرمایا تھا۔ میں نے بمبئی کے متعلقہ حضرات مثلاً عبدالحکیم صاحب (مالک شرف الدین الکتبی وادارہ) کو یہ خوشخبری بھی پہنچادی تھی۔ مگر یہ نہیں معلوم ہو سکا کہ اس اہم کام میں مولانا نے کیا اقدامات کئے۔

مولانا کی زندگی کے سب واقعات جو میرے تجربہ میں آئے ایک مقالہ میں نہیں سما سکتے۔ اس لئے یہاں بس کرتا ہوں ؎

تو مپندار کہ ایں قصہ بخود می گویم — گوش نزدیک لبم آر کہ آوازے ہست

روحی الہ آبادی

قطعۂ تاریخ وفات حسرت آیات امام الہند حضرت مولانا ابوالکلام آزاد نور اللہ مرقدہٗ

اُٹھ گیا آزاد ذی فضل و کمال — ہو گئی سنسان بزمِ سوز و ساز

چشم ناکامِ تماشائے جمال — گوش محرومِ صدائے دل نواز

چھپ گیا علم و ادب کا آفتاب — آ گئی شامِ بلا محشر طراز

جنگِ آزادی کا وہ مردِ جری — سرزمینِ ہند کو تھا جس پہ ناز

تھا غریبوں کا انیس و غمگسار — دردمندانِ وطن کا چارہ ساز

تھا سراپا درد وہ عالی تبار — پیکرِ اخلاص تھا وہ پاک باز

اس کا دل تھا محرمِ رازِ حیات — دوربیں تھی اس کی چشمِ امتیاز

رحلتِ آزاد کی صبحِ ملال — لے کے آئی ہے شبِ ہجرِ دراز

اس کی فرقت میں ہیں آنکھیں خونچکاں — ہے زباں پہ یہ دعائے دل گداز

وقفِ عیشِ جاوداں ہو اس کی روح — دے اسے جنت خدائے بے نیاز

یہ ہے روحی اس کی تاریخِ وفات

زیرِ تربت اب ہے محوِ خوابِ ناز

۱۹۵۸ء

آواز کی تھی گونج کہ بادل کی تھی گرج
ہر سانس اک جہاد تھی ہر گام ایک حج
کیا زندگی کی شان تھی، کیا بانکپن کی دھج
رہتی تھی منچلے کی جبیں پہ کلاہ کج
مردِ فقیر، شوکتِ شاہانہ لے گیا
صحرا میں قیس کا رنگ تھا دیوانہ لے گیا

کیا دورِ اضطراب تھا کیا گردشِ مدام
زنداں میں اک قدم تو بیاباں میں ایک گام
بچپن حصولِ ہوش و خرد میں ہوا تمام
گزری جنوں میں عہدِ جوانی کی صبح و شام
فصلِ شباب تیشہ زنی میں گزر گئی
پیری تمام کوہ کنی میں گزر گئی

بے شیشہ و چراغ تھی گو زندگی کی رات
سینے میں ضوفشاں تھی مگر مشعلِ حیات
فکر و نظر کے نور سے روشن تھے شش جہات
چلتا تھا ساتھ ساتھ جہانِ تجلیات
نقشِ قدم تھے مہر کا پرتو لئے ہوئے
اک صبح گامزن تھی نئی ضو لئے ہوئے

ہر راستے میں سنگ، ہر اک رہگذر میں خار
اپنوں کا وہ سلوک کہ دشمن ہوں شرمسار
ملت کے اس عناد کے باوصف زینہار
خاطر کے آئینے پہ نہ پایا گیا غبار
تھی کون سی وہ بات جو وجہِ محن نہ تھی
لیکن جبینِ عزم پہ کوئی شکن نہ تھی

وہ عہدِ طوق و دار وہ ہنگامِ قید و بند
وہ حریت کا شور، وہ زنداں کا زہر خند
وہ ہر فضا پہ دام، وہ ہر زیست پہ کمند
لیکن مقامِ دار سے گزرا وہ سربلند
ہمت جو اس کی ہمدم و دمساز ہو گئی
اک سرخمیدہ قوم سرافراز ہو گئی

ملت کے طعن و طنز سے دم بھر نہ تھا فراغ
ہر لمحہ ایک زخم تو ہر لحظہ ایک داغ
پھر بھی نہ دل تھکا نہ فسردہ ہوا دماغ
موجِ ہوائے تند سے لڑتا رہا چراغ
آندھی کبھی کبھی جو بلاخیز ہو گئی
کچھ اور بھی چراغ کی لو تیز ہو گئی

پرسانِ حال شامِ غریباں کے واسطے
دل میں عمل کا جذبۂ محکم لیے ہوئے

افسانہ گو جہانِ جبیباں کے واسطے
آنکھوں میں دردِ عشق کی شبنم لیے ہوئے

افسوں طراز، بزمِ خطیباں کے واسطے
ہمراہ، انقلاب کا عالم لیے ہوئے

سالارِ کاروانِ ادیباں کے واسطے
ہاتھوں میں انقلاب کا پرچم لیے ہوئے

یکتا علوم و فن میں یگانہ ثبات میں
جس رُخ گیا، حیات کو بیدار کر دیا

شعلہ جہاد و زیست میں شبنم صفات میں
ظلمت کدے کو مطلعِ انوار کر دیا

دانش میں اس کی جذب تھا نورِ مہِ منیر
ذوقِ نظر، لطافتِ گل سے دوچند تھا

ظلمت میں پھینکتا تھا تخیل کرن کے تیر
لہجہ نباتِ و شہد، سخن شیر و قند تھا

حسنِ سخن گلال تھا، رنگِ سخن عبیر
رُتبے میں مہر و ماہ سے بھی کچھ بلند تھا

تیشے سے کوہکن کے اُبلتی تھی جوئے شیر
لیکن عجیب مردِ حقیقت پسند تھا

فن کے نئے نقوش جو ایجاد کر گیا
دنیا نہ تھا گماں کو بڑائی یقین پر

وہ بیستونِ فکر کا فرہاد مر گیا
تاروں پہ تھی نگاہ قدم تھے زمین پر

مسند نشیں، مجاہد با لحسل شکار بھی
اس کی نوا میں غنچۂ خنداں کی نغمگی

دنیائے انقلاب کا پروردگار بھی
شامِ نشاط و صبحِ بہاراں کی نغمگی

قرآن کا مفسرِ حکمت شعار بھی
صحنِ چمن کی جوئے خراماں کی نغمگی

نقاد بھی، مصنفِ جادو نگار بھی
روحِ جنوں کے شہپرِ جنباں کی نغمگی

اتنے تضاد ادراک انساں کی ذات میں
وہ نغمگی کہ بانگِ درا جس کا نام تھا

ملتے ہیں ایسے لوگ کہاں کائنات میں
جس کی تپش سے قافلہ مستِ خرام تھا

خواجہ احمد فاروقی

مردِ آزاد

دہلی، کے ویلری لین

۲۲ فروری ۱۹۵۸ء

صدیقی۔ کیا لکھوں؟ حقیقت یہ ہے کہ اب کچھ لکھنے کو نہیں ہے۔ وہ منحوس گھڑی جس کا دھڑکا لگا ہوا تھا، بالآخر آپہنچی اور حضرت مولانا رات کے دو بجے ساری قوم کو سوگوار چھوڑ کر اپنے آقا سے جاملے۔ رنج، صدمہ، اس قسم کے سارے الفاظ کمزور معلوم ہوتے ہیں اور دیدہ و دل کی اس حالت کو بیان کرنے سے قاصر ہیں جو صبح سے اس وقت تک اُن پر گزر چکی ہے۔ کل پرسشِ حال کے لئے درِ دولت پر حاضر ہوا تھا۔ مجمع سا مجمع تھا۔ اجمل خاں صاحب ٹیلی فون لئے بیٹھے تھے۔ بلامبالغہ ہر منٹ پر گھنٹی بجتی تھی اور یہی سوال ہوتا تھا:

"اب حضرت کا مزاج کیسا ہے؟"

جواب ملتا: "وہی حال ہے۔ کوئی افاقہ نہیں۔ دعا فرمائیے۔"

جیسے جیسے وقت گزرتا گیا، گھنٹی جلد جلد بجنے لگی اور سوال و جواب مختصر ہوتے ہوتے بس یہ رہ گئے:

"حضرت کا مزاج؟"

"وہی بدستور" —— پھر خاموشی چھا گئی۔ اتھاہ خاموشی۔ لاکھوں آدمیوں کا ٹھٹ مگر سناٹا

تازہ نہیں یہ شیوۂ ابنائے روزگار
اکثر کہا گیا ہے زمانے میں گل کو خار
گم ہوگئی ہے شور میں نادی کی ہر پکار
حق گو کو دی گئی ہے سزائے صلیب و دار
"گفتا بہ صدق مایۂ آزار می شود
چوں حرفِ حق بلند شود دار می شود"

ہمت قوی، دماغ توانا، نظر بلند
منزل حسین، عزم جواں، رہگزر بلند
یوں کر گیا وطن کو بہ شانِ دگر بلند
ہندو ہے سرفراز مسلماں ہے سربلند
"نے رستم اب جہان میں نے سام رہ گیا
مردوں کا آسماں کے تلے نام رہ گیا"

"منصور حوصلوں" کو مگر کیا ہراسِ دار
ہوتے ہیں شاد دیکھ کے میدانِ کارزار
دائم کفن بدوش رہا مردِ جاں نثار
مقتل میں جب گیا تو غزل خواں و نغمہ بار
ہردم یہ دھن کہ دشت کوئی پُر خطر ملے
کم ایسے روزگار میں شوریدہ سر ملے

منزل سے آہ چھوٹ گیا ایسا راہبر
جس کی حیات آگ تھی جس کا لہو شرر
جس کے نقوشِ پا سے چراغاں تھی رہگزر
غمگیں ہیں جس کے صدمۂ ہجراں سے دشت و در
صحنِ فضائے ہند ہے اور گردِ یاس ہے
"مجنوں جو مر گیا ہے تو جنگل اداس ہے"

سچائی اور آزادی کی راہ میں مٹ جائیں، انکے لئے مرنے کے بعد بھی موت نہیں ؎

کشتگانِ خنجرِ تسلیم را — ہر زماں از غیب جانے دیگر است

قلعۂ معلیٰ کے لاہوری دروازے سے نکل کر ایک وسیع میدان پڑتا ہے۔ یاد ہے آپ کو؟ جو شمال میں چاندنی چوک تک، جنوب میں فیض بازار تک اور مغرب میں جامع مسجد تک چلا گیا ہے یہ بڑی مبارک جگہ ہے۔ شاہ جہاں سے لے کر بہادر شاہ ظفر تک تمام بادشاہوں کی سواری یہیں سے گزری ہے اس طرح کہ امراء پا پیادہ جلو میں اور شاہی مراتب کے ہاتھی ہمراہ۔ اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ حضرت شاہ کلیم اللہؒ نے یہیں بوریائے فقر پر بیٹھ کر دلوں پر حکمرانی کی ہے۔ یہیں ان کے شیدائیوں نے ان کی خاکِ پا کو سرمہ سمجھ کر آنکھوں میں لگایا ہے، یہیں ان کا مشہور مدرسہ تھا جہاں انھوں نے انسانیت کی بہترین قدروں کا درس دیا ہے یہیں مغلوں کے زمانے میں بڑے بڑے باغ، بازار، مسجدیں اور مدرسے تھے یہیں گلابی باغ اور خانم کا بازار تھا۔ انگریزوں کے تسلط کے بعد اس حصے کو کھود کے پھینک دیا گیا تھا۔ آثارِ قدیمہ سب مٹا دئے گئے۔ غالب نے لکھا ہے: شیخ کلیم اللہ جہاں آبادیؒ کا مقبرہ اجڑ گیا۔ ایک اچھے گاؤں کی آبادی تھی — اب ایک جنگل ہے اور میدان میں قبر۔

آج اسی تاریخی میدان میں، جس کے ایک طرف قلعہ کی خوبصورت عمارت ہے اور دوسری طرف جامع مسجد کے سربلند مینار، ایسا مجمع تھا کہ باید و شاید۔ ہر شخص کی یہ خواہش تھی کہ اپنے محبوب رہنما کو جی بھر کے دیکھ لے اور اسے عقیدت کا آخری نذرانہ پیش کر سکے۔ ڈیڑھ دو لاکھ آدمی ہوں گے جنھوں نے نمازِ جنازہ میں شرکت کی لیکن ماتمیوں کی تعداد اس سے کہیں زیادہ تھی۔ اس کے بعد ان کے جسمِ اطہر کو بڑے ادب اور قاعدے اور پورے فوجی اعزاز و اکرام کے ساتھ خاک کے سپرد کر دیا گیا۔

اے خاکِ تیرہ خاطرِ مہماں نگہہ دار — ایں نورِ چشمِ ماست کہ در بر کشیدۂ

سچ یہی تھی! یہ معلوم ہوتا ہے کہ ایک روشنی تھی جو گل ہو گئی۔ ماضی کو حال سے ملانے والی ایک کڑی تھی جو ٹوٹ گئی۔ علم و فضل کے صحیفہ کا ایک ورق تھا جو گم ہو گیا۔

تک کی آواز نہ تھی۔ ہر شخص کا رخ ہمٹنگ ایڈورڈ روڈ کی طرف تھا۔ سارا شہر اُمڈ پڑا تھا۔ مضافات کے لوگ ٹوٹے پڑتے تھے۔ میرٹھ اور علی گڑھ تو خیر دلی کی انگنائی ہیں وہاں سے عقیدت مندوں کا آنا تعجب خیز نہیں لیکن مدراس، بھوپال، بمبئی، حیدرآباد، کلکتہ، جے پور، سری نگر تک سے لوگ ہوائی جہازوں میں آگئے تھے۔ تا حدِ نظر آدمی ہی آدمی تھے۔ ہر شخص مغموم، ہر آدمی رنجیدہ۔

میرا جی چاہتا تھا کہ حضرت کو مہندیوں میں دفن کیا جاتا جہاں چند ایسے بزرگوں کی آرام گاہ ہے جن کا زمانہ میں جواب نہیں: حضرت شاہ ولی اللہ رح، حضرت شاہ عبدالقادر رح، حضرت شاہ عبدالرحیم حضرت شاہ عبدالعزیز رح، حضرت شاہ رفیع الدین رح، حضرت شاہ محمد اسحاق رح۔ لیکن فیصلہ یہ تھا کہ ان کو لال قلعہ اور جامع مسجد کے درمیان کے میدان میں دفن کیا جائے۔ سب سے الگ خاص الخاص جگہ — یہ فیصلہ سب سے ہی مناسب ہے اس لئے کہ مولانا منفرد لوگوں میں سے تھے۔ با ہمہ و بے ہمہ۔ فکر و نظر کی عام راہوں میں وہ کبھی وقت کے معمولی قافلوں کا ساتھ نہ دے سکے۔ ان کی نظر کا پیمانہ ہر جگہ بلند اور نظر کا معیار ہر جگہ ارجمند ہی رہا۔ زندگی بھی لائق رشک اور موت بھی لائق رشک

شدیم خاک ولیکن بوئے تربتِ ما　　　　توان شناخت کزیں خاک مردمی خیزد

اُن کی زندگی وفاداری و استواری کا کامل نمونہ تھی، پر افشانی نور کی عجیب و غریب مثال۔ ان کا مقصد بلند تھا، اس لئے وفا کا درجہ بھی بلند تھا اور وفاداری بھی ایسی وفاداری جیسے قبلہ نما کی سوئی قبلہ کی سمت ہوا کرتی ہے۔ اسی راستے میں کس کس طرح کی ذہنیتیں برداشت کیں کیسی کیسی تکلیفیں اُٹھائیں، کیا کیا سختیاں جھیلیں، نہ پوچھئے

گردنم ناک ہے اب تک بھی بیابانوں کی

وہ واقعی بے پناہ تھے۔ قطرہ کو گہر بننے تک بہت سی منزلیں طے کرنا پڑتی ہیں لیکن موتی بننے کے بعد وہ بے پناہ ہو جاتا ہے اس کو کوئی خطرہ نہیں رہتا۔ دریا کا طوفان اسے منتشر نہیں کر سکتا اس سے برابر نور کی ہریں نکلتی رہتی ہیں اور میں تو کہوں گا کہ مرنے کے بعد بھی اس کی نور افشانی جاری رہتی ہے۔ وہ ہستیاں جو اپنے آپ کو ایک بڑے مقصد کے لئے تج دیں، جو

وہ اک نگہ کہ بظاہر نگاہ سے کم ہے

انھوں نے بساطِ دلبری پر ادائے لطف کو عام نہیں کیا، لیکن آخر آپ ایک مصنف سے یہ کیوں توقع رکھیں کہ وہ اپنی خلوت کے سب زاویے آپ کو دکھلا دے۔ کوئی شخص اپنے متعلق پوری سچائی بیان بھی تو نہیں کرسکتا اور اگر بیان بھی کردے تو بقول ایلیٹ اس کی تاب کون لاسکتا ہے؟ کب روسو نے پوری سچائی بیان کی ہے سامرسٹ ماہم تو یہاں تک کہتا ہے کہ "اعترافات" بیں بھی اس کی تصویر ناقص ہی ہے!

مولانا نے یہ خطوط احتیاط کی چھلنی میں چھانے ہیں "سراین شیشہ فرو بند" پر زور دیا ہے اور وہ بلاشبہ بڑے خاص حالات میں لکھے ہیں۔

خواہم از بندِ بہ زنداں سخن آغاز کنم　　غم دل پردہ دری کرد فغاں ساز کنم

بہ نوائے کہ زمضراب چکاند خوناب　　خویشتن را بہ سخن زمزمہ پرداز کنم

پھر بھی جا بجا التفات و تغافل کی عشوہ گری ہے اور کیا وہ بذاتِ خود دلچسپ نہیں ہے؟ مولانا نے ذوقِ حضوری کے لئے بات میں بات پیدا کی ہے اور دل کی گرمی سے محفل کی شمع کو روشن کیا ہے۔ انھوں نے پیغامِ حیات ہی کو ہلکا نہیں کیا ہمارے احساس میں بھی پاکیزگی پیدا کی اور زندگی کے احترام کے نئے دروازے کھولے۔ وہ اپنے لمحات کو جاوداں بنانے کا سلیقہ رکھتے ہیں اور من و تو کی دنیا سے نکل کر بےکراں فضا میں پہنچ سکتے ہیں اور یہی ادبِ عالیہ کی شرطِ اول ہے۔

غبارِ خاطر کو پڑھ کر وادیٔ کشمیر کے ایک نرم رو جوئبار کا احساس ہوتا ہے جس کے دونوں طرف سفید ارکے سیدھے سیدھے اور خوش نما درخت ہوں، لیکن الہلال اور البلاغ کی تحریریں اس تند رو دریا کی یاد دلاتی ہیں جو پہاڑوں کو چیرتا، کاٹتا اور میدانوں کو طے کرتا موج در موج سمندر میں گرتا ہے King James کی بائبل کی طرح لوگوں نے الہلال اور البلاغ کی تحریروں کو بار بار پڑھا اور اس کی نثر پہ سر دھنا۔ یہ ٹھیٹ مشرقی نثر ہے جس میں عربوں کی سی خطیبانہ بلند آہنگی اور ہندوستانیوں اور ایرانیوں کی سی مرصع کاری ہم آہنگ ہوگئی

أرأيتَ من حملوا على الأعواد　　أرأيتَ كيف خبا ضياء النادی

[کیا (تم) نے دیکھا کہ لوگ کس کو تابوت میں اُٹھا کر لے گئے اور ہاں کیا (تم) نے دیکھا کہ ہماری محفل کی روشنی کیسی گُل ہو گئی]

اس وقت عجیب عالم ہے "دل تا جگر کہ ساحلِ دریائے خوں ہے اب" جو صحبتیں ان کے ساتھ گزریں وہ سب ایک ایک کر کے چشمِ باطن کے سامنے آ گئی ہیں جذبات کی پوری شدّت اور حشر سامانیوں کے ساتھ۔ لیکن بیان کی ہمّت کسے ہے اور ہو بھی تو ــ بپایاں کہ رساند؟ ایک مرتبہ حضرت نے فرمایا:

"احمدؐ صاحب (مولانا ہمیشہ احمدؐ صاحب کہہ کر پکارتے تھے) آپ کا وطن کہاں ہے"؟ میں نے عرض کیا "کھچپراؤں"۔ ذرا حیرت سے "کچھراؤں! کچھراؤں تو میرے بھائی ہم بھی گئے ہیں ــــ خواجہ غلام الثقلین ساتھ تھے۔ اس زمانہ میں انگریزی تمدّن کا نفوذ قصبات تک کہاں ہُوا تھا ـ وہاں ایک صاحب نے جو علی گڑھ سے غیر معمولی طور پر متاثر تھے ہمارے اعزاز میں امروہہ سے (جو اس کے قریب واقع ہے) Menu چھپوا کر منگوائے تھے اور کھانے کی میز پر رکھے تھے !! (ذرا سکوت کے بعد) اور آپ اپنے ہم وطن زبدة الموحدین مفتی محمد نور اللہ کی تصانیف سے بھی واقف ہیں؟"

مجھے حضرت مولانا کی پابوسی کا شرف پہلی دفعہ ۱۹۴۶ء میں ہُوا جب وہ احمد نگر جیل سے رہا ہو چکے تھے اور "غبارِ خاطر" نئی نئی چھپی تھی۔ کاظمی صاحب قبلہ ساتھ تھے وہ مچل گئے کہ "یاسمن سفید" پئیں گے لیکن وہ ختم ہو چکی تھی۔ چناں چہ ڈبہ کو جھاڑ کے بنائی گئی اور سب کو بطور تبرک اس دردِ تہِ جام کا ایک ایک فنجان پیش کیا گیا۔ میں نے غبارِ خاطر کا ذکر چھیڑنا چاہا تو فرمایا۔" وہ تو غبارِ خاطر ہی ہے اور بس"۔

'غبارِ خاطر' کے متعلق "آپ کے نیم صاحب ہمیشہ یہ بھول جاتے ہیں کہ وہ دار و رسن کی آزمائش میں لکھی گئی ہے اور اس امتحان کی بعض منزلیں "غزل خواں" ہی طے کی جا سکتی ہیں۔ غبارِ خاطر کا انداز کچھ اس طرح کا ہے،

کے جڑاؤ اور سچے موتیوں کے گہنے"۔ لیکن مولانا آزاد کے یہاں یہ بھاری مصالحہ بے وجہ صرف نہیں ہوا۔ اس کے پیچھے ایک اعلیٰ سیاسی مقصد تھا جس نے تاریخ کا رُخ بدل دیا۔ اگر یہ سلمہ ستارے کا کام یوں ہی دکھلاوے کے لئے ہوتا تو اردو کی پرکار اُلٹی گھوم جاتی لیکن اس کے ساتھ اچھی قدریں وابستہ تھیں اس لئے یہ نثر بھی آگے بڑھی اور اس کے ذریعہ ہماری زندگی بھی — اس روشنی میں دیکھا جائے تو آزاد اپنے طرز کے موجد بھی ہیں اور خاتم بھی۔ نہ وہ جانشین ہیں نہ ان کا کوئی جانشین ہے۔ وہ اس قدر دل کش کے ساتھ گلزار میں داخل ہوئے کہ سرو شمشاد شرما گئے۔ وہ جہاں ہیں تنہا ہیں۔

مولانا کی عظمت میں شبہ نہیں۔ لیکن جو چیز مجھے رہ رہ کر یاد آتی ہے وہ ان کی شخصیت کا حسنِ تناسب اور اس کی دل کش ہمواری ہے۔ بعض لوگوں کے یہاں بڑی افراط و تفریط ہوتی ہے۔ آں جہانی تصور میں گم ہوئے تو پھر کسی بات کی خبر نہیں اور دنیا کی طرف توجہ کی تو بس اسی کے ہو گئے۔ Pascal کو حیرت تھی کہ لوگ عاقبت سے بے خبر ہو کر کیسے شاہد شعر یا سے و رامش و رنگ میں محو ہو جاتے ہیں

(They) Dance and Play the Lute and sing and make verses

ڈی ایچ لارنس کہتا ہے لوگوں کو گردو پیش کی مسرتوں اور مشکلوں سے آخر کس طرح فرصت مل جاتی ہے کہ وہ ماورائی مسائل پر وقت ضائع کر سکیں۔ لیکن مولانا کے وسیع تخیل میں ان دونوں کے لئے گنجائش تھی اور بڑے صحیح تناسب کے ساتھ انھوں نے اسلام اور ہندستانی تہذیب سے وہ سب کچھ لیا تھا جو انھیں لینا چاہیئے تھا۔ حد یہ ہے کہ انھوں نے انسانیت اور وطن داری دونوں کی ایک مشترک اساس بھی تلاش کر لی تھی۔ ایک مرتبہ "انسانم آرزوست" کے سلسلہ میں ایک چینی مقولہ پیش کرنے لگے کہ اگر تمھیں ایک سال کا انتظام کرنا ہے تو گیہوں بوؤ، اگر دس سال کا تو درخت بوؤ اور اگر نسلوں کا بندوبست کرنا ہے تو انسان بوؤ۔ ان کے یہاں سارا زور انسان اور انسانیت ہی پر ہے، قدیم تمدن کی گہرائی اور پختگی پر ہے۔ لیکن اس میں جدید کی بیداری اور اس کا احساس و شعور بھی شامل ہے۔ انھوں نے اپنے اعجازِ عمل

ہے۔ اس نثر میں اس دور کی سیاست کے تمام تیور موجود ہیں۔ فقروں میں مسلح اور خوش ترتیب فوج کا سا جلال اور شکوہ ہے۔ الفاظ میں نقارہ و دہل کا سا شور و ہنگامہ ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ الفاظ نہیں خون کے قطرے ہیں اور ہر قطرہ پر کاوشِ مژگان کے ظلم و ستم کی مہریں ہیں۔ مولانا نے لکھنا ایسے سیکھا تھا جیسے مچھلی تیرنا سیکھتی ہے۔ انشا کے قواعد ان کے ضمیر میں اس طرح جاگزیں تھے جیسے فولاد میں جوہر۔ لیکن اگر تاریخ وار ان تحریروں کو پڑھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ ان کے انداز و اسلوب کا بڑا ہموار ارتقا ہوا ہے۔ یہ شان دار اور پرشکوہ نثر الہلال اور البلاغ تک رہی جو صحافت سہی لیکن اس نے تخلیقی سرحدوں کو چھو لیا ہے۔ غبارِ خاطر اور کاروانِ خیال کا اسلوب دوسرے مؤثراتِ خارجی کا نتیجہ ہے۔ اسی لئے اس میں ادب کی جو گل کاریاں ہیں وہ سب سے الگ ہیں۔ خطبات میں آتش خانوں کی سی گرمی ہے اور یونانی اور عربی اصولوں کی پوری پابندی، جو انھوں نے منبر پہ نہیں دار پہ برتی ہے لیکن ترجمان القرآن کے مقدمے میں جو سادگی اور پرکاری ہے اس کا اردو میں جواب نہیں۔ یہ معلوم ہوتا ہے کہ کوثر و سلسبیل کی موجیں ہیں جو بہہ نکلی ہیں۔

مجھے بی بی سی کی وہ بحث یاد ہے جب آپ نے نثر کا سخن گسترانہ ذکر چھیڑ دیا تھا۔ درحقیقت ہماری نثر ایک بچے کی طرح ہے جو نیا نیا چلنا سیکھ رہا ہو۔ وہ کئی دفعہ اپنے پیروں پر کھڑی ہوئی اور کئی دفعہ گری ہے۔ نظم کے برابر اس نے مدارج طے نہیں کئے۔ غالب نے محمد شاہی روشوں کو ترک کیا اور اس کے اصلی جوہر کو چمکایا لیکن رجب علی بیگ سرور نے آئینہ خانہ میں رنگینیاں قید کیں۔ وہ "بے ناپ تول" لکھنے کے قائل ہی نہ تھے۔ ان کی انشاء فارسی کے حسنِ مستعار سے چمکی۔ ایسا نظر سوز حسن جس میں اس کے اصلی خط و خال ہی چھپ گئے۔ حالی کے یہاں آب و رنگ غیر ضروری تھا اسی لئے لات کا غازہ اور نرگسی آنکھوں کا سرمہ بڑے اہتمام سے دھو ڈالا گیا۔ لیکن مولانا ابوالکلام آزاد نے پھر ادبی مرصع کاری کا آغاز کیا۔ یہ اسی قسم کی کوشش تھی جیسی (بلا تشبیہ) ڈرائیڈن کے زمانے میں کارلائل اور ڈی کوئنسی نے کی تھی۔ یہ گویا خوشیہ باجی کی زبان میں بھاری بھاری" تلوان اور ٹکن کے جوڑے ہیں یا سونے

اعجاز صدیقی

تیرے بعد!

به یادِ ابوالکلام آزادؒ

تھا عجب سلسلۂ لطف و عنایت تجھ سے — تلخیوں کو بھی ملا رنگِ حلاوت تجھ سے
کسی دلدار نے کی جب بھی شکایت تجھ سے — مل گئی چہرۂ افسردہ کو رنگت تجھ سے
پائی اک لذتِ بے حرف حکایت تجھ سے — لے کہ باقی تھی تب و تابِ محبت تجھ سے

"شعلۂ عشق سیہ پوش ہوا" تیرے بعد

وضعداری وہ تری، وہ تری گفتار کا ڈھنگ — وہ خموشی تری اور وہ لبِ اظہار کا ڈھنگ
بھولا ہی وہ تری، وہ تری رفتار کا ڈھنگ — خلوتِ شب میں وہ تیرے دلِ بیدار کا ڈھنگ
صبح کے کیف میں وہ ذکرِ فسوں کار کا ڈھنگ — "چائے" کے بھاپ سے اٹھتے ہوئے اسرار کا ڈھنگ

"ہوئی معزولیِ انداز و ادا" تیرے بعد

جیسے یکبارگی خضرِ رہِ منزل کھو جائے — کوئی زحمت کشِ ہر جادۂ مشکل کھو جائے
جیسے محفل ہو، مگر صاحبِ محفل کھو جائے — بھیڑ میں جلووں کی تابِ نگہِ دل کھو جائے
شبِ تاریک میں جیسے مہِ کامل کھو جائے — سخت طوفان ہو اور دامنِ ساحل کھو جائے

راستہ بھول گئے راہنما تیرے بعد

سے تاریخ کی تخلیقی رَو کو موڑ دیا اور ہمیں وہ قدریں دیں جن کی روشنی میں چل کر ہم حیات کے مراتب عالیہ پر فائز ہو سکتے ہیں :

گوئید پس از ہزار سال از عالم
روشن جانے ز آسمان زیر آید

خاقانی ازاں جنس درین دہر مجو
بر رہ منشیں کہ کارواں دیر آید

آپ کا

خواجہ احمد فاروقی

حاصلِ گزارش

"..... ہم کو اپنے سفر میں نکلے ہوئے دو سال ہو گئے۔ ہمارا سفر تاریکی میں نہ تھا بلکہ دوپہر کی روشنی میں تھا اور دنیا اُسے دیکھ رہی تھی۔ ہم اگر حرکت میں رہے ہیں تو اس پر پردہ نہیں پڑا ہے۔ اور اگر جمود و غفلت میں کھڑے کے کھڑے رہ گئے ہیں تو وہ بھی کوئی راز نہیں ہے۔ اگر اپنے سفر کا کچھ حصہ طے کر سکے ہیں تو دیکھنے والے اس کی شہادت دے سکتے ہیں۔ اور اگر راہ کی دشواریوں سے واماندہ رہ گئے ہیں تو ہمت کا ترِ منزل اور قدم کی لغزش بھی بر سرِ بازار ہے۔ متاع بالکل نئی تھی اور اپنے سفر کے لئے خود ہی ایک نئی راہ نکالی گئی تھی۔ نہ تو ہمارے سامنے نمونہ تھا اور نہ کوئی رہنمائی کی مادی روشنی۔

بے نخشک رفت و دامنِ پرہیز تر نہ کرد
زاں چشمۂ کہ خضر و سکندر وضو کنند

قوموں اور جماعتوں میں انقلاب و تغیر کی دعوتوں کے نفاذ کا کام ایک ایسا دشوار گذار سفر ہے کہ اگر قوموں کی بادیہ پیمائی اور تگ و دو کے بعد سلامتی کا ایک قدم بھی طے ہو جاتا ہے تو اس کی کامیابی رشک انگیز اور اس کی فتح مندی جشن و نشاط کی مستحق ہوتی ہے۔ ایک ٹوٹی ہوئی دیوار کو گرا کر نئی دیوار کے بنانے کے لئے کس قدر سامان اور وقت مطلوب ہوتا ہے۔ پھر ان لوگوں کے لئے تو وقت کا کوئی سوال ہی نہ ہونا چاہیئے جو معتقدات و اعمال کی ایک پوری آبادی کو بدل دینا چاہتے ہوں اور صرف کسی دیوار اور محراب ہی کو نہیں بلکہ شہر کی تمام عمارتوں کو از سرِ نو بنانے کے آرزو مند ہوں ....." (الہلال جون ۱۹۱۴ء)

یوں تو دیکھے گئے شامل ترے ماتم میں سبھی
چند دن کا تھا مگر مشغلۂ جامہ دری

اب نہ وہ آہوں کی شدت ہے، نہ وہ نوحہ گری
قوم نے ہائے تری موت کی وہ قدر نہ کی!

تیرے اخلاص کی دینے کی طرح داد نہ دی
"غم سے مرتا ہوں کہ اتنا نہیں دنیا میں کوئی"

"کہ کرے تعزیتِ مہر و وفا" تیرے بعد

حل کیا وقت کا پیچیدہ سے پیچیدہ سوال
حدِ امکاں کے قریب آ گیا ہر امرِ محال

فیصلوں کو ترے ٹھکرائے یہ تھی کس کی مجال
سب نے تجویزوں کو مانا تری بے قیل و قال

اللہ اللہ تری فکر کا وہ اَوج و کمال
جنھیں گمراہیِ منزل سے ہو بچنے کا خیال

چُوم لیں وہ ترا نقشِ کفِ پا تیرے بعد

ہمہ دانوں میں مسلّم ہمہ دانی تیری
بھول سکتا نہیں دل، سحر بیانی تیری

اے کہ تحریر ہر اک گنجِ معانی تیری
اے کہ تصنیف نہیں کوئی بھی فانی تیری

بے نشانی سے بھی پیدا ہے نشانی تیری
وقت دُہرائے گا تا حشر کہانی تیری

تذکرہ ہوگا بہر حال ترا تیرے بعد

تیرا کردار مثالی وطنیّت کے لئے!
تو نے نفرت کے سہے وار محبّت کے لئے!

تو شریعت کے لئے تھا کہ امامت کے لئے؟
تو قیادت کے لئے تھا کہ سیاست کے لئے؟

یہ سمجھنا ہے کٹھن چشمِ عقیدت کے لئے!
تیرا ہونا تھا کسی سخت ضرورت کے لئے؟

راز قوم اور وطن پر یہ کھُلا تیرے بعد

یہ وطن، تیرا وطن، میرا وطن، سب کا وطن
یہ چمن، تیرا چمن، میرا چمن، سب کا چمن

یہ ہمالہ کی زمیں، رقص گہِ گنگ و جمن
منبعِ علم و ادب، مرکزِ تہذیب و فن

جس میں پیوست تری فکر، مرا سوزِ سخن
ٹانکنے والا ہے تاروں کو سرِ پیراہن

پوچھ مجھ سے اگر یہ ہو جائے گا کیا، تیرے بعد

موم ہو کر تری مٹھی میں رہا آہنِ وقت
ایک بھی گردنِ مینا ہو کہ ہو گردنِ وقت

مستیِ رہبراں جب بھی بنی رہزنِ وقت
ہوشیاری نے سنبھالا تری اک توسنِ وقت

تو کہ تھامے کدۂ وقت میں تردامنِ وقت
"کون ہوتا ہے حریفِ مئے مرد افگنِ" وقت

"ہے مکرر لبِ ساقی پہ صلا" تیرے بعد

تیرے خاموش تدبر کے اشارات کہاں
سب میں وہ قوتِ تجزیۂ حالات کہاں

تھا یہ معلوم تجھی کو کہ کٹھن رات کہاں
دن کے اجیاروں سے کھا جاتی ہے خود مات کہاں

ختم ہو سکتی ہے ہر شورشِ آفات کہاں
بن کے خورشید چمک سکتے ہیں ذرات کہاں

سرد آتش کدۂ فکر ہوا تیرے بعد

گو ترے طرزِ تکلم کا وہ جادو نہ رہا
نگراں اب وہ ترا دیدۂ ہر سو نہ رہا

نفسِ گرم سے پھیلائے جو خوشبو نہ رہا
پھول بن جانے کے قابل کوئی آنسو نہ رہا

دل کی تسکین کا باقی کوئی پہلو نہ رہا
وہی ہنگامۂ محفل ہے مگر تو نہ رہا

"بارے آرام سے ہیں اہلِ جفا" تیرے بعد

ہیں غلط سمت خیالات کے دھارے اب بھی
ضد پہ ہیں کہنہ روایات کے مارے اب بھی

ہیں پسِ پردۂ انفاس شرارے اب بھی
آندھیاں دیتی ہیں شعلوں کو سہارے اب بھی

شر پہ آمادہ ہیں کچھ لوگ ہمارے اب بھی
ہیں وہی برقِ سیاست کے نظارے اب بھی

"کس کے گھر جائے گا سیلابِ بلا" تیرے بعد

لوگ کہتے تھے ترا خلوتیِ راز جنھیں
اور تو نے ہی دیا شعلۂ آواز جنھیں

سوز دیتی رہی تیری نگہِ ناز جنھیں
تو نے بخشی تھی نئی قوتِ پرواز جنھیں

وہ کہ تھا ہوش ربا تیرا ہر انداز جنھیں
تھا ترے رنگِ طبیعت سے بڑا ساز جنھیں

"ان کے ناخن ہوئے محتاجِ حنا" تیرے بعد

بہت رکھ رکھاؤ والی بیوی تھیں۔ مگر ادھر تو بیگم آزاد کی پاکیزہ صورت، دل نشین اداؤں نے ان کو کھینچا اُدھر وہ بھی شرمیلی اور کم آمیز ہونے کے باوجود کچھ ایسی گھل مل گئیں کہ بلا ناغہ ایک ہفتہ یہ وہاں جاتیں دوسرے ہفتہ وہ یہاں آتیں۔ اُن میں وہ تمام خوبیاں تھیں جو ایک اچھی خاتون میں ہونی ضروری ہیں۔

وہ سلیقہ شعار بھی تھیں اور خانہ داری کے امور سے بھی واقف۔ مہمان نواز بھی تھیں اور ہنس مکھ شیریں زبان بھی۔ سسرال والوں پر بھی جان چھڑکتی تھیں اور شوہر پر بھی فدا تھیں چوں کہ آپس میں کافی بے تکلفی تھی اس لئے نند بھاوج کے رشتے کو لے کر دونوں میں مذاق بھی ہوتا تھا۔

ایک مرتبہ صبح دس بجے کے بعد یہ ان کے یہاں پہنچیں تو خلاف عادت اس دن وہ پندرہ منٹ بعد مسکراتی ہوئی آئیں اور معانقہ کرکے کہا۔ "معاف کیجئیگا بھئی! آپ کو اتنی دیر میرا انتظار کرنا پڑا۔ میں مولانا کو کھانا کھلا رہی تھی۔ وہ بہت تھوڑا اور سادہ کھانا کھاتے ہیں۔ دو چمچے اُبلے ہوئے چاول، تھوڑی دال، سبزی یا گوشت اور دہی۔ چونکہ صبح بہت سویرے اُٹھ جاتے ہیں اس لئے دوپہر کے کھانے کے بعد بارہ بجے سے بھی پہلے لیٹ جاتے ہیں۔ پھر دو بجے غسل کرکے نماز پڑھتے ہیں۔ اس کے بعد کاموں کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے اور ملنے والوں کا تانتا رات گئے تک لگا رہتا ہے۔"

بیگم آزاد کے بکھرے بالوں کی طرف اشارہ کرکے یہ بولیں۔ مگر "بھاوج معلوم ہوتا ہے ہمارے بھائی کو آپ کی یہ زلفِ پریشاں بہت پسند ہے جو آپ سر نہیں گوندھتیں۔"

وہ جس انداز سے لجا کر بولیں۔ "لے نہیں نہیں یہ بات نہیں۔ ان کے بار بار جیل جانے سے میری طبیعت کچھ ایسی خفقانی ہو گئی ہے کہ چوٹی گوندھنے سے دل گھبراتا ہے۔" وہ اندازِ حجاب آج بھی مجھے یاد ہے کیسی با حیا بیوی تھیں اور کیا زمانہ تھا کہ شوہر کا ذکر کرتے بھی شرماتی تھیں۔

یہ اس دن ان پر تنقید کرنے کی ٹھان کر گئی تھیں۔ پھر اُن کی خالی کلائیوں کی طرف اشارہ کرکے کہا "لے توبہ! ایسی بھی کیا سادگی، وہم نہیں آتا۔ اللہ تمہارا سہاگ قائم رکھے ایک ایک چوڑی

حمیدہ سلطان

زلیخا بیگم

نرگسی آنکھیں، دراز پلکیں، جٹی بھوئیں، پگھلے ہوئے سونے کا سا رنگ، بیضوی چہرہ یاقوتی لب، ساون کی گھٹاؤں کے مانند کالے لانبے بال، بوٹا سا قد، مائل بہ گداز دلآویز جسم، سفید کالی کنی کی سوتی باریک ساری بے پروائی سے لپیٹے مشرقی حیا آمیز اداؤں کا قافلہ اپنے جلو میں لئے میں نے اسی دنیا کی حور کو دیکھا ہے۔ یہ پاکیزہ ہستی حضرت یوسف والی زلیخا نہیں "یوسف ہندی" حضرت مولانا ابوالکلام آزاد کی رفیقۂ حیات زلیخا بیگم تھیں۔

میری عمر سات یا آٹھ سال کی تھی دلّی میں ایک زنانہ کانفرنس منعقد ہوئی اس کی صدارت بیگم صاحبہ بھوپال سلطان جہاں بیگم نے کی۔ ان کے ہمراہ مولانا آزاد کی دونوں بہنیں آبرو بیگم صاحبہ اور فاطمہ بیگم صاحبہ بھی تشریف لائیں۔ ان دونوں کے علم و فضل اور ادیبانہ خطبوں کی دھاک پڑھی لکھی خواتین پر بیٹھی ہوئی تھی۔ چوں کہ والدہ صاحبہ اس کانفرنس کی استقبالیہ کمیٹی کی ایک رُکن تھیں اسی لئے ان کی میزبانی کا شرف ہمارے گھر کو ملا۔ اس طرح دوستی کی بنیاد پڑی۔ پھر یہ مراسم دن بدن بڑھتے گئے۔ ۱۹۳۲ء میں آبا جان کی وفات کے بعد تین سال ہمارا کلکتہ رہنا ہوا تو تعلقات بالکل عزیزانہ ہوگئے۔ یہ دونوں اپنے مکرم بھائی سے ملنے بھوپال سے آئیں تو ہمارے یہاں بھی آئیں۔ پھر اپنی چہیتی بھاوج بیگم زلیخا آزاد سے والدہ صاحبہ کو ملوایا۔ مولانا آزاد اس زمانے میں بالی گنج کی ایک شاندار دو منزلہ کوٹھی میں رہتے تھے۔ والدہ مرحومہ پر اس زمانے کی

تم کو ملوا دوں"۔ انھوں نے ایک خاص انداز سے کہا اور میرا ہاتھ پکڑ کر لے گئیں۔ میں ڈرتی جھجکتی مولانا کی خدمت میں حاضر ہوئی۔ انھوں نے میرا تعارف کرایا۔ مولانا صاحب نے مسکراتے ہوئے مہربانی کے لہجے میں فرمایا۔ "آؤ بھئی جو کتاب چاہو لے لو۔" اور میں بُت بنی کچھ دیر اس عظیم انسان کو دیکھتی رہی جو دنیائے علم و ادب، خطابت، مذہب و سیاست کا خورشید تاباں تھا۔ مولانا علیہ الرحمۃ کی عظمت کا نقش میرے دل کے سادہ ورق پر اسی دن بیٹھا۔ پھر عمر کے ساتھ میری عقیدت میں اضافہ ہوتا گیا۔

ایک دن صبح جو ہم پہنچے تو بیگم آزاد کی نرگسی آنکھوں میں سرخ ڈورے دیکھ کر والدہ نے ان سے مسکرا کر کہا "کیا رتجگا کیا ہے بھاوج؟ آنکھیں گلابی ہو رہی ہیں۔"

وہ ہنس کر بولیں "آپ کی تو عادت ہے ہی بننے کی۔ آج کل مولانا قرآن پاک کی تفسیر لکھ رہے ہیں۔ رات کو دو بجے کے بعد اٹھ بیٹھتے ہیں۔ جتنی دیر وہ لکھتے ہیں۔ میں پنکھا جھلتی ہوں موسم بہت گرم ہے۔ باہر بھی حبس ہی رہتا ہے۔ بھلا یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ وہ جاگیں، محنت کریں اور میں آرام سے سوتی رہوں۔"

یہی تھا اس نیک بی بی کا وہ جذبۂ رفاقت جس کو یاد کر کے مرنے والی کے غم میں مولانا پر احمد نگر قلعہ میں ایک پُرانی قبر کو دیکھ کر رقّت طاری ہو جاتی تھی۔

بڑے آدمیوں کے سوانح حیات جب لکھے جاتے ہیں تو اکثر ان کی خانگی زندگی کو نظرانداز کر دیا جاتا ہے حالانکہ یہ بہت ضروری ہے کہ ہم اپنے مشاہیر کے متعلق یہ جانیں کہ ان لوگوں کے گھریلو حالات کیا تھے اور اپنی بیوی سے ان کا برتاؤ کیسا تھا۔

مولانا آزاد کی شادی زلیخا بیگم سے ہوئی تو وہ بارہ سال کے معصوم لڑکے تھے اور زلیخا بیگم چھ سال کی ننھی منی بچی تھیں۔ ان کے والد آفتاب الدین صاحب بغداد کے ایک شریف خاندان کے چشم و چراغ تھے ان کا سلسلۂ نسب حضرت صدیق اکبرؓ سے جا کر ملتا تھا۔ آفتاب الدین صاحب مولانا کے والد بزرگوار کے خاص مریدوں میں سے تھے۔ زلیخا بیگم ان کی پانچویں صاحبزادی تھیں۔ ان کے پیدا ہوتے ہی انھوں نے پیر کے قدموں میں لا کر ڈال دیا۔ انھوں نے بہت محبت

ہاتھوں میں ڈال لیا کرو۔"

اُنھوں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "آخر ہیں نا آپ بھی نند، بالکل سسرال والوں کی طرح طعنے دے رہی ہیں۔ اچھا آیندہ میں آپ کی خوشی کا خیال رکھوں گی۔" دوسرے ہفتے جو وہ ملنے آئیں تو پشت پر چوٹی لہرا رہی تھی چکن کا خوبصورت بیل لگا بلاؤز پہنے تھیں اور ہلکی دھانی ریشمی ساری زیب تن تھی۔ ہاتھوں میں سونے کی دو دو چوڑیاں تھیں۔ کانوں میں بُندے۔ اچھے لباس اور ہلکی سی آرائش نے ان کی من موہنی صورت کو اور بھی دل رُبا کر دیا تھا۔ یہ ان کو گلے لگا کر مسرور لہجے میں بولیں: "اے ہے کہیں بُری نظر نہ لگ جائے آج تو ماشا اللہ چشم بددور بہت اچھی لگ رہی ہو۔" وہ حسب عادت لجا کر بولیں۔ "آپ کو خوش کرنا تھا۔ ورنہ مجھے تو اب رنگین کپڑے اور زیور پہنتے شرم آتی ہے"۔ "اے ہے لو اور سنو حد کر دی تم نے بھی۔ ابھی تمھاری عمر کون سی ایسی ہے سہاگنیں تو بڑھاپے میں بھی رنگا پیلا پہنتی ہیں" اُنھوں نے کہا۔

مجھے ہر بار کتابوں کا لالچ جانے پر مجبور کرتا۔ مولانا صاحب کی لائبریری اوپر زنانے ہی میں تھی۔ میں جاتے ہی لائبریری میں گھس جاتی اور کتابیں وہاں سے لاتی پھر ان کو پڑھ کر رکھ دیتی اور لے آتی۔ میرے ذوق کی تسکین کا سامان فراوانی سے ملتا۔ کوئی روک ٹوک نہ تھی۔ اسی لائبریری میں ہی پہلی مرتبہ میں نے مولانا کی زیارت کی۔

اوائل گرمی کی ایک شام تھی۔ وہ دونوں بیویاں باتوں میں لگیں۔ میں حسب معمول لائبریری میں پہنچ گئی۔ ایک سُرخ و سفید رنگ کا تیکھے خط و خال والا انسان سفید کرتے پیجامے میں ننگے سر کتابوں کے اردگرد ڈھیر لگائے مطالعہ میں ایسا مصروف تھا کہ میں قریب پہنچ گئی اُسے کو خبر نہیں ہوئی۔ وہ اسی طرح سر جھکائے پڑھتا رہا۔ میں اُلٹے قدموں واپس ہوئی تو وہ محبت بھرے لہجے میں بولیں۔ "کیوں کتابیں نہیں ہیں؟" میں نے کہا "غالباً آج لائبریری میں مولانا صاحب تشریف رکھتے ہیں اسی لئے واپس آ گئی۔"

"ارے ہاں وہی ہوں گے آج کل ان کو ذرا فرصت ہے۔ اکثر شام کو ملنے والوں سے بچ کر لائبریری میں بیٹھ کر پڑھتے ہیں۔ لیکن تمھارے تو ماموں ہیں۔ تم میرے ساتھ چلو میں ان سے

زندگی اچھی نہیں گزری۔ زلیخا بیگم کی وفات کے بعد انھوں نے جو خط صدر یار جنگ کو لکھا ہے اس سے ان کے بے اندازہ غم کا اظہار ہوتا ہے۔

جب ۱۹۴۲ء میں مولانا کو اور تمام لیڈروں کے ساتھ احمد نگر قلعہ میں نظر بند کیا گیا زلیخا بیگم کی طبیعت کافی خراب تھی۔ ان دنوں برٹش گورنمنٹ کا رویہ سخت ہو رہا تھا اور صورت حال بہت تشویش ناک ہو رہی تھی۔ کسی کو معلوم نہ تھا کہ ان لوگوں کو کہاں رکھا گیا ہے۔ تمام ہندوستان میں سیاسی نظر بندوں کے متعلق متضاد افواہیں مشہور ہو رہی تھیں اور یہ بھانت بھانت کی بولیاں ستم رسیدہ فرقت کی ماری بیگم آزاد کے دل پر تیر و نشتر کا کام کرتی تھیں۔ اپنے چہیتے شوہر کے متعلق ہر نئی خبر سن کر وہ تڑپ کر رہ جاتیں۔ ان کو بس دن رات مولانا کی سلامتی کی دعائیں مانگنے اور رونے کے سوا کچھ یاد نہ رہا تھا۔ دوا انھوں نے بالکل چھوڑ دی تھی۔ غذا بھی برائے نام تھی۔ دق کا نامراد مرض دو سال سے پیچھا کئے ہوئے تھا۔ اب کمزور جسم پر اس نے بالکل تسلط جما لیا۔ ڈاکٹر بی، سی رائے اور کلکتہ کے مشہور ڈاکٹروں نے ان کو دیکھا مگر مرض کو افاقہ کیسے ہوتا جب کہ نہ دوا تھی نہ غذا۔ وہ ہر ایک معالج سے یہی کہتی تھیں۔ ”بس خدا کے لئے مجھے ایک مرتبہ مولانا کو دکھا دو۔“ اُن کی حالت دیکھ کر اور التجا سن کر آنکھوں میں آنسو بھرے ہر ڈاکٹر چارپائی سے اُٹھتا تھا۔ آخر بقول مولانا صاحب کے ۱۹۔ اپریل ۱۹۴۳ء کو زہر غم کا پیالہ لبریز ہو گیا۔ زلیخا بیگم اپنے محبوب شوہر کے دیدار کی حسرت لئے اس دنیا سے رخصت ہو گئیں۔ جسد بے جان تو سپرد خاک کر دیا گیا اور روح شاید قید جسم سے آزاد ہو کر بھی اپنے یوسف کے گرد پھر رہی ہوگی۔

مولانا صاحب ”غبار خاطر“ میں نواب صدر یار جنگ کو مخاطب کر کے فرماتے ہیں۔

”گزشتہ پچیس برس کے اندر کتنے ہی سفر در پیش ہوئے اور کتنی ہی مرتبہ گرفتاریاں ہوئیں۔ میں نے اس درجہ افسردہ اس کو کبھی نہیں دیکھا کیا یہ جذبات کی وقتی کمزوری تھی جو اس پر غالب آگئی تھی۔ میں نے اس وقت تو ایسا ہی خیال کیا لیکن اب سوچتا ہوں تو خیال ہوتا ہے

سے اس حسین پیاری بچی کو گود میں لیا اور زلیخا نام رکھا۔ بعد میں موہنی صورت والی بچی اُن کو اتنی اچھی لگی کہ اس کو انھوں نے اپنی بہو بنا لیا۔ چھ سال کی بالی عمر میں زلیخا بیگم بیاہ کر آئیں ان کے ننھے سے دل پر اس وقت سے ہی اپنے یوسف جمال شوہر کا قبضہ ہو گیا اور شباب کی منزل میں قدم رکھتے ہی وہ اس عظیم انسان کی پرستش کرنے لگیں۔ مولانا کے ہر خیال کو انھوں نے سر آنکھوں پر رکھا۔ ہجر کی سختیاں بھی سہیں اور مالی مشکلات بھی برداشت کیں مگر لب پہ کبھی اُف تک نہ لائیں۔ مولانا صاحب کی مالی حالت سیاسی جدوجہد میں حصّہ لینے کی وجہ سے کبھی بھی اچھی نہیں رہی۔ اگر ان کو اتنی مہلت ملتی کہ وہ صرف ادبی کام کرتے تو یقیناً دولت کی دیوی ان کے قدموں کو چومتی۔ مگر ان کو ان کا حساس دل نچلا نہ بیٹھنے دیتا تھا۔ اغیار بس ماندہ قوم اور غلام ملک کا غم چین نہ لینے دیتا تھا۔ ان کی شعلہ نفسی اور آتش بیانی قلم و زبان سے دلوں کو گرماتی رہتی۔ اور ان کی رفیقہ حیات نہ اچھا کھاتی نہ اچھا پہنتی۔ ان تمام تکالیف کو محبت اور سکون سے برداشت کرتی جو شوہر کی جدائی اور مالی پریشانی کی وجہ سے اس پر گذرتیں۔ زلیخا بیگم کا زیادہ وقت یادِ الٰہی اور مولانا کی کامیابی کی دعاؤں میں گذرتا۔ ہر وقت کڑھتے رہنے کے باعث ان کی صحت گر گئی تھی مگر یہ ستی ستونتی اپنی دھن میں مگن رہی۔ اپنی خرابیٔ صحت کا ذکر کبھی مولانا سے نہیں کیا۔ جس وقت بھی اور جتنے دن بعد بھی وہ گھر آتے یہ پاک طینت بیوی مسکراتی ہوئی ہمہ تن شوق بنی ان کا استقبال کرتی اللہ ہر طرح شوہر کو آرام پہنچانے کی کوشش کرتی تاکہ یہ تھکا ہوا دماغ جس کو سیاسی گتھیاں بھی سلجھانی تھیں اور مذہبی و ادبی کام بھی کرنے تھے گھریلو آرام دہ فضا میں آرام پاکر اور زیادہ ہمت اور جوش سے کام کر سکے۔ اور مولانا صاحب اسی پیکرِ صبر و ایثار کی بدولت ہر مرتبہ نیا ولولہ اور جوش لے کر جنگِ آزادی کے لئے تیار ہو جاتے۔

وہ فطری طور پر آزاد طبیعت اور والہانہ جذبات کے مالک تھے۔ اس لئے اپنی کم عمری کی شادی سے ایک دوسرے بڑے فن کار غالب کی طرح خوش نہیں تھے۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ ان کو اپنی باوفا محبت کرنے والی بیوی کا خیال نہیں تھا یا ان کی ازدواجی

حُسن وجمال کی مورت تھیں - اور بھی حسین وجمیل خواتین کو دیکھا لیکن جیسی معصومیت اور تقدس بیگم آزاد کی صورت پر میں نے دیکھا ایسا پھر کبھی کہیں نظر نہیں آیا - وہ اس دنیائے آب و گل کی رہنے والی ہستی نہیں آسمانی مخلوق معلوم ہوتی تھیں - ان کی پاکیزگیٔ خیال کا یہ عالم تھا کہ کبھی ٹیلیفون کا ریسیور اس لئے نہیں اُٹھاتی تھیں کہ نہ جانے دوسری طرف کون اور کیسا آدمی بات کر رہا ہوگا - اس زمانے میں ایسی عفت مآب خواتین کا خیال بھی نہیں کیا جا سکتا -

۱۹۴۷ء کے بعد میں اکثر مولانا صاحب کی خدمت میں حاضر ہوتی رہتی تھی - جب بھی میں حاضر ہوتی وہ مجھ پر شفقت فرماتے - ایک مرتبہ دورانِ گفتگو میں مرحومہ کا ذکر میں نے کیا - مولانا صاحب ایک دم اس طرح خاموش ہو گئے گویا اس ذکر نے ان کے دل پر نشتر لگا دیا - وہ بہت دیر سرنگوں خاموش بیٹھے رہے - میں بھی دم بخود پشیمان سی بیٹھی ان کے اس جانکاہ غم کا اندازہ کر رہی تھی ..... آخر یہ مفارقت کا طویل زمانہ ۲۲-فروری ۱۹۵۸ء کی آدھی رات کو ختم ہو گیا اور مولانا صاحب کی مقدس روح اپنی زلیخا کی تلاش میں عالمِ جاوداں کو سدھار گئی ؛

کو شاید اُسے صورتِ حال کا ایک مجہول احساس ہونے لگا تھا۔ شاید وہ محسوس کر رہی تھی کہ اس زندگی میں یہ ہماری آخری ملاقات ہے۔ وہ خدا حافظ اس لئے نہیں کہہ رہی تھی کہ میں سفر کر رہا تھا۔ وہ اس لئے کہہ رہی تھی کہ خود سفر کرنے والی تھی۔"

غم گسار مشفق صفت بیوی کے بعد مولانا صاحب کی زندگی کے معمولات میں تو بظاہر فرق نہیں آیا لیکن ان کا دل دہل گیا۔ وجود معنوی سراپا درد بن کر رہ گیا۔ اس جاں گزا غم کے زیر اثر انھوں نے غبارِ خاطر کے ایک خط میں اپنے کو شاخ بریدہ سے تشبیہ دی ہے جس کو موسم بہار کی جانفزا ہوائیں بھی تازگی نہیں بخش سکتیں۔ اپنے غمزدہ دل کو تھام کر بے اختیار فرماتے ہیں:۔

"شاخِ بریدہ را نظرے بر بہار نیست"

ان کا دلی حزن اس سے واضح ہو جاتا ہے۔ رہا ہونے کے بعد جب وہ اپنی زلیخا کی آخری آرام گاہ پر گئے تو باوجود اس بلا انتہا ضبط و تحمل کے جو اُن کی طبیعت کی خاص خصوصیت تھی اپنی چاہنے والی کے مرقد پر آنسوؤں کے موتی نچھاور کئے بغیر نہ رہ سکے۔ وفورِ رقت کو تھامنا ان کے بس میں نہ رہا اور بہت دیر تک وہ سر جھکائے روتے رہے۔ مولانا صاحب کی صحت بیوی کی وفات کے بعد دن بدن خراب ہوتی گئی اور مزاج کی شگفتگی بھی بہت کم ہو گئی وہ بذلہ سنجیاں جو اُن کے مخصوص احباب کی محفلوں کو کشتِ زعفران بنا دیتی تھیں برائے نام رہ گئیں۔ وہ ہر وقت کھوئے کھوئے سے رہنے لگے۔ زلیخا بیگم کی زندگی میں ان کو غالباً یہ احساس نہ تھا کہ اس باوفا بیوی سے خود اُن کو بھی دلی لگاؤ ہے۔ لیکن مرنے والی کے جانے کے بعد جیسے ان کی زندگی میں کچھ بھی نہیں رہ گیا تھا۔ اپنی زندگی کی یہ متاعِ عزیز بھی ملک و قوم پر وہ نچھاور کر چکے تھے۔ اسی خدا کی بھری ہوئی دنیا میں ان کے لئے کاموں اور مرحومہ کی یاد کے علاوہ کوئی دلچسپی نہیں رہی تھی۔ اللہ تعالیٰ نے جیسے اور بہت سی نوازشوں سے مولانا آزاد کو نوازا تھا وہاں ایسی باوفا نیک طینت پاکیزہ صورت بیوی بھی عطا فرمائی تھی۔ زلیخا بیگم کی ذات پر عالمِ نسواں جتنا فخر کرے بجا ہے۔ جس نے حسن و جمال کی آغوش میں آنکھ کھولی۔ میرا یہ کہنا تعلّی نہیں حقیقت ہے۔ میری مرحومہ ماں

تھے۔ ان میں ہمت اور اعتماد تھا۔ اور کانگریس میں انھیں جو رتبہ حاصل تھا وہ انھوں نے اپنی قابلیت کی بنا پر حاصل کیا تھا اس ملک کو ایسا شخص مشکل سے ہی ملے گا جو اُن کی جگہ پُر کر سکے۔

مولوی تمیز الدین خاں صدر مشرقی پاکستان مسلم لیگ

" مولانا آزاد جن صلاحیتوں کے مالک تھے، ان کی وجہ سے کوئی ایک ملک یہ نہیں کہہ سکتا کہ وہ صرف اس کے تھے، وہ اگرچہ ہندوستانی تھے مگر ان کا تعلق ساری دنیا سے تھا۔ پاکستان کے مسلمان مولانا آزاد کے بہت ممنونِ احسان ہیں۔ یہ ٹھیک ہے کہ انھوں نے پاکستان کے مطالبہ کی حمایت نہیں کی لیکن آزادی کی تحریک میں ان کا بہت بڑا حصّہ رہا ہے۔ تحریکِ آزادی میں ان کے حصّہ کے بغیر شاید پاکستان کا نظریہ ہی وجود میں نہ آتا اور نہ یہ ایک حقیقت بنتا۔"

خان عبدالصمد خاں اچک زئی صدر کوئٹہ ڈویژن نیشنل عوامی پارٹی

"میں ذاتی طور سے ایک استاد، لیڈر اور دوست کا ماتم کر رہا ہوں۔ مولانا آزاد کے انتقال سے میں اپنے ایک دوست اچھے بہی خواہ سے محروم ہو گیا ہندوستان سے ایک سمجھ دار پیش بیں اور آزمودہ کار محبِ وطن چھن گیا اور اسلامی دُنیا ایک صفِ اوّل کے مذہبی لیڈر سے محروم ہو گئی۔"

ڈاکٹر سیّد عبدالودود، صدر تحریکِ جمہوریت، پاکستان۔

" مولانا آزاد اُن برگزیدہ شخصیتوں میں سے تھے جنھیں اس برِّ صغیر کی تاریخ میں ادب و احترام کے ساتھ یاد کیا جائے گا۔ اگرچہ انھیں غیر منقسم ہندوستان کے مسلمانوں کی بڑی اکثریت سے سیاسی طور پر اختلاف تھا مگر اُن کی سیاسی زندگی کا ایک نمایاں پہلو یہ ہے کہ انھوں نے شدید مخالفت کے باوجود اپنے مقصد سے سرِ مُو انحراف نہیں کیا۔ مولانا نمایاں قابلیت کے مالک اور ممتاز عالم تھے۔ 'الہلال' کا فائل اُن کے ادبی معیار کا زندۂ جاوید ورثہ رہے گا۔

میاں افتخار الدین نے مولانا مرحوم کے پرائیویٹ سیکریٹری محمد اجمل خاں صاحب کے نام

خراج ہائے عقیدت

پاکستان

صدرِ پاکستان میجر جنرل اسکندر مرزا کا صدرِ جمہوریۂ ہند کے نام تعزیتی پیغام

"میں نے مولانا آزاد کی وفات کی خبر بڑے افسوس کے ساتھ سنی۔ وہ ان لوگوں میں سے تھے جنھوں نے اپنی زندگی کا بیشتر حصہ اپنے ملک کی آزادی کی لڑائی میں بسر کیا۔ ایک اسلامی ادیب کی حیثیت سے بہت ہی کم لوگ اُن کے ہم پلّہ ہوں گے۔ وہ ایک بہترین انسان تھے۔ میں آپ سے، ہندوستان کی حکومت سے اور اُن کے غم زدہ خاندان والوں سے اظہارِ تعزیت کرتا ہوں۔"

خان عبدالغفار خاں صدر مغربی پاکستان نیشنل عوامی پارٹی

"مولانا آزاد کی وفات تمام مسلمانوں کے لئے ایک سانحۂ غم ہے۔ وہ ہند و پاکستان کی جنگِ آزادی کے بہت بڑے جرنیل تھے۔"

حمیدالحق چودھری ایم۔ پی۔ صدر کرشک شرمک پارٹی

"مولانا آزاد کے انتقال سے ہندیونین اپنے ایک قابل ترین منتظم اور بزرگ سیاستدان سے محروم ہوگئی۔ تقسیم سے پہلے ہمارے مولانا آزاد سے بہت سے اختلافات تھے۔ اس کے باوجود کوئی شخص اس امر سے منکر نہیں ہو سکتا کہ وہ برصغیر کے بہت بڑے عالموں میں سے

میں ان کا نام ایک نمایاں حیثیت رکھتا ہے۔

تاریخ میں یہ بات ہمیشہ یاد رکھی جائے گی کہ کس طرح اس صدی کی ابتدائی دہائیوں میں ان کی پرزور تحریر و تقریر نے مسلمانوں کو سیاسی جمود سے بیدار کیا۔ تاریخ میں یہ بات بھی لکھی جائے گی کہ نوجوانی میں انھوں نے اپنی زندگی کی جو شاہراہ مقرر کی اس پر مضبوطی کے ساتھ جمے رہے اور اپنے لڑکپن میں ہی انھوں نے جس مقصد کو اپنایا نصف صدی سے زیادہ مدت تک وفاداری کے ساتھ اس کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑا۔

ان کی موت پر نہ صرف ہندوستان اور پاکستان بلکہ ان تمام ملکوں میں ماتم کیا جائے گا جہاں مجاہدینِ آزادی کی قدر کی جاتی ہے یا اردو سمجھی جاتی ہے یا فکرِ اسلامی کا مطالعہ ہوتا ہے۔ مگر ان کی موت سے ہندوستان کو خاص کر نقصان پہنچا ہے اور ہندوستانی مسلمانوں کی زندگی میں ایک ایسا خلا پیدا ہو گیا ہے جسے آسانی سے پُر نہیں کیا جا سکے گا۔"

مارننگ نیوز (ڈھاکہ)

"ان کے انتقال پُر ملال سے ایک متنوع شخصیت اس دنیا سے اُٹھ گئی جو غیر معمولی خوبیوں کی حامل تھی۔ مشرقی عالموں میں سے بہت کم لوگ ایسے تھے جو ان سے آگے ہوں۔ انھوں نے اسلامی تعلیمات کا بڑا گہرا مطالعہ کیا تھا اور یہی اُن کی عظمت کا خاص باعث ہے ان کا قلمی شاہکار قرآن شریف کی تفسیر ہے جس کی وجہ سے عرصہ دراز تک ان کا نام زندہ رہے گا۔

بلاشبہ مولانا آزاد کے اس جوش و خروش کی قدر کی جائے گی جس کے ساتھ انھوں نے برطانوی استعماریت کے خلاف علمِ بغاوت بلند کیا۔ ان کی زبان و بیان کی آتش نوائی یکساں طور پر اثر آفریں تھی۔"

ٹائمز آف کراچی

مولانا آزاد اُن چند عہد آفریں شخصیتوں کی صف میں شامل ہیں جو برصغیر کی آزادی کی جدو جہد میں پیش پیش رہی ہیں۔

ایک پیغام میں کہا:

"میں اپنے محترم دوست کے انتقال کو اپنا ذاتی نقصان سمجھتا ہوں۔ میں اس عظیم مجاہد آزادی، بے مثال خطیب اور عالم کو، جس نے اسلامی فکر اور تاریخ میں اضافہ کر کے اپنا نام زندۂ جاوید بنا لیا، اپنا آخری نذرانۂ عقیدت پیش کرنے خود حاضر ہوتا مگر افسوس ہے کہ میں دل کے دورے کے بعد اب تک صاحب فراش ہوں۔"

روزنامہ سول اینڈ ملٹری گزٹ" کا اداریہ

"مولانا آزاد کی وفات پر پورے برصغیر میں دلی رنج و غم کا اظہار کیا جائے گا حتیٰ کہ وہ لوگ بھی جو سیاست میں اُن سے اختلاف رکھتے تھے ان کی وسیع علمیت اور قابلیت کے ثنا خواں ہیں۔ انھوں نے اس صدی کی پہلی دو دہائیوں میں مسلمانوں کی سیاست میں جو حصّہ لیا اُس کی بڑی قدر کی جاتی ہے۔ بیداریٔ مسلم کے نقیب اور سیاستدان کی حیثیت سے مولانا آزاد کی شخصیت اس وقت نمایاں ہوئی جب انھوں نے نو عمری میں ہی ادب اور صحافت کے میدان میں نام پیدا کیا۔ ان کے ہفتہ وار اخبار 'الہلال' اور 'البلاغ' نے ابھرتی ہوئی مسلم نسل کی سیاسی تعلیم اور مذہبی بیداری کے سلسلے میں نمایاں خدمت انجام دی اور ادبی نفاست صحافتی اخلاق اور بیباکانہ اظہارِ خیال کے معیار قائم کئے۔"

روزنامہ پاکستان ٹائمز کا اداریہ

"مولانا آزاد کی وفات سے دنیا نے صحیح معنوں میں اس عہد کا ایک بڑا آدمی کھو دیا اور برصغیر ہند و پاکستان ایک ایسے سیاست دان سے محروم ہو گیا جس نے سنجیدگی سے دونوں ہمسایہ ملکوں میں جذبۂ خیر سگالی اور دوستی قائم کرنے کی کوشش کی۔ ہندوستان کے مسلمانوں کے درمیان سے ایک ایسا لیڈر اٹھ گیا جس کا اثر و رسوخ ان کے مفاد کا ضامن تھا۔ مولانا صاحب کا کوئی مدمقابل نہ تھا اور نہ اُن مختلف میدانوں میں ان کا کوئی ہم عصر ان سے بہتر تھا۔ جہاں اُنھوں نے پچاس سال سے زیادہ مدت تک اپنی غیر معمولی صلاحیتوں سے کام لیا۔ ہندوستان کی جنگِ آزادی، اردو ادب و صحافت اور فکرِ اسلامی کی تاریخ

کی جدوجہد کی طرح ڈالی تھی۔ مولانا آزاد نے اس سلسلے میں "الہلال" میں ان دنوں جو کچھ
لکھا وہ برِ عظیم کے مسلمانوں کے دل و دماغ کی گویا آواز تھی۔ مولانا نے اپنے اندازِ تفہیم سے
اس آواز کو انتہائی حقیقی، پُرخلوص اور مؤثر بنا دیا تھا۔

مولانا ابوالکلام کی شخصیت اور اس شخصیت کی عظمت کا ایک پہلو یہ ہے کہ جب تک
اردو زبان زندہ ہے اور مسلمانانِ پاک و ہند میں اسلامی شعور موجود ہے ان کا نام تاباں اور
درخشاں رہے گا۔"

مغربی ایشیا

افغانستان

افغانستان کے بادشاہ ہز میجسٹی شاہ ظاہر شاہ کا صدرِ جمہوریۂ ہند کے نام تعزیتی پیغام:

"مولانا آزاد کی وفات سے مجھے صدمہ پہنچا۔ میں آپ سے، حکومتِ ہند اور ہندوستانی
عوام سے اظہارِ تعزیت کرتا ہوں مجھے یقین ہے کہ اپنے ملک کے بہت بڑے خادم کی حیثیت سے
ان کی یاد ہندوستان کے بہی خواہوں کے دلوں میں ہمیشہ تازہ رہے گی۔ اس حسرت ناک حادثہ
پر میں ہندوستانی عوام کے غم میں شریک ہوں۔"

افغانستان کے وزیرِ اعظم سردار محمد داؤد خاں کا وزیرِ اعظم پنڈت نہرو کے نام پیغام۔

"مولانا آزاد کے انتقال کی خبر سن کر مجھے شدید رنج ہوا۔ حکومتِ افغانستان اور افغانستان
کے عوام دلی رنج و غم کا اظہار کرتے ہیں۔ افغانستان میں ان کے بہت سے دوست اور
مدّاح تھے۔"

ایران۔

۲۷۔ فروری کو تہران کی مسجد سپہ سالار میں انڈو ایرانین ایسوسی ایشن کے زیرِ اہتمام
ایک تعزیتی جلسہ ہوا جس میں وزراءِ حکومت، ایشیائی ممالک کے سفارتی نمائندے اور
علماء شریک ہوئے۔ ایران کے مذہبی رہنما محمد موسوی نے منبر سے جلسے کو خطاب کرتے

آزاد (مشرقی بنگال)

"اگرچہ مولانا آزاد سے ہمارے سیاسی اختلافات رہے، لیکن ان کے دوست اور دشمن دونوں ان کی طباعی، پُر زور شخصیت، اخلاص، ہمت اور عالی حوصلگی کے مداح ہیں۔ اسلامی دنیا میں ہر جگہ ان کے معتقدین موجود ہیں۔ اردو زبان و ادب ہمیشہ ان کا ممنون رہے گا۔"

ہفت روزہ 'اقدام' لاہور

"ابوالکلام آزاد کی موت ایک فردِ واحد کی موت نہیں بلکہ ایک مکتبِ فکر کی موت ہے۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے جوں ہی ہوش سنبھالا اپنی علمی و عملی صلاحیتوں کو ملک و قوم کے لئے وقف کر دیا۔ انھوں نے مذہبی جمود اور سیاسی بے حسی کے خلاف مسلسل جہاد کیا اور اس مقصد کے حصول کے لئے اپنی تحریر و تقریر کی سحر آفرینیوں سے کام لیا۔ ان کی سوچ، وقتی ہیجان اور جذبات سے ہمیشہ بلند رہی۔

آج مولانا کی رحلت پر صرف ہندوستان ہی سوگوار نہیں، پاکستان اور عالمِ اسلام بھی ماتم کناں ہے اس لئے کہ ابوالکلام مغربی تسلط سے عالمِ اسلام کے استخلاص کی ہر تحریک کے زبردست حامی رہے اور ان ممالک کے انقلابی قائدین کے ساتھ نہایت نزدیکی روابط رکھتے تھے۔

مولانا ابوالکلام کی وفات سے وہ بربط ٹوٹ گیا جس کے سازوں سے آزادی کے نغمے اُبھرتے اور خوابیدہ روحوں کو بیدار کرتے تھے۔ وہ شمع بجھ گیا جو پروانوں کے رقص کا باعث تھا۔ حضرت شیخ الحدیث مولانا حسین احمدؒ مدنی کی رحلت کے بعد مولانا کی وفات سے عالمِ اسلام کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچا ہے۔"

قندیل لاہور

"مولانا ابوالکلام آزاد کی رحلت پاک و ہند کی تاریخ میں ایک اہم حیثیت رکھتی ہے مولانا مرحوم ان مسلمان قائدین میں سے تھے جنھوں نے پہلی جنگِ عظیم سے قبل مولانا محمودؒ محمود حسن وغیرہم کے ساتھ مل کر برّ عظیم کے مسلمانوں میں دنیائے اسلام کی آزادی اور حفاظت

دنیائے اسلام اور عام طور سے تمام مفکّرین کے لئے نقصانِ عظیم ہے۔ علم اور سائنس کے لئے ان کی زبردست خدمات تاریخ میں ہمیشہ یادگار رہیں گی۔"

شام

شام کے صدر جناب شکری القوتلی نے وزیرِ اعظم پنڈت نہرو کے نام ایک پیغام میں کہا:

"مولانا ابوالکلام آزاد کے انتقال کی خبر سے مجھے بڑا صدمہ ہوا۔ انھوں نے اپنی ساری عمر ہندوستان کی آزادی اور اتحاد، علم، سائنس اور انسانیت کی خدمت میں صرف کی۔ میں آپ سے، حکومتِ ہند اور ہندوستانی عوام سے دلی ہمدردی کا اظہار کرتا ہوں۔"

شام کے مفتیِ اعظم اور سپریم اسلامک کونسل کے صدر ڈاکٹر عبدالیف عابدین نے ایک تعزیتی پیغام میں کہا:

"حکومتِ ہند کے وزیرِ تعلیم، مولانا آزاد کے انتقال کی خبر سے ہمیں بڑا افسوس ہوا — اللہ تعالےٰ سے دعا ہے کہ مرحوم کی مغفرت فرمائے۔"

دمشق یونیورسٹی کے شعبۂ اسلامی قانون کے ڈین ڈاکٹر مصطفیٰ اسباعی نے وزیرِ اعظم پنڈت نہرو کے نام ایک پیغام میں کہا:

"جیّد عالم مولانا آزاد کے انتقال کی خبر سے بڑا صدمہ ہوا۔ بلاشبہ ان کی وفات نہ صرف ہندوستان بلکہ عرب اور اسلامی دنیا کے لئے بہت بڑا نقصان ہے۔ جس کے لئے میں آپ سے اور حکومتِ ہند سے اظہارِ ہمدردی کرتا ہوں۔"

ترکی

ترکی کے سابق وزیرِ اعظم اور جیّد عالم پروفیسر فواد کوپرلو نے کہا:۔

"مولانا آزاد کی وفات سے نہ صرف ہندوستان بلکہ مشرقِ قریب اور مشرقِ وسطیٰ کے تمام ملکوں کو بڑا بھاری نقصان پہنچا ہے۔ وہ ایک بہت بڑے عالم تھے اور انھیں مشرقی اور مغربی دونوں تہذیبوں کے بارے میں وسیع معلومات حاصل تھیں۔ وہ جنگِ آزادی کے ہیرو تھے جس کے لئے انھوں نے بڑی قربانیاں دیں اور بالآخر اپنی زندگی میں ہی، انھوں نے اپنے خواب کی تعبیر بھی

ہوئے مرحوم مولانا آزاد کے علم و فضل اور ان کی دینی معلومات کا ذکر کیا اور کہا کہ اللہ تعالےٰ نے انھیں اسلام کی عظمت کو پھر سے زندہ کرنے کے لئے بھیجا تھا۔ وہ ایک عالم گیر شخصیت کے مالک تھے اور ایشیا کو ان پر فخر کرنا چاہیئے۔ ایرانی قوم خاص کر اس بات کے لئے ان کی ممنون ہے کہ انھوں نے "ذوالقرنین" کے بارے میں بے مثال تاریخی تحقیق پیش کی۔

جناب حسین اعلیٰ - وزیر دربار شاہی ایران کا بیان

"مولانا آزاد کے انتقال کی خبر سن کر مجھے سخت صدمہ ہوا۔ ہم انھیں صرف ایک ممتاز سیاست داں ہی نہیں سمجھتے جو اپنی انسان دوستی، ہندوستان کی آزادی کے لئے اپنی جدوجہد کی وجہ سے دنیا بھر میں مقبول ہو گئے تھے بلکہ وہ ایرانی تہذیب و تمدن کے بڑے شیدائی بھی تھے۔ ایرانی تاریخ کے باب میں انھوں نے جو تحقیقات کی ہیں وہ ایسا سرمایہ ہے جس کے لئے ایرانی قوم ہمیشہ ان کی ممنون رہے گی۔"

ایرانی مجلس کے صدر صدر الاشرف نے کہا:

"مولانا آزاد کی وفات سے مجھے اور میرے ساتھیوں کو بڑا صدمہ پہنچا۔ وہ ایک ممتاز شخصیت کے مالک، جید عالم اور ہندوستانی مسلمانوں کے لیڈر تھے۔ مجھے ان سے اس وقت شرفِ نیاز حاصل ہوا جبکہ وہ ایران آئے۔ مشہد میں میں نے ان کے ساتھ دو دن گذارے۔ ان دو دنوں کی خوشگوار یاد اب تک میرے دل میں تازہ ہے۔ اسلامیات پر ان کی گہری نظر تھی۔ انھوں نے قرآن پر جو عمدہ تفسیر لکھی اس کی وجہ سے وہ اسلامی دنیا کے سچے اور ممتاز لیڈر بن گئے اس شخص کی یاد جو بیک وقت سیاست، سماج اور تعلیم کا مرد میدان تھا، ہمیشہ تر و تازہ رہے گی۔"

اخبار "پارس" نے لکھا:-

"مولانا آزاد اگرچہ ہندوستان کی جنگ آزادی کے عظیم رہنما تھے، لیکن ان کا تعلق پوری دنیا سے تھا۔ وہ ہند ایرانی ثقافت کے بہت بڑے بہی خواہ تھے۔"

عراق -

ہز ایکسیلینسی مسٹر منیر القاضی نے کہا کہ مولانا ابوالکلام آزاد کی وفات دنیائے ادب

کی پشت پناہی کے لئے "الہلال" جاری کیا، جو اُس وقت تک جاری رہا جب تک برطانوی حکومت نے بند نہ کیا۔ موت نے ہم سے ان کا جسدِ خاکی چھین لیا۔ مگر ان کی اصل شخصیت ہمارے ساتھ ہے جس کی اہمیت اب اور بڑھ گئی ہے اور آج اسی شخصیت کو دنیا خراج عقیدت پیش کر رہی ہے۔ ہم نہ صرف ہندوستانی قوم بلکہ ترکی کے عوام اور پوری اسلامی دُنیا سے اظہارِ ہمدردی کرتے ہیں۔ ان کے انتقال سے جو نقصانِ عظیم ہوا ہے وہ کبھی پورا نہ ہو سکے گا۔"

جنوب مشرقی ایشیا

برما

برما کے وزیرِ اعظم اُو۔ نو کا وزیر اعظم نہرو کے نام تعزیتی پیغام :

"مجھے مولانا آزاد کی موت کی خبر سے بہت رنج ہوا ہے۔ وہ ہندوستان کی آزادی کے خاص معماروں میں سے تھے۔ برما کی حکومت اور عوام کی طرف سے میں اس اندوہناک سانحہ پر ہندوستان کی حکومت اور عوام سے دلی ہمدردی کا اظہار کرتا ہوں۔"

برما اسٹار (رنگون) نے اپنے افتتاحیہ میں مولانا آزاد کی وفات پر لکھا ہے :

"مولانا ابو الکلام آزاد کی موت سے ہندوستان نہ صرف ایک ماہرِ تعلیم اور سیاست داں بلکہ ایک ایسے شخص سے محروم ہو گیا ہے جس نے اپنی دانش مندی اور خلوص رائے کی وجہ سے ملک کے ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان صحت مند تعلقات بدستور برقرار رکھے۔ وزیرِ تعلیم کی حیثیت سے دس برسوں تک انھوں نے جو کچھ کیا وہ اُس دلیرانہ جنگ کے سامنے کچھ نہیں ہے جو انھوں نے کانگریس کے جھنڈے کے نیچے ملک کی آزادی کے لئے لڑی۔ ان کی موت سے جو خلاء پیدا ہو گیا ہے وہ کبھی مشکل ہی سے پُر ہو سکے گا۔"

سیلون

'سیلون ڈیلی نیوز' کا اداریہ :

"مولانا آزاد عالمانہ مزاج رکھنے والے ایسے شخص کی مثال تھے جس نے ملک کی پکار

دیکھ لی۔ ہماری جنگِ آزادی کے دوران انھوں نے کبھی ہمارے قومی مقاصد کی حمایت اور ہمدردی کے اظہار سے گریز نہیں کیا۔

چونکہ مجھے خود اُن سے ملنے اور اُن کی اعلیٰ صلاحیتوں کے مطالعہ کرنے کا موقع ملا تھا اس لئے مجھے ان کے انتقال کا بے حد ملال ہے۔"

ترکی خواتین کی ممتاز لیڈر اور کمال آتاترک کی رفیقۂ کار خالدہ ادیب خانم نے کہا

"ایک ترک کی حیثیت سے مجھے مولانا آزاد کے انتقال سے بڑا صدمہ پہنچا ہے۔ میں جانتی ہوں کہ ہندوستان میں اس نقصانِ عظیم پر بڑا ماتم کیا جائے گا۔ ہمیں امید ہے کہ نئی نسل ان کے نقشِ قدم پر چلے گی۔"

پیپلز ڈیموکریٹک پارٹی کے جنرل سیکرٹری مسٹر قاسم گوبیک نے کہا:

"مولانا آزاد کے انتقال نے ہندوستان اور تمام اسلامی دنیا کو ایک زبردست عالم اور عظیم شخصیت سے محروم کر دیا۔ مولانا آزاد جنگ ہائے بلقان اور ترکی کی جنگ کے وقت سے ترکی کے سچے دوست رہے۔ ان کی موت پر ترکی بھی نوحہ کناں ہے۔"

احمد امین یلمان ایڈیٹر 'وطن' اور اتاترک کے پرانے رفیق:

"مولانا آزاد جیسے جید عالم کی وفات سے نہ صرف ہندوستان کو بلکہ پوری دُنیا اور خاص کر ترکی کو شدید صدمہ پہنچا ہے۔ مولانا آزاد جیسے لیڈر کی جگہ پُر کرنا مشکل ہے۔"

استنبول کے روزنامہ 'دنیا' نے 'ایک عظیم نقصان' کے عنوان سے لکھا:

"مولانا کی شخصیت نہ صرف ہندوستان بلکہ پوری اسلامی دنیا کے لئے بیش بہا تھی۔ ان کے انتقال سے ترکی قوم اپنے ایک سچے دوست سے محروم ہو گئی۔ آزاد کو ترکی سے محبت تھی۔ انھوں نے برابر ترکی کے لئے جدوجہد کی اور بالآخر انھوں نے آزاد اور ترقی پذیر ترکی کو خود آکر دیکھا اور اپنے محبوب ترکی کے ساتھ ایک ثقافتی معاہدے پر دستخط کئے۔

مولانا آزاد نے جن کا آج ہم ماتم کر رہے ہیں، یورپ سے آنے والے پناہ گزینوں کے لئے چندہ جمع کر کے ترکی کی قابلِ قدر امداد کی تھی۔ انھوں نے ہمارے ملک

اُنھوں نے ہندوستان کی آزادی کی قومی جدوجہد کی نذر کر دیا۔ انڈین نیشنل کانگریس کی قیادت کئی بار اس عظیم ہندوستانی مسلمان کے مقدّس ہاتھوں میں دی گئی۔

"آزاد اسلامی تعلیم کے نہ صرف معتقد تھے بلکہ اس کے بہت بڑے عالم تھے اور قرآن و حدیث کی تعلیمات کی روح سے پوری طرح واقف تھے۔ وہ ایک نادر الوجود قوم پرست اور جنگ آزادی کے مجاہد تھے جس نے اپنے مشن کو نسلی اور مذہبی امتیازات سے ہمیشہ بالاتر رکھا ہم ہندوستانی حکومت اور ہندوستانی مسلمانوں سے اظہار ہمدردی کرتے ہیں۔ ہماری دعا ہے کہ آزاد کو ان خدمات کے عوض جو انھوں نے اسلام اور انسانیت کے لئے کی ہیں خدائے تعالیٰ اپنے جوار رحمت میں جگہ دے۔

نیپال

'نیپال ٹائمز' نے اپنے اداریہ میں لکھا: "مولانا آزاد اپنی علمیت اور دانش مندی کی وجہ سے نہ صرف ہندوستان بلکہ پورے ایشیا کی مشہور شخصیت بن گئے تھے۔ ہندوستان میں مذہبی اختلافات سے پیدا شدہ مسائل کو سلجھانے میں مولانا نے جو خدمات انجام دی ہیں وہ عرصۂ دراز تک یادگار رہیں گی۔ دیگر ایشیائی ملکوں کو جہاں مختلف مذاہب کے لوگ رہتے ہیں مولانا آزاد کی قیادت کی پیروی کرنا چاہیئے۔"

مغربی ویت نام

ویت نام کی عوامی جمہوریہ کے صدر ڈاکٹر ہوچی منہ نے صدر راجندر پرساد کے نام ایک پیغام میں کہا:

"وزیر تعلیم مسٹر ابوالکلام آزاد کے انتقال کی خبر سے مجھے صدمہ پہنچا۔ ان کی وفات سے حکومتِ ہند اور ہندوستانی عوام ایک ایسے عظیم محب وطن اور قابل ترین سپوت سے محروم ہو گئے جس نے اپنی پوری زندگی آزادی کی لڑائی لڑنے اور ہندوستان کو ایک مضبوط قومی حلیف بنانے میں صرف کی۔ ہم ہندوستانی عوام کے اس غم میں دل سے ان کا شریک ہوں اور آپ سے درخواست کرتا ہوں کہ مرحوم کے پس ماندگان سے میری طرف سے تعزیت کر دیں

سُنی اور سمجھے حبِّ وطن کے جوش کے ساتھ جنگِ آزادی میں کود پڑے۔ فلسفہ اور مذہب کا یہ طالبِ علم قومی جدوجہد کی وجہ سے اپنی ابتدائی زندگی میں ایک باعمل انسان بن گیا تھا اور انھی اپنی قیادت کی صلاحیتوں کا مظاہرہ کیا۔ جب وہ ۱۹۲۳ء میں پہلی بار کانگریس کے صدر چنے گئے اس وقت ان کی عمر ۳۴ سال تھی اور کانگریس کی تاریخ میں وہ سب سے کم عمر صدر تھے۔ فرقہ وارانہ سیاست ان کے نزدیک قابلِ نفرت تھی اور ان کا یہ یقین کبھی متزلزل نہیں ہُوا کہ ہندوستان کے تمام فرقوں کے لوگوں — ہندو مسلمان سکھ اور عیسائی کو ایک قوم بن کر رہنا ہے۔ ان کی ساری طاقت ایک آزاد اور متحدّ ہندوستان بنانے کے لئے وقف تھی جس میں ذات، عقیدہ اور نسل کے سارے امتیازات کو مٹا اور بُھلا دیا جائے۔

عالم اور مدبّر مولانا آزاد کی زندگی سے ہمیں مقصد سے اتنے شدید لگاؤ کی مثال ملتی ہے جو موجودہ تاریخ میں کہیں اور نظر نہیں آئے گی۔ اس مثال کی پیروی ہر اس ملک کو کرنی چاہیئے جہاں قومی مفادات کو خطرہ لاحق ہے۔"

انڈونیشیا

انڈونیشی جمہوریہ کے صدر ڈاکٹر سوکارنو، صدر ڈاکٹر راجندر پرساد کے نام ایک تعزیتی پیغام میں فرماتے ہیں:

"وزیرِ تعلیم مولانا ابوالکلام آزاد کی موت کے افسوس ناک سانحے پر میں دلی رنج اور افسوس کا اظہار کرتا ہوں۔"

جاکارتا کا روزنامہ 'مردیکا' اپنے اداریے میں لکھتا ہے:

"آزاد کی موت صرف ہندوستانی مسلمانوں کا نقصان نہیں ہے بلکہ مجموعی طور پر ہندوستان کی حکومت اور عوام کے لئے ناقابلِ برداشت ضرب ہے۔ آزاد صرف ایک اسلامی شخصیت نہیں تھے وہ ہندوستان کے قومی رہنما تھے اور اس کی تصدیق مہاتما گاندھی اور وزیرِ اعظم نہرو دونوں نے کی ہے۔ اپنی ۶۹ سالہ زندگی کا بیشتر حصّہ

جس کے نتیجے میں ملک کی حکومت ہندستانیوں کے ہاتھ میں آئی۔ آزاد، جناح کے دو قومی نظریے کے بالکل مخالف تھے اور وہ ایک ایسے ممتاز مسلمان تھے جو اپنے آپ کو پہلے ہندوستانی اور بعد کو مسلمان کہتے تھے۔ نہرو نے انھیں اپنی کابینہ میں وزیر تعلیم بنایا اور اسی مسلمان نے آزاد ہندوستان کے طریقۂ تعلیم میں بہت کچھ اصلاح کی۔"

سویڈن

Stockholm - Tidningen نے مولانا کی وفات سے متعلق ایک تفصیلی نوٹ شائع کیا:

"مولانا آزاد ہندوستان کی آزادی کی جد و جہد کے بہت بڑے رہنما تھے۔ اور ملک کی سیاسی زندگی میں بہت ہی متنوع شخصیت کے مالک تھے کسی اور شخص کے مقابلے میں شاید سب سے زیادہ مولانا آزاد کے بارے میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ کانگریس پارٹی کے واضح مقصد اور طریقۂ کار میں اعتدال کی روایات کے حامل تھے۔ وہ ایک طاقت ور شخص کے مثل نہ تھے اور ان میں جناح کی سی مقناطیسی کشش اور نہرو کی سی مقبولیت نہیں تھی لیکن خطیب اور عالم آزاد نے پہلے ہندوستان کی آزادی کے لئے اور بعد میں ہندوستان کی تعمیر نو کے سلسلے میں جو بڑا کام کیا ہے اس کی وجہ سے ہندوستان کے لوگ انھیں آسانی سے بھلا نہ سکیں گے۔"

امریکہ

مولانا آزاد کی وفات کی خبر نیویارک ٹائمس، نیویارک ہیرلڈ، واشنگٹن پوسٹ، شگاگو ٹربیون، ڈینور پوسٹ اور دوسرے بہت سے اخباروں میں شائع ہوئی۔

نیویارک ٹائمس نے لکھا:-

"آنجہانی مہاتما گاندھی کے قریبی دوست مولانا آزاد نے ان کی عدم تشدد اور عدم تعاون کی تحریک میں یقین رکھا اور اس کے لئے کام کیا۔ جب ان سے سوال کیا گیا کہ ایک مسلمان ہوتے ہوئے کیوں وہ پاکستان کے اسلامی نظریے کے مؤید نہ ہو کر سیاسی طور پر ہندو راج کے ساتھ ہیں جس سے بہت سے مسلمان خائف ہیں تو انھوں نے جواب دیا کہ مجھے اس میں کوئی خطرہ نظر نہیں آتا۔"

یورپ

برطانیہ

مسٹر ہیرلڈ میکمیلن وزیر اعظم برطانیہ کا تعزیتی پیغام وزیر اعظم نہرو کے نام:

"مجھے مولانا آزاد وزیر تعلیم و سائنسی تحقیقات کی موت کی خبر سے بہت تکلیف پہنچی میں جانتا ہوں کہ آپ اور وہ تمام لوگ جو ان سے واقف تھے ان کے مشوروں اور دوستی کی کمی کو بُری طرح محسوس کریں گے۔"

ارل آف ہوم سیکرٹری تعلقات دولتِ مشترکہ کا وزیر اعظم نہرو کے نام پیغام:

"مرکزی وزیر تعلیم و سائنسی تحقیقات مولانا آزاد کی موت کی خبر میں نے دلی رنج و غم کے ساتھ سنی۔ ایک پرانے رفیق کی موت سے آپ کو اور ہندوستانی عوام کو جو نقصان پہنچا یا ہے اس کے لئے میں دلی رنج و غم کا اظہار کرتا ہوں۔

برطانیہ کے تقریباً سبھی ممتاز اخباروں نے نمایاں طور پر مولانا آزاد کی موت کی خبر شائع کی۔

جرمنی

Frankfurte Allegemine اپنے اداریے میں مولانا آزاد کو خراجِ عقیدت پیش کرتے ہوئے لکھتا ہے:

" مولانا آزاد کی موت سے ہندوستان نے جنگِ آزادی کا ایک ممتاز مجاہد اسلامی دینیات کا ماہر اور ایک بڑا عالم کھو دیا ہے۔ آزاد نوجوانی ہی میں سیاست کی طرف کھنچ آئے اور جلد ہی (مہاتما) گاندھی سے متاثر ہو گئے۔ تحریکِ خلافت میں انھیں جیل جانا پڑا۔ ہندوستان کی آزادی کے ایک بڑے سپاہی کی حیثیت سے ان کی بعد کی زندگی بڑی پُر جوش اور بے آرام گذری۔ وہ سات سال تک کانگریس کے صدر رہے اور برطانوی حکام اور مشن سے بات چیت کرنے میں کانگریس کے ترجمان تھے۔

مصر

مسٹر کمال الدین حسین وزیر تعلیم مصر نے وزیر اعظم ہند کے نام ایک تعزیتی پیغام میں کہا کہ "ہندوستان کی جنگِ آزادی میں آپ کے رفیق مولانا ابوالکلام آزاد کی موت ساری دنیا کے لئے نقصانِ عظیم ہے۔ میں اس سانحہ پر دلی رنج وغم کا اظہار کرتا ہوں۔"

عبّاس محمود صاحب "الاخبار" میں مولانا آزاد پر لکھتے ہوئے رقمطراز ہیں :-

"ابوالکلام آزاد نے ہند سے چین تک اور بابل سے مصر تک پھیلے ہوئے مشرقی کلچر کی بہت بڑی خدمت کی ہے۔ ہندوستان کے وزیر تعلیم کی حیثیت سے انھوں نے دنیا کے فلسفے کی تاریخ پر ایک چھوٹی سی انسائیکلوپیڈیا لکھنے کا حکم دیا تھا۔ یہ انسائیکلوپیڈیا انگریزی میں لکھی گئی جس کے پیش لفظ میں انھوں نے مغرب کے مؤرخوں کی غلطیوں کو بتایا ہے جو ان سے فلسفہ کی ابتداء کی تلاش میں سرزد ہوئی تھیں۔ انھوں نے افلاطون اور ارسطو کے حوالے سے خاص طور پر قدیم مصر کا ذکر کیا ہے اور فلسفیوں کے اس دعویٰ کو باطل قرار دیا ہے کہ سارا فلسفہ یونان ہی میں وجود میں آیا تھا کیونکہ یہ دونوں عالم بتاتے ہیں کہ مصری پجاری فلسفے اور سائنس کے پہلے رہنما تھے جسے وہ میراث کے طور پر یونانیوں کے لئے چھوڑ گئے۔"

اسی اخبار میں مولانا آزاد کے متعلق ایک دوسرا مضمون چھپا جس کے مضمون نگار سلام موسیٰ صاحب نے لکھا :-

"مولانا آزاد ہمارے اپنے رہنما محمد عبدہ کی طرح بہت بڑی شخصیت تھے۔ انھوں نے قرآن شریف کی جدید تفسیر اور بہت سی دوسری کتابیں لکھی ہیں جنھیں پڑھ کر آپ محسوس کریں گے کہ وہ ایسے مذہبی شخص تھے جو صلح وآشتی کی زبان سے تجدد کی تلقین کرتے تھے۔"

انھوں نے کہا کہ اسلام میں کسی بھی سیاسی نظام یا جغرافیائی حدبندیوں کے تصور سے کہیں زیادہ قوت ہے اور ان باتوں کا خیال محمدؐ کی تعلیمات کے بالکل منافی ہے۔

اپنا سلسلۂ بیان جاری رکھتے ہوئے انھوں نے کہا کہ ایک سچا مسلمان اپنے کام، اپنی مہربانی اور اپنے التفات سے دوسروں کو اپنی سچائی کے معیار تک کھینچ لائے گا۔"

کناڈا

"اوٹاوا سیٹزن" نے اپنے اداریے میں "جدید ہندوستان کا ایک مسلم رہنما" کے عنوان سے لکھا:

"مولانا آزاد ایسے انسان تھے جو باعمل بھی تھے اور ذہین بھی، سیاست دان بھی تھے اور عالم بھی۔ وہ ہندوستان کے بڑے رہنماؤں میں سے ایک تھے۔ اپنا نذرانۂ عقیدت پیش کرتے ہوئے چند روز پہلے پنڈت نہرو نے کہا تھا کہ وہ حالات اور حالات سے تشکیل شدہ شخصیت کی بدولت اپنی عظمت میں بے مثل تھے۔"

افریقہ

"ایسٹ افریکن ٹائمس" (نیروبی) نے "مولانا آزاد" کے عنوان سے اپنے اداریے میں لکھا کہ ہندوستان کی آزادی کے بہت بڑے حامی اور اس کے وزیر تعلیم مولانا آزاد ہندوستان کے مشہور اور ممتاز رہنماؤں میں سے تھے جنھوں نے مہاتما گاندھی کے ساتھ ہندوستانی عوام کے دلوں میں غیر ملکی غلامی سے آزاد ہونے کا جذبہ پیدا کیا اور اس کے حصول کے لئے انھیں صحیح راستے پر لگایا جب تک کہ مقصد حاصل نہ ہوگیا۔ جو بھی مصائب ان پر ٹوٹے بڑے سکون کے ساتھ انھوں نے برداشت کئے

ان کی موت سے ایک ناقابلِ تلافی نقصان صرف ہندوستان کو نہیں پہنچا ہے بلکہ یہ سارے ملکوں کے مسلمانوں کے لئے شدید رنج وغم کا باعث ہے کیونکہ وہ ایک بہت بڑے مسلم عالم تھے جنھوں نے اسلامی دینیات میں بڑا قابلِ قدر اضافہ کیا ہے۔

مولانا آزادؒ کی زندگی

۱۸۸۸ء ۱۱-نومبر کو مکہ معظمہ میں پیدا ہوئے۔

۱۸۹۸ء مکہ معظمہ سے کلکتہ آئے۔

۱۹۰۲ء رسالہ "لسان الصدق" جاری کیا۔

۱۹۰۴ء انجمن حمایت اسلام لاہور کے سالانہ اجلاس میں خطبہ پڑھا۔

۱۹۰۵ء ہندوستان سے باہر تشریف لے گئے، قاہرہ کی الازہر یونیورسٹی میں گئے۔

۱۹۰۷ء قاہرہ یونیورسٹی سے واپس ہندوستان آئے۔

۱۹۰۹ء آپ کے والد ماجد کا انتقال ہوا

۱۹۱۲ء اردو اخبار "الہلال" جاری کیا۔

۱۹۱۴ء حکومت نے "الہلال" کی ضمانت ضبط کر لی، اور اخبار بند ہو گیا۔ "البلاغ" جاری کیا۔

۱۹۱۵ء حکومت بنگال نے بنگال سے جلا وطن کر دیا۔

۱۹۱۶ء رانچی (بہار) میں نظر بند کر دئے گئے۔

۱۹۲۰ء رہا کر دئے گئے۔ دہلی میں پہلی مرتبہ مہاتما گاندھی سے ملاقات ہوئی۔ مہاتما گاندھی کی قیادت میں تحریک عدم تعاون میں حصہ لیا۔ گرفتار ہوئے اور دو سال کے لئے قید کر دئے گئے۔

۱۹۲۳ء ستمبر میں انڈین نیشنل کانگریس کے خصوصی اجلاس منعقدہ دہلی کے صدر ہوئے۔

۱۹۳۰ء کانگریس کے قائم مقام صدر ہوئے۔ پھر گرفتار کر لئے گئے اور ۱۹۳۲ء تک جیل میں رہے۔

۱۹۳۷ء کانگریس پارلیمنٹری سب کمیٹی کے ممبر مقرر ہوئے

۱۹۴۰ء پھر کانگریس کے صدر منتخب ہوئے اور ۱۹۴۶ء تک اس عہدے پر رہے۔

۱۹۴۲ء کانگریس کے خصوصی ترجمان کی حیثیت سے سر اسٹیفورڈ کرپس سے بات چیت کی۔ اگست میں "ہندوستان چھوڑ دو" تحریک کے سلسلہ میں گرفتار کر لئے گئے اور تین سال تک نظر بند رہے۔

۱۹۴۳ء بیگم آزاد کا انتقال ہوا۔

۱۹۴۵ء دوسرے کانگریسی لیڈروں کے ساتھ رہا ہوئے۔ وائسرائے کی طرف سے منعقدہ شملہ کانفرنس میں کانگریس کے ترجمان کی حیثیت سے شریک ہوئے۔

۱۹۴۶ء کیبنٹ مشن کے ساتھ مذاکرات میں حصہ لیا

۱۹۴۷ء دستور ساز اسمبلی کے ممبر منتخب ہوئے۔ عبوری حکومت میں تعلیم اور فنون لطیفہ کے ممبر ہوئے۔ ملک کی آزادی کے بعد ۱۵ اگست سے حکومت ہند کے وزیر تعلیم ہوئے۔

۱۹۵۱ء پارلیمنٹ میں کانگریس پارٹی کے ڈپٹی لیڈر منتخب ہوئے

۱۹۵۲ء پہلے عام انتخابات میں پارلیمنٹ کے ممبر منتخب ہوئے تو قدرتی ذرائع اور سائنسی تحقیقات کے وزیر مقرر ہوئے۔

۱۹۵۵ء دوبارہ پارلیمنٹ میں کانگریس پارٹی کے ڈپٹی لیڈر منتخب ہوئے۔

۱۹۵۵ء دو ماہ کے لئے یورپ اور مغربی ایشیا کے خیر سگالی دورے پر تشریف لے گئے۔

۱۹۵۶ء یونیسکو کی نویں عام کانفرنس منعقدہ دہلی کی صدارت کی

۱۹۵۷ء دوبارہ گوڑگاؤں کے حلقۂ انتخاب سے لوک سبھا کے ممبر منتخب ہوئے۔ وزیر تعلیم سائنسی تحقیقات کے عہدے پر برقرار رہے۔

۱۹۵۸ء ۲۲ فروری کو دہلی میں رحلت فرما گئے۔